۱۹۶۵ء کے

بہترین افسانے

انتخاب

سید قاسم محمود

البیان

چوک انار کلی ○ لاہور

باراوّل سنہ ۱۹۶۶ء
طابع: اشرف پریس، لاہور
ناشر: محمد حنیف رامے
البیان، چوک انارکلی، لاہور

ترتیب

پیش لفظ

۱۹۶۵ء ایک عجیب سال تھا ــــ کم از کم اُردو افسانے کے لحاظ سے۔ یہ بجائے بارہ ماہ کے آٹھ ماہ پر مشتمل تھا۔ باقی کے چار ماہ (ستمبر تا دسمبر) اُس جنگ کی نذر ہو گئے جو اُن دو ملکوں میں لڑی گئی جہاں اُردو افسانہ تخلیق ہوتا ہے۔ ان چار ماہ کی بھرپور، شدید اور پیچیدہ زندگی اپنی صورت افسانے کے آئینے میں نہ دیکھ سکی ۔شاید ۱۹۶۶ء میں دیکھ لے یا ۱۹۶۷ء میں یا کبھی نہیں! ــــ حالیہ جنگ اور افسانے کے آئندہ تعلقات پر کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہے۔

ہم تو صرف یہ اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ۱۹۶۵ء کے صرف آٹھ ماہ کے اُن مختصر افسانوں کا انتخاب ہے جو پاکستان اور بھارت کے اُن ادبی رسائل میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آئے جن کے مطالعے کے بغیر افسانوں کا کوئی انتخابی مجموعہ مرتب نہیں ہو سکتا:۔

فنون (لاہور)	نقوش (لاہور)	سویرا (لاہور)	ساقی (کراچی)
افکار (کراچی)	سیپ (کراچی)	نیا دور (کراچی)	شاعر (بمبئی)
تلاش (دہلی)	شاہکار (الٰہ آباد)	ادبِ لطیف (لاہور)	

(اگست کے بعد سلسلۂ ڈاک منقطع ہو جانے کی وجہ سے بھارتی رسائل پاکستان نہ آ سکے، اس لیے اُن کا مطالعہ نہ کیا جا سکا)

انتخاب کے لیے دو طریقے اختیار کیے گئے

بلا واسطہ: مرتب نے تمام دستیاب ادبی رسائل میں چھپے ہوئے تقریباً ۲۵۰ افسانوں کا فرداً فرداً مطالعہ کرنے کے بعد پہلی فہرست تیار کی جو ۴۲ افسانوں پر مشتمل تھی۔ نظرِ ثانی کے بعد دوسری فہرست بنانے کا وقت آیا تو ۱۱ افسانوں نے اپنا نام واپس لے لیا اور انتخاب سے دستبردار ہو گئے۔ ۲۵ افسانوں کا ایک جلد میں سمانا دشوار تھا، اس لیے تیسری فہرست بنانا ضروری ٹھہرا۔ یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ سبھی افسانے اپنی کسی نہ کسی انفرادی خصوصیت کی وجہ سے ہم رتبہ تھے۔ ایک کو دوسرے پر اس انداز میں ترجیح دینا کہ ایک کو قلم زد کرنا پڑے، مرتب کے لیے سخت نفسیاتی آزمائش بن گیا۔ منتخب افسانوں کا از سرِ نو، نسبتاً زیادہ غور و خوض سے مطالعہ کیا گیا اور انتہائی دقت اور پشیمانی کے احساس کے ساتھ دس افسانے مناسب ضخامت

پر قربان کر دیئے گئے، جن کے نام یہ ہیں :-

واردات (ٹبراج مبزا) - زمین کا درد (اقبال متین) - رنگین پایوں کا پلنگ (کرتار سنگھ دُگل) - کرب (نجمہ محمود) - اکیلی اور غریب (عذرا بخاری) - گنبد (احمد شریف) - لابوہیم (انور عظیم) - ڈائن (نگہت مرزا) - بوڑھا اور لڑکا (فہمیدہ ریاض) - ہاتھ (امیرزا ریاض) -

بالواسطہ :- ادبی رسائل کے مدیرانِ گرامی اور افسانہ نگاروں کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی اور پشاور یونیورسٹی کے، ایم اے اردو کے اُن طلباء وطالبات سے انتخاب میں مدد لی گئی جن کے خصوصی مطالعے کا موضوع "افسانہ" ہے۔ سب نے بڑے خلوص سے میری رہنمائی کی اور دوبارہ رسائل کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی اپنی فہرست سے نوازا۔ ان فہرستوں سے اپنی فہرست کا موازنہ کرنے سے انتخاب کی صحت کا یقین ہوا۔ اس سلسلے میں نسرین حبیب (شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی) نے خاص طور پر میری مدد کی اور انھوں نے اپنا کافی وقت اس کام میں صرف کیا۔

انتخاب کے دونوں طریقے استعمال کرتے وقت ایک بات واضح طور پر مرتب کے پیشِ نظر رہی ہے کہ یہ انتخاب کسی ایک مکتبِ فکر یا ایک نسل کا ترجمان بن کر نہ رہ جائے۔ اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا کہ فکر کا کوئی رجحان، جس نے فنّی صورت اختیار کر لی ہے، اُسے فراموش نہیں ہونا چاہیے اور ایک طرف روایت، اور دوسری طرف روایت کے سائے میں جو نئے رجحانات غیر محسوس طور پر اُبھر رہے ہیں، اِن سب کا اِس انتخاب کو آئینہ ہونا چاہیئے۔

آخر میں ایک ضروری فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ جن افسانہ نویسوں کی تحریریں اس مجموعے کی زینت ہیں، میں اُن کا شکر گذار اور احسان مند ہوں۔

سیّد قاسم محمود

آغا بابر

نیم کے پتّے

یہ بات تو اس پر واضح تھی کہ عورت کئی تہ در تہ اور پیچ در پیچ گھنڈیوں سے بنی ہوئی ہے۔ مگر یہ کہ عورت پہلے لڑے، پھر کوسے پھر طعنے دے، پھر لڑائی کو جنگ میں تبدیل کر دے اور مرد پر اتنے دستی بم پھینکے کہ اُس کی روح کے چیتھڑے اُڑ اُڑ کر ماضی حال اور مستقبل کی کھونٹیوں پر لٹک جائیں اور جب ان میں سے قطرہ قطرہ ہو کر حسرتوں کا خون ٹپکنے لگے تو مجبور و مقہور مرد سے پھر وہ چپٹ لپٹ کر شروع سے اخیر تک پورا پیار کرائے اور پھر اس طرح سکون سے سو جائے جیسے ان دونوں میں ٹھنی نہ ہو۔ اِس کا اُسے علم نہ تھا۔

طوفان گزرنے کے بعد اُجڑے ہوئے آشیانے کو بنانا خود اعتمادی کا عنوان ہوتا ہے مگر جب بار بار سیلاب اور آندھیاں آکر دیواروں کو گرائیں اور سامان بہا لے جائیں تو آدمی تھک ہار کر ہاتھ پاؤں ڈال دیتا ہے ہویدا کئی مہینوں سے عثمان کے پُرزے اُڑا رہی تھی جنھیں وہ پھر جوڑ لیتا یہ اس کا بڑا کارنامہ تھا۔ ہویدا کے اندر بیزاری اور غصّے کی چنگاریاں بھری رہتیں مگر عثمان سراسر مفاہمت بنا رہتا۔

وہ اپنے دوستوں اور ان کی بیویوں سے ہویدا کو امن اور راحت کی

خاطر ملواتا مگر ہو بدا گھر پہنچتے پہنچتے آگ بگولا ہو جاتی۔ غصّے کی چنگاریاں چھپا لیتی جورات کو انار بن کر پھوٹتیں اور خطرناک بارود کے پٹاخے اور ٹوٹکے بن کر عثمان کے مردانہ وقار اور انا کے لیے خطرہ کھڑا کر دیتیں۔ وہ اس دم بدم بھڑکنے والی آگ سے اپنی رُوح کے جامے کو بچانے کی بار بار کوشش کرتا مگر پے در پے دھماکے اُسے عاجز کر دیتے۔ ایک چنگاری ایسی لگتی کہ جامہ جل کر راکھ ہو جاتا۔

"تمھارا شمشاد کی بیوی سے تعلق ہے۔ میں نے اُس کی شہرت بھی سن لی۔ آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ افضال کی بیوی تمھارے ساتھ اتنی بے تکلف کیوں ہے، تم کسی کو تو چھوڑ دو۔ ڈائن بھی چار گھر چھوڑ دیتی ہے"۔ عثمان کی رُوح کے پُرزے اُڑتے، گھر کو آگ دکھا دی جاتی۔ احساسات اُلجھنے لگتے۔ مجبور اور دیوانی پرچھائیاں رُوح کے گرد ناچنے لگتیں۔ وہ اپنے مردانہ وقار پر ان حملوں کی تاب، نہ لا سکتا۔ اُس کی سوچ جواب دے جاتی۔ اُس کا ذہن رُک جاتا۔ وہ نڈھال اور بے بس ہو کر کرسی پر گر پڑتا۔ اُس کی جھولی میں مرجھائے ہوئے پھولوں کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ وہ بے بسی سے ستاروں کو دیکھتا، رات کے سناٹے کو سنتا۔ اس کے اندر زخم کھاتے ہوئے سانپ، کا انتقام جاگتا پھر اس کا پیچ و تاب اور اضطراب دیکھنے کو کہکشاں کی پُر سکون جھلملاہٹ جیسے اُس پر جُھک جاتی۔

صفائی کی گواہیاں شہادتیں اور بیانات نکان سے چور چور ہو کر گر پڑتے۔

"تمہیں مجھ سے پیار نہیں رہا۔"

"کون کہتا ہے؟" عثمان ہویدا پر جھک جاتا۔ کہکشاں کھسک کر دور وہیں اپنی جگہ جا کر مسکرانے لگتی۔

رات کا اندھیرا گہرا ہوتے ہوتے بہت گہرا ہو جاتا۔ پھر صبح کا ستارہ نمودار ہوتا تو پھول اور کانٹا یک جان ہو گئے ہوتے۔

ہویدا عثمان کے بازوؤں میں بڑے سکون سے سوئی پڑی ہوتی۔

جب سے عثمان کی جھولی میں شمشاد اور افضال کی بیویوں کو ڈال دیا گیا تھا۔ اُن عورتوں سے عثمان کے لیے نگاہ ملانا مشکل ہو گیا تھا۔ انہیں کہیں دیکھ لیتا تو نگاہیں دوسری طرف پھیر لیتا۔ اُس نے ہویدا کی خوشی کے لیے شمشاد اور افضال سے ملنا ترک کر دیا مگر ہویدا اب بھی مطمئن نہ تھی ہر عورت اس کی بیرن تھی جس جگہ جاتے وہ عثمان پر نگاہ رکھتی کہ وہ کسی عورت سے دو باتوں سے تیسری بات نہ کرنے پائے اور اگر کسی سے ذرا لمبی بات ہو جاتی تو عثمان کی شامت آجاتی۔ کیا کہتی تھی؟ تم نے کیا کہا؟ تمہیں کیا ضرورت تھی اُس سے بات کرنے کی؟

مسز مرزا ہویدا کی نئی دوست بنی تھی۔ ایک پارٹی پر عثمان نے اس سے اتنا پوچھ لیا "مرزا کہاں ہیں؟"

"کراچی۔"

"کب آئیں گے کراچی سے؟"

اُس دن تاروں بھرے آسمان کے نیچے دونوں اپنی اپنی آرام کرسیوں

پراس طرح مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے جیسے بڑا سخت رن پڑنے والا ہو۔
ہویدا نے حملہ کیا "تمھیں کیا ضرورت تھی دخل درمعقولات کی۔ مرزا کہاں ہیں اور کراچی سے کب آئیں گے۔ کیا تم مرزا کی عدم موجودگی میں مسز مرزا کا خاوند بننا چاہتے ہو؟"

عثمان کے انا کی گردن ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔ حملہ آور خود کرسیوں پر نہ بیٹھے ہوتے تو کرسیاں چل جاتیں۔

"دیکھ ہویدا زبان قابو میں رکھ۔"

"تم دونوں بھائی حرامزادے ہو۔"

عثمان تڑپ اُٹھا۔ اُس کا ہاتھ طمانچے کے لیے ہوا میں لہرا کر رُک گیا، مگر عثمان کا گریبان ہویدا کے ہاتھ میں آکر چرچی بتی ہو گیا۔

وہ عثمان کے کتنی قریب ہو کر کتنی دُور ہو گئی تھی۔ عثمان نے اپنے ننگے سینے کے ساتھ اُسے چمٹا لیا۔ غصے اور زہر کی چنگاری پر برف پڑ گئی۔ وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ ایکا ایکی چاند پر بدلی کی جھالر لٹک گئی۔ نسوانیت کے ابریشمی پرتو کے بند کھُل گئے۔ پھر عثمان کی مجروح اور لنگڑی رُوح اُسے ریلنے پیلنے میں لگ گئی۔

وہ اپنی چارپائی پر لیٹ کر جذبات کے اس اُلجھے ہوئے پیچیدہ مدوجزر کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا جو اس کے فہم و ادراک سے ماورا تھا۔ اس اُوپر سے ٹھونسے جانے والے میکانکی اندازِ محبت سے اُس کی روح کا تمام حظ اور حس کی تمام حلاوت رخصت ہو چکی تھی۔ مجروح جذبات کے

ہوتے ہوئے محبت اُمڈ کر کیسے آئے؟ یہ کڑی آزمائش اُس کے لیے سوہانِ روح بن گئی تھی جیسے شکستہ پا غزال سے کوئی شقی القلب چوکڑیاں بھرنے کو کہے اور غزال کی آنکھوں میں بے بسی اور مجبوری جھانکنے لگے۔

وہ سوچنے لگا، کتنے خوش نصیب ہوں گے وہ شوہر جن کی بیویاں دوسروں سے لڑتی جھگڑتی ہوں گی مگر اپنے خاوندوں سے صلح رکھتی ہوں گی۔

"میں کہتا ہوں یہ صاحب کا حوصلہ ہے۔ اپنی جورو ایسی ہو تو گردن کاٹ کے رکھ دوں، سات سلام ہوں ایسی نوکری کو۔" ڈرائیور نے روز کی تناتنی دیکھی تو نوکری چھوڑ کر چل دیا۔

ایک روز عثمان باغیچہ میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ ہویدا پاس آکر بیٹھ گئی۔ ایک لمحہ کے لیے عثمان خوش ہوا کہ زندگی کتنی اچھی ہے ہویدا نے نظر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا اور بولی:

"اچھا مالن کو دیکھ رہے ہو۔"

"کیا؟" عثمان بھونچکا رہ گیا۔

"وہ سامنے بیٹھی بچے کو چھاتیوں سے دودھ پلا رہی ہے، حرامزادی کے لیے جیسے یہی جگہ رہ گئی تھی۔"

عثمان نے ہڑبڑا کر دیکھا۔ دور پودوں کے پیچھے مالن گود میں بچے کو لیے بیٹھی تھی۔ مگر اسے یہ اب معلوم ہوا تھا۔

ہویدا اُٹھ کر نوکروں کے کوارٹروں کی طرف چل دی۔ عثمان نے دل میں کہا ہویدا کی چال کتنی اچھی ہے۔ پھر قدموں کی چاپ سن کر اُس نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹایا تو ہویدا اور مالن اُس کی طرف چلی آ رہی تھیں مالن کی قمیص پر جہاں اُس کی دُودھ سے اُبلتی چھاتیوں کی اکڑاہٹ تھی گیلے دودھ کے دھبّے تھے جیسے وہ بچے کے منہ سے دُودھ کھینچ کر چلی آئی ہو۔

"میرے میاں تیرے ساتھ کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ان کے پاس بیٹھ جا۔ کرسی پر بیٹھ۔"

ہویدا کی زبان میں سخت زہر بھرا ہوا تھا۔

مالن عاجزانہ طور سے عثمان اور ہویدا، کی طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی عثمان کے جذبات ایک دم بھڑک اُٹھے۔ اُس کا جی چاہا کہ اُٹھ کر مالن کے سامنے ہویدا کے منہ پر دو تین جڑ دے کہ لو یہ ہوتا ہے نتیجہ مرد کے انا کا بار بار تپتی سیخوں سے داغنے کا۔ مگر اس کا مزاج پھر رُوح کی دھجیاں جوڑنے اور غصہ پی جانے کا کارنامہ سرانجام دے گیا۔

اگلے روز صبح صبح مالی اور اُس کی بیوی نے کوارٹر خالی کر دیا۔ مالی کے چلے جانے سے ہویدا کو کوئی تکلیف نہ ہوئی مگر ڈرائیور کے چلے جانے سے بڑی دشواری ہو رہی تھی۔ ٹرڈس کی کوٹھی کا ڈرائیور ایک جان پہچان والے کو لے آیا۔ اور بولا: "بیگم صاحب، دلاور خاں ایک انگلش کمپنی میں ملازم تھا بڑی اچھی گاڑی چلاتا ہے مگر اب بُرے دن آ پڑے ہیں۔ آپ جو تنخواہ دیں گی اُسے منظور ہو گی۔"

ہویدا نے پہلے گاڑی چلوا کر دیکھی پھر سو روپے تنخواہ مقرر ہو گئی۔ لا نے والے نے کہا: "اس کی بیوی بچّے کسی پرائے گھر میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر اسے ملازموں کے کوارٹروں میں جگہ مل جائے تو بے فکری ہو جائے گی۔"

"ہاں کیوں نہیں۔"

دلاور خاں بیوی اور چار بچّوں کے ساتھ کوارٹر میں رہنے لگا۔ کپڑے بچّوں کے تن پر کہاں تھے۔ دو بڑے گندے سے چیتھڑے پہنے پھرتے۔ دو چھوٹے ننگ دھڑنگ پھرا کرتے۔ بیوی برقع پہنتی اور سخت پردہ کرتی۔ عثمان دورے سے آیا تو اُس نے کوٹھی کے احاطے سے گزرنے والے ان گورے گورے مگر میل سے اٹے بچّوں کو دیکھ کر پوچھا "یہ کون ہیں؟"

"ڈرائیور کے بچّے ہیں۔ آپ کے پیچھے میں نے ڈرائیور رکھ لیا ہے۔"

"گاڑی ٹھیک چلاتا ہے؟"

"جی ہاں۔"

ڈرائیور نے آکر سلام کیا۔ عثمان نے اُس کی پہلی نوکریوں کا آگا پیچھا پوچھا پھر لائسنس دیکھ کر بولا:

"تمھارے بچّے بہت ہیں، انھیں صاف رکھا کرو۔ کیا تمھارا کوئی بچّہ منہ نہیں دھوتا۔ بڑے گندے رہتے ہیں۔"

"نہیں صاحب اب صاف رہیں گے۔ اصل میں غربت بڑی رہی ہے سرکار۔ بڑا لڑکا گیارہ بارہ برس کا ہے۔ اگر اسے کہیں نوکری دلا دیں آپ دعائیں

دوں گا۔"

"کرادیں گے۔ جاؤ گاڑی صاف کرو۔"

دلاور خاں کے کوارٹر کی کھڑکی ہویدا کے سونے کے کمرے کے رُخ تھی۔ جب عثمان کے دفتر چلے جانے کے بعد کھلتی تو گوری چٹی عورت نظر آتی، جس کا لباس اکثر سُرخ ہوتا جس میں وہ سونے کی طرح دمکتی رہتی۔

ایک دن کار میں ہویدا نے دلاور خاں سے کہا، "ڈرائیور تمہاری بیوی بڑی خوبصورت ہے۔"

"جی ہاں بیگم صاحب، پانچ بچے پیدا کرنے پر بھی اُس کی کاٹھی بڑی مضبوط رہی ہے۔"

"تمہارے چار بچے ہیں یا پانچ؟"

"جی ایک مر گیا تھا۔"

دُھوپ کا رنگ اب زرد ہو گیا۔ اور تیزی بھی کم ہونے لگی تھی۔ رات کو خنکی ہو جاتی۔ کوّے درختوں اور منڈیروں پر کائیں کائیں کرتے پھرتے ایک دن عثمان اور ہویدا برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ہویدا ٹرنکوں میں سے گرم کپڑے نکال نکال کر دیوان پر رکھ رہی تھی، جن میں سے اکّا دکّا فینائل کی گولیاں نیچے گر رہی تھیں اور بچّے سال بھر آنکھوں سے اوجھل بند رہنے والے کپڑوں کو دیکھ دیکھ کر اُٹھا اُٹھا کر خوش ہو رہے تھے۔

کچھ بھٹکل مال ہویدا نے ایک طرف ڈھیر کر دیا۔ عثمان کا ایک پرانا کوٹ

جیسے پہننا وہ ترک کر چکا تھا اُس نے اُٹھا کر پوچھا "یہ تو آپ نہیں پہنتے ڈرائیور کو دے دوں"

"دے دو"

اُس نے ڈرائیور کو بلوا کر کہا "ڈرائیور یہ ہمارے بچّوں کے کپڑے ہیں تمھارے بچّوں کو آجائیں گے۔ یہ کوٹ تمھارے لیے ہے"

ڈرائیور گٹھڑا اُٹھا کر دعائیں دیتا چلا گیا۔ کوارٹر کی طرف سے بچّوں کا شور سنائی دیا جو خوشی سے بےچین تھے۔ پھر ڈرائیور کی آواز سنائی دی: "او کملیو ابھی رہنے دو۔ جب سردی شروع ہوگی جب پہننا۔"

گھٹنوں چلتا گود کا بچّہ پودوں کی اوٹ سے باہر نکل آتا تو اسے اٹھانے کو جب لپکتی تو ڈرائیور کی بیوی کی جھلک دکھائی دیتی۔ ایک روز ہویدا نے دیکھا۔ کار میں بیٹھتے وقت عثمان کی نگاہیں کوارٹر کی طرف اُٹھی تھیں۔ پھر یہ واقعہ ہوا کہ عثمان دفتر جانے کے لیے کپڑے بدل رہا تھا کہ ادھر کھڑکی کا پردہ اُٹھا ہوا تھا اُدھر دلاور خاں کے کوارٹر کی کھڑکی کے پٹ کھلے تھے۔

"میں اس حرامزادی کو تو آج ہی نکال باہر کرتی ہوں"

"کس کو" عثمان نے شیشے میں نکٹائی باندھتے ہوئے پوچھا۔

"جس کو آپ دیکھ رہے ہیں جس نے کھڑکی کھول رکھی ہے"

ہویدا ایک دم سے باہر چلی گئی اور اس نے تنگ آکر آواز دی "ڈرائیور ادھر آؤ۔"

دلاور خاں جو گاڑی صاف کر رہا تھا "جی" کہہ کر لپکا۔ ہویدا نے ...

کہا "میں نے پہلے روز کہ دیا تھا کہ یہ کھڑکی صاحب کے دفتر جانے کے بعد کھلے گی، کیا تھا نا۔ ابھی صاحب دفتر نہیں گئے۔ تمھاری بیوی نے یہ کھڑکی کیوں کھولی ہے؟"

اس نے جاکر کچھ کہا۔ کھڑکی کھٹ سے بند ہو گئی۔

عثمان کو جب گاڑی چھوڑ آئی تو ہویدا بازار چلی گئی۔ جب آئی تو سکول کا وقت ہو گیا تھا اس نے ڈرائیور کو بچوں کو لینے سکول بھیج دیا۔ ملازم کو دلاور خاں کی بیوی کو بلانے بھیجا اور خود برآمدے میں بیٹھ گئی۔ نوکر نے آکر کہا "وہ کہتی ہے مجھے گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں؟"

"اچھا یہ بات ہے؟" ہویدا غصّے میں اُٹھی اور دو قدموں میں ملازموں کے کوارٹروں تک جا دھمکی۔ دلاور خاں کی بیوی برتن دھو رہی تھی "میں نے تمھیں بلا بھیجا تھا تم نے کہا مجھے گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ اتنی نواب زادی ہو تم مجھے پتہ نہ تھا مگر اتنا پتہ ہے کہ تم وقت بے وقت کھڑکی کھول کر اپنا جوبن میرے میاں کو دکھاتی رہتی ہو۔ میں نے سوچا تھا صاحب سے آج تمھاری ملاقات کرادوں۔ دونوں کی بے چینی دور ہو جائے؟"

دلاور خاں کی بیوی کا رنگ لمحہ بھر کے لیے پیلا پڑ گیا۔ وہ ہاتھ دھو کر اُٹھ بیٹھی اور بولی "میرے خاوند کو تو تو جوبن دکھاتی پھرتی ہے، تیری بے چینی دور ہو جاتی ہے جب کندھے سے کندھا ملا کر میرے خاوند کے ساتھ جُڑ کر بیٹھتی ہے گاڑی میں اور گھومتی پھرتی ہے اکیلی؟"

ہویدا کو محسوس ہوا جیسے اُس نے غلط عورت کو ہاتھ ڈال دیا "زیادہ بات کی تو زبان کھنچوا دوں گی۔"

"چچنے پچنے منہ دھو کے آ" دلاور کی بیوی نے ہوا میں ہاتھ نچائے۔

"بڑی احسان فراموش ہو کمینی میں نے رحم کھا کر تیرے بچّوں کو کپڑے دیئے" ہویدا ذرا نرم ہو کر پینترا بدلنے لگی۔

"میرے بچّوں کو اپنے یار کو کوٹ دینے کی خاطر دیے ہوں گے۔ پر تمھیں بتا دوں تیرے اُوپر تھوکے گا بھی نہیں میرا خاوند۔ اپنا سینہ دیکھ ڈلا ہوا لوکڑ مال اور یہ دیکھ روئی کا گالا۔"

اُس نے سینہ چھلکایا۔ پھر اپنا گریبان پھاڑ ڈالا۔ ہویدا کی حالت قابل رحم ہو گئی۔ بڑی جرأت کر کے کہہ سکی "بے حیا۔"

"بے حیا تم۔ اپنی کھینچی ہوئی کمانیاں دیکھ۔"

ہویدا نے عاجزی سے نظر بھر اکر دیکھا۔ بھنگی باورچی اور مشالچی سب باہر آن کھڑے ہوئے تھے۔ ہویدا نے مشالچی سے کہا "جاؤ پولیس کو بلاؤ اس کمینی کا دماغ ٹھیک کرا دوں۔"

"بلاؤ جلدی بلاؤ۔ میں کہوں گی میرے خاوند سے تعلق ہے تمھارا اور تمھارا کپڑوں کا احسان۔ چچنے۔"

اُس نے کپڑوں کو ڈھیر کیا۔ مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگا دی۔ خود غصّے میں آگ بگولا بنی پاس یوں کھڑی ہو گئی۔ جیسے بے نیام تلوار "خدا کرے میرے بچّے ننگے پھریں پر تم جیسی کا دیا نہ پہنیں۔" کپڑے بھڑ بھڑ جلنے لگے اور وہ کوک بھرے

کھلونے کی طرح بولتی رہی۔

دلاور جب سکول سے بچّوں کو لے کر آیا تو تانگے میں کباڑ خانہ لدا رہا تھا وہ اپنی بیوی کے گستاخانہ سلوک کا سن کر ٹرے غصّے میں اپنے کوارٹر کی طرف بڑھا جیسے بیوی کو آج پیٹ ڈالے گا۔ مگر ٹھنڈے قدم واپس آکر بولا۔ آپ نے میری بیوی کی عزّت پر الزام لگایا ہے۔ بیگم صاحب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔"

تانگہ ہویدا کے سینے پر مونگ دلتا، کوٹھی کی بجری کو چرچراتا ہوا نکل گیا۔ بچّے ہویدا کا منہ تکنے لگے۔ جیسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس تانگے میں اُس کی عزّت کا دیوالہ پٹ کر نکل گیا۔

عثمان آیا تو ہویدا چپ چپ بیٹھی تھی۔ عثمان نے ہویدا کے اُترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا "تم اس طرح چُپ چُپ کیوں بیٹھی ہو؟"

ہویدا کی آنکھوں میں نم آگیا۔ اس نے سارا واقعہ سُنا ڈالا۔

"اور یہ نوکر کھڑے اُس عورت کا منہ دیکھتے رہے۔ انھوں نے کچھ نہیں کہا۔"

ہویدا روہانسی ہو کر بولی "کچھ نہیں"۔

اُس نے ہویدا کو سینے سے لگا لیا اور نگاہ اس کی اُس راکھ پر جا پڑی جہاں سے جلیبھڑے کے سلگنے سے کالے دھوئیں کی بل کھاتی ہوئی لکیر اُوپر کو اُٹھ رہی تھی جسے دیکھ کر عثمان کے پیٹ کی گٹھڑی میں سے خوشی کا ایک میٹھا میٹھا سا بلبلا پھوٹا وہ تھوڑا سا مسکرایا۔ پھر اس نے ہویدا کا سر چوم لیا اور بولا "دفع کرو۔ تم سمجھو کوئی بات نہیں ہوئی۔"

نقوش:

○

ڈاکٹر احسن فاروقی

بڑا تعجّب

مجھے خود بڑا تعجب ہے کہ یہ سب کچھ کیا ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سب کچھ خواب میں ہو گیا۔ مگر سب کچھ حقیقت ہے، ہاں سب بالکل حقیقت ہے۔ دو بچے ہو چکے تیسرا پیٹ میں ہے۔ میں اب بہتر ۷۲ برس کا ہو جاؤں گا اور وہ کوئی سولہ ۱۶ کی ہو گی۔ مگر یہ سب کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ بعض وقت سوچتا ہوں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں کہیں سو تو نہیں رہا ہوں۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ سب چیزیں حقیقت ہیں۔ میری پہلی بیوی کے بچّے ـــــ اور اُن کے بچّے ـــــ یہ گھر وہی ہے جس میں ہمیشہ رہا یہیں سے سب بچّوں کی شادیاں ہوئیں۔ یہیں سے پہلی بیوی کا مُردہ اُٹھا اور یہیں وہ خواب کا عالم طاری ہوا جو اب تک جاری ہے۔

وہ میری سب سے چھوٹی سالی کی سب سے چھوٹی لڑکی ہے! بڑے تعجّب کی بات ـــــ وہ میرے بڑے لڑکے کی بڑی لڑکی سے چھوٹی ہے۔ مگر وہ میرے ساتھ رہ رہی ہے۔ بڑی خوش ہے۔ دھڑا دھڑ بچّے ہو رہے ہیں کوئی سال خالی نہیں گیا ہے۔ کیا میری سچ مچ اس سے شادی ہو گئی ہے۔ کیا میرے یہ بچّے ہیں؟ کیا میں زندہ ہوں یا کسی اور دنیا میں ہوں۔ کیا میں

سو رہا ہوں اور جب جاگوں گا تو یہ سب خواب کی طرح بے حقیقت نظر آئے گا؟

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

ہاں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ساری زندگی خواب تھی جو اس تعجّب خیز خواب کی طرف آ رہی تھی۔ اس کی ماں کوئی پانچ یا سات برس کی ہوئی جب میری شادی ہوئی۔ وہ مانجھے لے کر آئی تھی۔ گوری گوری گول منہ کی لڑکی کار چوبی کپڑوں میں دبی جا رہی تھی۔ اس نے چھوٹے سے ہاتھ سے میرے ابٹن لگائی اور شرما گئی۔ میری بیوی نے کوئی بارہ تیرا برس چھوٹی بتائی جاتی تھی۔ مجھ سے کوئی پندرہ برس چھوٹی ضرور ہوگی۔ مانجھے کے دن لوگوں نے کہا کہ یہ نمونے کی لڑکی ہے اور بیوی مرحومہ سے وہ بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ شادی کے بعد وہ برابر اپنی بہن کے پاس آتی رہی بہن کے بچّوں کو کھلاتی رہی۔ جب بہن زچہ خانے میں ہوتیں یا بیمار ہوتیں تو سارا گھر سنبھال لیتی۔ میری ساس مرحومہ کہا کرتی تھیں، "بڑا بہنوئی باپ کی جگہ پر ہوتا ہے"۔ اور میں نے ہمیشہ اپنے کو اس کے باپ کی جگہ سمجھا۔ ایک دن اس کو گھر پہنچانے جا رہا تھا۔ وہ برقعہ اوڑھے پیچھے پیچھے تھی میں آگے آگے۔ میرا ایک دوست گرم سرِن تھا، راستے میں ملا۔ لولا بھابی ہے ساتھ"۔ میں نے کہا۔ "نہیں اس کی بہن ہے"۔ کہنے لگا "میاں یہ سالی بازی ٹھیک نہیں"۔ میں نے ڈانٹ دیا "کیا بکتا ہے"۔ اور وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔ خیر میں نے اسے ہمیشہ لڑکی ہی سمجھا۔ اس کی شادی کی، اس کے بچے ہوتے رہے

میرے پیچھے اس کے بچے سب بڑھتے رہے ساتھ کھیلتے رہے قرنوں کی باتیں ہیں۔ پوری پوری زندگیوں کے حال ہیں۔ ایک بات ہو تو کوئی کہے۔ داستان کی داستان ہے مگر اس داستان کا یہ رخ بدلنا۔ اف، اف کیسا عجیب کیسا تعجب انگیز، بڑا تعجب ہے۔

خیر میرے بھیوں، بچوں کی شادیاں ہوئیں۔ بیوی بھی مرحوم ہو گئی۔ اس کے بھی چار بچوں کی شادیاں ہوئیں۔ وہ بھی مر گئی۔ ایک یہ لڑکی کوئی چھ برس کی چھوڑ گئی۔ اس کا باپ بھی عزیز ہی ہوتا ہے اور وہ بھی خبط کی آدمی تھا۔ سال بھر تک وہ اس لڑکی ہی کی دیکھ بھال کرتا رہا مگر ایک دن معلوم ہوا کہ اس نے ایک لڑکی سے شادی کر لی۔ میں جو کبھی کبھی وہاں چلا جاتا تھا وہ بند ہو گیا تھا۔ ہے کہ میری عزیزداری تو کسی سے تھی ہی نہیں۔ سالی کے بچے تھے۔ مجھے خالو کہتے تھے۔ ہم زلف تھے۔ بھائی کہتے تھے۔ وہ لائے نئی نویلی لڑکی تو نئی بیوی سے پردہ کرانا لازمی تھا۔ رہی ان کی لڑکی وہ مجھ سے مانوس ہو گئی تھی۔ میرے سب بچے اپنے اپنے ٹھکانے تھے۔ ان کے بھی۔ بس یہ آٹھ برس کی لڑکی رہ گئی تھی۔ یہ اپنے بھائی بہنوں کے یہاں بھی کبھی کبھی چلی جاتی مگر رہنا تھا اپنی سوتیلی ماں ہی کے پاس۔ میں نے دیکھا کہ سوتیلی ماں اس پر زیادتیاں کرنے لگی، وہ میرے پاس آ جاتی اور رو رو کے بیان کرتی۔ میں نے اس کے باپ سے کہا کہ اسے پڑھواؤ۔ وہ ٹال گئے۔ میں نے کہا تم جیتی دولت گا تو راضی ہو گئے ہیں۔ میں نے اسے لے جا کے اسکول میں نام لکھوا دیا اور سب خرچ پڑھائی کے دیتا رہا۔ وہ اسکول سے زیادہ تر ادھر ہی آ جاتی پھر

گھر کو اپنا گھر سمجھتی۔ گھر کے کام کرنے لگتی۔ اکثر یہیں رہ جاتی۔ مگر پھر بھی غیر کی بچی تھی۔ باپ کے گھر ہی رہنا تھا اسے۔

چار برس یوں ہی کٹ گئے۔ پڑھنے میں وہ زیادہ اچھی نہ نکلی۔ بہر حال ساتویں درجہ میں آگئی۔ جوان ہو رہی تھی اور اب اس میں تعجب انگیز تبدیلیاں ہونے لگیں۔ پہلے پہلے کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ جوان ہوتے ہی سب لڑکیاں اپنے تئیں سجانے بنانے لگتی ہیں۔ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ مگر وہ مجھ سے ایک خاص طریقے پر شرمانے لگی۔ یہ شرماہٹ عجیب تھی۔ مجھ سے شرمانا اس کی ماں کبھی نہیں شرمائی اس طرح، مگر اس کے شرمانے میں ایک عجیب معشوقانہ ادا تھی جس پر مجھے تعجب ہوتا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس کے دل میں کیا ہے اور پھر میرے دل میں عجیب گدگدی ہوتی تھی۔ مرد کو عورت کی طرف توجہ ہوتی ہی ہے اور میں عورتوں کو دیکھ کر آنکھیں تو بند نہیں کر لیا کرتا تھا مگر کم سن لڑکیوں کو میں اپنی لڑکیوں کی طرح سمجھنے کا قائل تھا۔ جوان عورتوں میں کبھی کوئی بہت اچھی ہوئی تو آنکھ بھر کے دیکھ لیا۔ اس سے زیادہ کبھی سروکار نہ ہوا۔ بیوی کو مرے ہوئے کوئی پندرہ برس تو ہو گئے ہوں گے کبھی دوسری کرنے کا خیال بھی نہ ہوا۔ ساٹھ سے اوپر سن بھی آگیا تھا۔ بچوں کے پیچھے ہو رہتے تھے۔ کبھی اگر کوئی بھولے بھٹکے خواہش بھی ہوتی تو یہی کہتا کہ اب بڑھاپے میں کیا بڑھ بھس لگے گی۔ مگر اس کا خاص طریقہ پر شرمانا اور میرے دل میں خاص قسم کی گدگدی ہونا بڑی تعجب انگیز باتیں تھیں۔ میں اکیلا تھا۔ اکیلا ہی رہتا تھا۔ اکثر سوچا کرتا یہ کیا ہو رہا ہے اور بڑا تعجب ہوتا

کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اے میرے اللہ یہ کیا ہونے والا ہے۔

میں نے یہ محسوس کیا کہ اس کی ماں یہ چاہتی ہے کہ اس کا سارا بار مجھ پر پڑ جائے۔ پڑھائی لکھائی کے خرچوں کے علاوہ جوان ہوتی ہوئی لڑکی کو کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے اور سنگھار کی چیزوں کی بھی۔ وہ سب کچھ مجھ سے مانگنے لگی۔ مجھے ساتھ لے کر بازار لے جاتی اور یہ لے دیجیے اور وہ لے دیجیے، ہر قسم کا سامان لے آتی۔ سوتیلی ماں کے پاس یہ سب سامان لے جانے کو بُرا سمجھتی۔ میرے ہی گھر رکھ جاتی۔ صبح ہی آتی ناشتہ تیار کرتی، سنگھار کرتی رہتی اور یہیں سے اسکول جاتی۔ میں اپنے اس باہر کے حصے میں بیٹھا رہتا۔ جب کوئی یار دوست آ گئے اُن سے باتیں کرنے لگا۔ کبھی اُٹھ کر کسی کے یہاں چلا گیا پھر آ گیا کبھی کوئی کتاب وتاب پڑھتا رہتا، جب نیند آتی سو جاتا۔ اندر کے گھر کا سارا کام ایک بڑھیا کے سپرد تھا۔ اپنے گھر کی پرانی لونڈی تھی وہ رینگ کر سب کام کرتی اور کام بھی کیا تھا۔ میرا کھانا بنیا اور حقہ بھر کر یہاں رکھ جاتا۔ سارا گھر خالی ہی تھا۔ بڑھیا ایک کونے میں پڑی کھانستی رہتی۔ وقت پر اُٹھ کر کام کرتی پھر پڑ رہتی۔ میں بھی ادھر باہر پڑا ہی رہتا۔ مجھے کوئی کام ہی نہیں تھا دنیا کا۔

مگر کچھ دنوں کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ اس لڑکی نے میرے گھر کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ اپنی ساتھنوں کو اسکول سے یہیں لاتی۔ اس کی ہم سن لڑکیاں میرے سامنے سے گزرتی ہوئی اندر جاتیں پھر کچھ دیر کے بعد نکل جاتیں۔ میرے بچے سب اور شہروں میں ملازم ہیں۔ ان میں سے کوئی بال بچوں سمیت آ جاتا تو وہ

اپنے باپ کے گھر نہ جاتی، ان کی مہمان داری بالکل اسی طرح کرتی جیسے اس کی خالہ مرحومہ کیا کرتی تھی۔ آخر وہ سب اس کے خالہ زاد بھائی بہن تھے ہی۔ جب وہ لوگ چلے جاتے تو وہ بھی اپنے باپ کے گھر چلی جاتی، مگر روز صبح آنا، یہیں تیار ہونا، یہیں سے اسکول جانا اس کا ورد ہو گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ سوتیلی ماں اس کی کنگھی چوٹی سے جھنجھلاتی تھی۔ گھر کا کام کرانا چاہتی تھی بچے کھلوانا چاہتی تھی، مگر بھر بھی سیدھی نگاہ دیکھنے کو تیار نہ تھی۔ باپ نئی بیوی میں ایسے محو ہوئے کہ اس بیسیر لڑکی کو بھول ہی گئے تھے۔ یہ تو کہیے کہ میں نے پڑھنے میں لگوا دیا تھا نہیں، تو نہ معلوم اس کا کیا حال ہوتا۔

خیر جب وہ اسکول جانے لگتی تو میاں ایک لمحہ کے لیے ضرور رکتی۔ میرے سامنے نقاب الٹ کر کھڑی ہو جاتی۔ کبھی کہتی آج چار آنے کی ضرورت ہے کبھی آٹھ آنے کی۔ میں نکال کر دے دیتا۔ میں دیکھتا کہ اس کے بال نہایت عمدہ طریقہ سے سجے ہوتے۔ منہ پر سفید اور سرخ پوڈر مناسب طریقہ پر لگا ہوتا۔ ہونٹوں پر ہلکی ہلکی سرخی لگی ہوتی مگر اس کا مجھے دیکھنے کا انداز عجیب ہوتا۔ نگاہ میں عجیب شرماہٹ کے ساتھ ساتھ ڈھیٹ پن بھی نظر آتا۔ عجیب مشاہدہ تھا بیان کرنا مشکل ہے۔ دن دن بھر سوچا کرتا کہ یہ دکھائی کیسی ہے۔ اللہ میں نے تو کبھی کسی عورت کو اس طرح دیکھتے نہیں دیکھا۔ آخر اس لڑکی کے دل میں کیا ہے اور پھر بڑے تعجب کے ساتھ مجھے یہ محسوس ہوتا کہ یہ پُراسرار دکھائی میرے دل میں بھی عجیب کیفیات جگا رہی تھی۔ وہ اپنی مخصوص ادا سے مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی باہر کے دروازے تک جاتی پھر برقع کی نقاب چہرے پر

ڈالتی اور غائب ہوجاتی۔

میرا عجیب عالم رہنے لگا۔ اس کی صورت آنکھوں کے سامنے کھیلتی۔ مجھے کبھی پہلے کسی لڑکی کی طرف اس طرح توجہ نہیں ہوئی تھی۔ نگاہ ضرور لڑی تھی، مگر جوان ہوتے ہی شادی ہوگئی تھی۔ پھر بیوی ہی میں محو ہوگیا۔ بال بچوں میں پڑ گیا۔ لڑکیاں بڑی ہوئیں، اگر کسی جوان لڑکی پر نگاہ پڑ بھی گئی تو یہ محسوس ہوا کہ میری بہو بیٹیوں کی طرح کی ہے۔ مگر یہ لڑکی تو میرے سر پر سوار ہوتی جا رہی تھی۔ لاکھ کوشش کرتا، دھیان ہٹاتا اور کاموں میں دل لگاتا مگر جب دیکھو اس کا چہرہ اور اس کی مخصوص دکھائی آنکھوں کے سامنے اس کی خالہ اور ماں دونوں گوری تھیں مگر اس کا باپ سانولہ تھا۔ اس لیے اس کی رنگت چمپئی سی تھی۔ پوڈر سے اور بھی کھل جاتی تھی۔ یہ رنگت عجیب طرح دل میں گھلنے لگی۔ میں نے کبھی پہلے کسی عورت کی رنگت پر غور نہیں کیا تھا۔ مگر یہ رنگت گھنٹوں توجہ کا مرکز رہتی۔ سوچنے لگا کہ ایسی دلکش رنگت نہ کبھی دیکھی نہ سنی۔ یہ حسن کا کیا کرشمہ ہے، یہ کیا جادو ہے۔ پھر چونکتا اور کہتا کہ مجھے یہ کیا ہوا جا رہا ہے۔ میرے خیالات کدھر بھٹکے جا رہے ہیں۔ جی چاہتا کہ اپنا حال کسی سے کہوں، میرے ساتھ بیٹھنے والوں میں میرے ہم سن ہی لوگ تھے مگر ان سے ذکر کرنے میں عجیب بسکی محسوس ہوتی۔ میرے ایک ہم سن نے جوان لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ میں نے ان کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا۔ خوب بڑھ پھنس گئی ہے۔" اب لوگ یہی بات میری بابت بھی کہیں گے اور پھر سالی کی چھوٹی لڑکی۔ ارے نواسی پوتی کے برابر۔ مجھ کو باپ نہیں نانا سمجھتی ہوگی اور میں اس عالم میں۔ بڑا تعجب

ہوتا۔ میں اپنے تئیں سنبھالتا۔ نہیں۔ میں جلد سے جلد اس کی کہیں شادی کرادوں گا۔ مگر نہیں۔ محسوس ہوتا کہ جیسے میں اپنے دل کو نکال کر پھینک دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دوسرے کے ساتھ اس کی شادی کے خیال سے عجیب رقابت محسوس ہوتی۔ میں دن بھر اپنے جذبات سے لڑا کرتا۔ سہ پہر کو وہ پھر آجاتی اور پھر اپنی خاص ادا سے دیکھتی اور پھر سب کاٹے ہوئے جذبات اُبھر آتے۔ وہ تھوڑی دیر اندر آرام کر کے اپنے باپ کے گھر چلی جاتی۔ جاتے وقت پھر اپنی مخصوص اداؤں سے مجھے دیکھتی جاتی اور یہ ادائیں رات بھر کی کشمکش کا سامان پھر مہیا کر جاتیں۔

کبھی کبھی میں یہ بھی قیاس کرنے لگتا کہ اس کے دل کا کیا عالم ہوگا۔ اس کی میری طرف اس طرح توجہ پر مجھے بڑا تعجب تھا۔ اس کی دکھائی عجیب و غریب تھی۔ مجھے یاد آتا کہ میری مرحومہ بیوی جوانی میں سنگھار و نکھار کر کے ایسی ہی اداؤں سے مجھے دیکھا کرتی تھیں اور ان کی ان اداؤں پر جیسے میرا دل لٹنے لگتا تھا کچھ ویسی ہی کیفیت اب بھی دل میں محسوس ہوتی تھی۔ مجھے تعجب ہوتا کہ یہ تیرہ چودہ برس کی لڑکی مجھ ساٹھ باسٹھ برس کے بڈھے کو ایسی لُبھاؤنی نگاہوں سے کیوں دیکھے۔ اس کے دل میں کیا ہے؟ ہزاروں اس کے ہم سن اس سے کچھ بڑے جوان دنیا میں پھر رہے ہیں۔ اسکول آتے جاتے ہیں۔ سہیلی ساتھیوں کے گھروں میں آتے جاتے دکھائی دیتے ہوں گے۔ برقع کی نقاب تو ایک رسمی سی چیز ہو گئی ہے۔ اعتراض کرنے والوں کو آتا دیکھ کر ڈال لی جاتی ہے۔ آتے جاتے اس کا چہرہ کھلا ہی رہتا ہوگا اور ہزاروں نگاہیں اُس

پر بڑتی ہوں گی۔ آنکھ ناک کی بہت اچھی نہ سہی مگر ایسی بُری بھی نہیں ہے۔ لاکھوں دلوں کو لبھا لینے کے لیے تو صورت کافی اچھی ہے اور پھر کھلتی ہوئی کلی ہے اس کی طرف کسی کی نگاہ نہ اُٹھ جاتی ہو گی۔ باپ کو کوئی پروا نہیں۔ سوتیلی ماں چاہتی ہے کل کی جاتی آج جائے۔ اگر کسی کے ساتھ بھاگ جائے تو وہ لوگ اور بھی خوش ہوں کہ عذاب کٹا۔ مگر یہ مجھ بڈھے بڑے ہوئے پھونس کو کیوں لبھا رہی ہے۔ کیا سچ مچ لبھا رہی ہے یا میرا قیاس ہے۔ محض وہم ہے۔ میں اور غور سے اس کی دکھائی اور اس کی اداؤں کا مطالعہ کرتا گیا۔ اور مجھے زیادہ سے زیادہ تعجب ہوتا گیا۔ اس لڑکی کے اندر کوئی عجیب غریب ارواح تھی اور یہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ مجھے گھسیٹ لینا چاہتی تھی۔ میں باوجود اپنے بڑھاپے، اپنی کمزوری، اپنے تجربے کے اس کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ صاف یہ محسوس ہوتا کہ یہ مجھ سے وہی کچھ چاہتی تھی جو اس کی مرحومہ خالہ جوانی میں سنگھار کرنے کے بعد چاہا کرتی تھی۔ اس کی ماں نے ایسا کچھ کبھی نہیں چاہا۔ یہ عجیب لڑکی ہے۔ شاید یہ سب لڑکیاں ایسی ہی ہوں مگر اس قسم کی توجہ اپنے ہم عمروں سے کرتی ہوں گی۔ نانا دادا کے برابر بڈھوں کی طرف سے یہ خیال عجیب چیز تھی۔ مجھے بڑا ہی تعجب ہوتا۔

ساتھ ساتھ مجھے یہ محسوس کر کے بڑا تعجب ہوتا کہ میں اب تک جوان ہوا ہی نہیں اور اب جوان ہو رہا ہوں۔ عرصے سے دنیا کچھ بجھی بجھی سی معلوم ہونے لگی تھی مگر اب پھر نئے طریقے سے زندہ نظر آئی۔ میں قریب قریب ترک کے درجہ پر پہنچ چکا تھا۔ مگر اب بازار میں جانا اور خلق خدا پر نظر دوڑانا اچھا

معلوم ہونے لگا تھا۔ دریا کے کنارے لہروں کا لطف لینا۔ باغوں میں پیڑوں کے نیچے لیٹ جانا اچھا لگتا۔ حافظ کا یہ شعر یاد آتا اور میں اس پر سر دھنتا۔

رونقِ عہدِ شباب است دگر بستان را
می رسد مژدۂ گل بلبلِ خوش الحان را

جوانی میں کچھ شاعری سے بھی شوق ہوا تھا۔ استاد آرزو کے سامنے زانوئے تلمذ بھی طے کیا تھا مگر پھر گھر کے دھندھوں میں پڑ کر سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ ایک پرانے بکس میں جس پر ایچ ایچ دھول جم گئی کچھ کاغذات رکھے ہوئے تھے ان میں پرانی بیاض بھی یاد آئی اس کو نکالا اور شعر کہنے لگا۔ اب مجھے اس لڑکی سے کچھ شرم سی آنے لگی جب وہ سامنے آتی اور اپنی خاص ادا سے مجھے دیکھتی تو محسوس ہوتا کہ جیسے وہ بالکل عُریاں ہو کر سامنے آگئی اور لاشعوری طور پر میری نگاہیں جُھک جاتیں۔ میرا مُنہ پھر جاتا۔ اس پر بھی بڑا تعجب ہوتا عجیب جذباتی کشمکش۔ معلوم ہوتا کہ قرنوں کا دفن کیا ہوا مُردہ زندہ ہو رہا ہے، مگر اس کا گلا ہوا جسم اسے اُٹھنے نہیں دیتا۔ کہ نہیں سکتا کہ کوئی شیطان میرے اندر سما رہا تھا یا پھر یہ قدرت کا کوئی کرشمہ تھا۔ کوئی ناجائز تو نہ تھی۔ شاید جس چیز کو بڑھ بھس کہا جاتا ہے وہ یہی ہو۔ یہ بھی کوئی بیماری ہے۔ کسی سے دریافت کرنا چاہیے مگر کسی سے کہنے کے خیال سے بڑی شرم آتی۔ کیا کہے گا کوئی۔ کیا کیا ہنسی نہ اُڑے گی۔ ارے یہ مجھے ہو کیا گیا ہے؟ اور اس سب کو سوچ کر میں بڑے تعجب کے عالم میں آجاتا۔

اس سال اُس کے اسکول میں گرمیوں کی چھٹی ہوئی تو وہ دن دن بھر

میرے گھر میں ہی رہنے لگی۔ میں اندر کے حصّہ میں برسوں سے نہ گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس عالم میں ہے۔ ایک دن نہ معلوم کیا ہوا کہ اندر چلا گیا۔ دیکھا کہ وہ اسی تخت پر بالکل اسی طرح بیٹھی ہے جیسے اس کی خالہ بیٹھی رہتی تھی۔ گھر ہر طرح صاف شفّاف سجا سجایا تھا۔ تمام چیزیں باقاعدہ رکھی تھیں۔ بڑھیا باورچی خانے کی کوٹھڑی میں پڑی کھانس رہی تھی۔

اُس نے اپنی کشیدہ کاری سے نگاہ اُٹھا کر مجھے اسی طرح دیکھا جیسے کہ میری مرحومہ بیوی دیکھا کرتی تھیں اور پوچھا آپ کھانا کھائیں گے۔ میں نے تیار کر لیا ہے۔ بڑھیا کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ آپ کہیں تو کھانا لاؤں؟

میں نگاہیں جھکائے ہوئے ایک آدھ دُزدیدہ نگاہ اس کے چہرہ پر ڈالتا ہوا سنتا رہا اور ہاں بھوک تو لگی ہے کہہ کر چوروں کی طرح واپس آگیا۔ یہ بھی میرے لیے ایک تعجب کا عالم ہے۔ وہ میرا گھر سنبھالے ہوئے تھی اور خوش تھی۔ اس نے میری بیوی کی جگہ شوق سے لے لی تھی۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کیا ہونے والا تھا مجھے اس پر بڑا تعجب تھا۔

وہ میرے لیے سینی میں کھانا لگا کر لائی۔ میں کھانا کھاتا رہا وہ سامنے بیٹھی ایک رسالہ پڑھتی رہی۔ کھانا بڑھیا لے گئی۔ حقّہ لگا گئی۔ میں لیٹا حقّہ پیتا رہا مگر میرا عجیب عالم تھا۔ میرے اندر عجیب جذبات کا غلبہ تھا۔ عجیب خوف طاری ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ایک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا ہوں نیچے بڑی گہری وادی ہے اور میں گرنے ہی والا ہوں۔ اس دن وہ کئی کئی دفعہ اندر سے باہر آکر اُدھر سامنے بیٹھی اور رسالہ پڑھتی گئی۔ میرا ہول بڑھتا گیا۔ میں نے سوچا کہ

میں کسی لڑکے کے یہاں چلا جاؤں بلکہ ایک پیچھے سے دوسرے کے یہاں ہوتا پھروں۔ دس دس پانچ پانچ دن ہر ایک کے یہاں رہوں جب تک یہ اسکول بند ہیں۔ پھر دیکھا جائے گا اور میں نے اس سے کہا بھی "میں سوچتا ہوں تمھارے بھائی بہنوں کو دیکھ آؤں۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔" وہ بولی۔

"تم یہاں اس گھر میں رہنا۔"

"یہاں اکیلے میں مجھے ڈر لگتا ہے۔ وہ بڑھیا بھی اپنے گھر جانے کو کہتی ہے۔ اب کہتی ہے وہ لڑکے کے پاس رہے گی۔ اب اُس سے کام نہیں ہوتا۔"

"نہیں وہ ٹھہری رہے گی۔ میں اس کے لڑکے کو بلا دوں گا۔ وہ بھی یہیں ٹھہر جائے گا۔"

"مگر مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ کسی رات مرگئی اور بھتنی بن کر میرے سر پہ سوار ہو گئی تو؟"

مجھے شدت سے محسوس ہوا کہ وہ مجھے بری طرح جکڑے ہے اور میں اس سے الگ نہ ہو پاؤں گا۔ میں نے کہا "خیر سفر تکلیف دہ ہی ہوتا ہے اور آج کل گرمی میں۔ میں نہ جاؤں گا۔"

اب وہ روز میری اسی طرح خدمت کرتی رہی۔ میرا خوف کم ہوتا گیا وہ بھی اور زیادہ نڈری سے میرے قریب آتی گئی۔ اس کے چہرہ کا عالم عجیب سے عجیب تر ہوتا گیا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ کیا عالم تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ بھوکی ہے مگر غیرت کے مارے کہہ نہیں سکتی۔ ادھر میرے خیالات میں بھی عجیب عجیب

تبدیلیاں آنے لگی تھیں۔ میں نے یہ طے کر لیا کہ رات کو بھی وہ یہیں رہا کرے۔
مگر اتنے بڑے گھر میں اکیلے مجھے ڈر لگتا ہے۔ ابا کے یہاں دوسرا بہت
تو ہے۔ رات بھر خود ابا کی آہٹ رہتی ہے۔ باتوں کی کھسر پھسر سنائی دیتی
ہے اور بچوں کے رونے کی آوازیں آجاتی ہیں۔ دن میں ہاں وہ چھوٹی اماں کھا
جاتی ہیں۔ اس لیے میں ان سے الگ ہو جاتی ہوں۔ رات میں جا کر پڑ رہتی ہوں۔"
یہ سب اس نے عجیب حسرت سے کہا۔ صاف معلوم ہوا کہ جیسے وہ بالکل
میرے پاس رہنا چاہتی ہے۔ میں کہتا کہ میں بھی اندر رہا کروں گا مگر مجھے اس
کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سونے سے بڑا ہی خطرہ محسوس ہوا جیسے کہ میں پہاڑی
کی چوٹی سے کھڈ میں پھاند جاؤں گا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤں گا۔
ایسے ہی نہ معلوم کیا کیا ہوتا رہا۔ میں سب سوچ سوچ کر تعجب میں آ
جاتا ہوں اور تمام واقعات بھول جاتا ہوں ان کی ترتیب بھول جاتا ہوں۔ کبھی
کچھ یاد آتا ہے کبھی کچھ۔ سب بڑا ہی گڈ مڈ سر ہے۔ بالکل خواب کی طرح بے ربط
اور نہایت تعجب انگیز......
ہاں سب سے زیادہ تعجب انگیز واقعہ۔ بس کیا کہوں۔ کیسے بیان کروں
حلق خشک ہوا جاتا ہے۔ دماغ چکراتا ہے۔ ہنسی بھی آجاتی ہے کہ یہ سب کتنا
مضحک تھا۔ مگر یہ سب ہوا۔ خیر ایک رات میرے یہاں سے یہ گھر گئی اور پھر
واپس آگئی اور کہنے لگی "گھر میں قفل لگا ہے۔ وہ لوگ سینما گئے۔" میری سمجھ میں
نہ آیا کہ کیا کہوں۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد بولی "آپ مجھے بھی سینما لے چلیے۔"
میری اس کے میرے ساتھ اکیلے ہونے سے پریشانی بڑھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا

کہ چلو سینما میں وقت کٹ جائے گا۔ میں جلدی سے تیار ہو کر اس کے ساتھ سینما گیا۔ بھئی یہ سینما بڑی ہی اشتعال انگیز چیز ہے۔ بڑا ہی عجیب اثر رکھتی ہے۔ عاشقی معشوقی کے قصّے۔ جوان حسین لڑکیاں ناچتی تھرکتی دماغ خراب کر دیتی ہیں۔ اب میں بڈھا ہو کر کیا کہوں کہ اس فلم نے مجھے مست کر دیا۔ اور اس کے اُوپر بھی جو اثر ہوا ہو گا وہ وہی جانے۔ آخر وہ جوان تھی، بھوکی تھی۔ خیر جو بھی ہوا ہو۔ اس رات کو یاد کر کے میں بڑے ہی تعجّب میں آجاتا ہوں ...... معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں بے بس تھے۔ کوئی عجیب طاقت سیلاب کی طرح ہم کو بہائے لیے جا رہی ہے۔ ہم دونوں بہہ گئے ......

صبح کو میری آنکھ کھلی تو محسوس ہوا کہ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ پاس ہی پلنگ پر سو رہی تھی۔ خواب کیسے تھا، سب حقیقت تھی۔ کئی دن تک اس خواب نما حقیقت کا عالم طاری رہا۔ ہم دونوں خواب ہی کی دنیا سے گزرتے رہے۔ وہ اپنے باپ کے گھر گئی ہی نہیں اور نہ وہاں سے کوئی پوچھنے آیا۔

چوتھے دن میں یہاں باہر بیٹھا تھا۔ برقع اوڑھے ایک عورت اندر آگئی اور ایسے زور زور سے باتیں کرنے لگی کہ مجھے صاف صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"ہاں وہ کہتی ہیں خالو ہے تو کیا ہوا۔ کوئی ناجائز تو نہیں ہے۔ اور بڈھے کو کہو تو کیا سب کو جوان ہی تو مل جاتے ہیں، جیسے یہ آوارہ گردی کب تک، نکاح کیوں نہیں کر لیتے۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ اس کی سوتیلی ماں کی رائے ہے جو یہ نوکرانی شاید یا کوئی

محلے والی کہنے کو بھیجی گئی ہے۔ بہر حال میرے اس کے ساتھ نکاح میں کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ باپ بالکل راضی تھے۔ نکاح ہو گیا۔ اس کے بھائی بہن اور میرے بچے تعجب کر کے رہ گئے۔

اس نے پڑھنا بھی جاری رکھا۔ انٹرنس پاس کر لیا ہے اور انٹر کی تیاری بھی کرتی ہے۔ بچے بھی دیکھتی ہے، گھر بھی دیکھتی ہے، میرا بھی ہر خیال رکھتی ہے مگر یہ سب مجھے بڑا ہی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ جو جو سوچتا ہوں وہ وہ تعجب میں آجاتا ہے، تعجب بڑا تعجب!!!

نقوش: ○

احمد ندیم قاسمی

گلدستۂ خار

میں غصے سے دیکھا۔ میں نے ذرا سا سوچا، روبینہ کے ہاں چند گھنٹے کے قیام میں مجھے چند بار اس کا خیال سا آیا۔ مگر جب میں گھر واپس آئی تو میں نے اپنے کمرے کی تنہائی میں محسوس کیا کہ میرا سب کچھ اس کی گرفت میں چلا گیا ہے۔ تب میں نے اپنی اس حماقت پر ہنسنا بھی چاہا مگر اس کوشش میں میرے آنسو نکل پڑے۔

روبینہ کے ہاں جانے سے پہلے میں حیران ہوتی تھی کہ ہماری پرانی کتابوں اور ناولوں میں عشق ایک دم سے کیسے ہو جاتا ہے! میں نے ایسی ناولیں اور داستانیں بھی پڑھی تھیں کہ طرفین نے ایک دوسرے کو آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھا۔ بس ادھر سے چلمن ذرا سی ہٹی، ادھر کوچے میں سے گذرتے ہوئے نوجوان کی نظریں ذرا سی اُٹھیں اور قصہ تمام ہو گیا۔ نوجوان پورے قد سے گرا اور لڑکی نے چلمن سے ہٹتے ہی ہائے وائے مچادی کہ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ پھر نوجوان کو لخلخہ سنگھایا گیا اور لڑکی کے صندل لگائی گئی۔ اور وغیرہ وغیرہ اور وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔ مارے ہنسی کے میں بے حال ہو جاتی تھی۔

سہیلیاں مجھ سے پوچھتی تھیں کہ جب تمہیں یہ ناولیں اور داستانیں اتنی بے جوڑ لگتی ہیں تو ہم انھیں پڑھتی ہی کیوں ہیں اور میں کہتی تھی، مجھے لطیفوں سے رغبت ہے۔ یہ نسیخ چلی کے لطیفے نہ پڑھے، یہ کتابیں پڑھ لیں۔ بات ایک ہی ہے۔ میں انھیں بتاتی تھی کہ جہاں لکھنے والا پڑھنے والے کی آنکھوں میں آنسو لانا چاہتا ہے وہاں میں مسکرا دیتی ہوں۔ جہاں وہ رقّت طاری کرنا چاہتا ہے، وہاں مجھے گدگدی سی ہونے لگتی ہے اور پھر جب خفیہ ملاقات میں ہیرو ہیروئن شعروں میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ وہاں تو کچھ پوچھو نہیں۔ میں اپنا کمرہ بند کرکے اور لحاف اوڑھ کر خوب خوب ہنستی ہوں کہ جانے اس زمانے میں ہمارے ادب کو کیا ہو گیا تھا۔

میں ایک سوچا سمجھا عشق بھی کر چکی ہوں۔ میرا گھرانا پردے کا سخت پابند تھا مگر جانے ابّا جی کو کیا سوجھی کہ انھوں نے اپنے ایک دوست کے بیٹے انور کو یہ کہہ کر ہم سب کے سامنے بلا لیا کہ اپنا بیٹا ہی ہے۔ شاید اس لیے کہ بیٹی جب ایک خاص عمر کو پہنچتی ہے۔ والدین کو اس کا بَر ڈھونڈنے کے لیے اپنے اونچے اونچے اصولوں کے تخت پر سے اتر آنا پڑتا ہے۔ یہ تو خیر میں آج کہہ رہی ہوں مگر اس وقت ابّا جی کی دریا دلی دیکھ کر مجھے ان پر سخت پیار آیا تھا۔ یہ مری کا واقعہ ہے اور مری کے سے مقامات پر پہنچ کر ہر شخص کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے عام ڈھرّے سے ہٹ کر کوئی بات کرے میں اس ڈھرّے سے ہٹ کر بھی کیا کرتی کہ میں تو پردے میں تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی تھی کہ ایک اور ناول پڑھ کر ذرا سا ہنس لوں، مگر پھر

اباجی انور کو اندر لے آئے اور دو ہفتے کی مسلسل ملاقاتوں کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ انور مجھے چاہتا ہے۔ چند دن بعد مجھ پر بھی انکشاف ہوا کہ میں بھی انور کو چاہتی ہوں۔ اس کے بعد ہم میدانوں میں اتر کر بکھر گئے۔ اور مجھے یاد بھی نہ رہا کہ انور نے میرے دل میں ذرا سی چٹکی لی تھی۔ کوئی مہینہ بھر بعد انور کے ابا کا میرے اباجی کے نام خط آیا کہ انور کی شادی ہو رہی ہے اور ہم سب کو اس میں شامل ہونا ہوگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے انور نے اپنی جیب الٹ کر اس میں سے میلا جھاڑ دیا ہے۔ سارا دن میں نے منہ لبورے رکھا۔ رات نیند بھی ٹھیک سے نہ آئی۔ صبح کو ہماری بلی کے پنجے میں کانٹا چبھ گیا۔ جب تک کانٹا نکل نہ گیا اور بلی میری گود میں خرخرانے نہ لگی۔ میں نے اتنی بے چینی محسوس کی کہ پہلے شاید ہی کبھی کی ہو۔ تب میں نے سوچا کہ مجھے انور سے کہیں زیادہ اپنی بلی پیاری تھی۔ یوں میرا پہلا عشق انجام کو پہنچا۔ مگر کیا وہ عشق تھا؟ میں تو سمجھتی ہوں وہ صرف ایک انگڑائی تھی جو یونہی بے معنی طریقے سے آتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے۔

ویسے کئی بار ایسا بھی ہوا کہ راہ چلتے برقعے کی جالی میں سے میری نظر کسی ایسے نوجوان پر پڑی کہ مجھے یونانی دیوتاؤں کے مجسموں کی تصویریں یاد آگئیں اور میرا جی چاہا کہ میں لپک کر جاؤں اور اس کے سامنے کھڑی ہو جاؤں اور اسے چپ چاپ جی بھر کر دیکھوں اور اس کے چہرے کو آنکھوں کے رستے پی جاؤں، مگر پھر ایک اور چہرہ نظر آگیا جس میں اس سے زیادہ کشش تھی۔ پھر ایک اور چہرہ، پھر ایک اور چہرہ۔ مجھے اپنی حماقت پر ہنسی

آجاتی۔ آخر میں کس کس سے عشق کرتی پھروں گی۔ اور پھر ہر عشق کی میعاد ہی کتنی ہو گی۔ لاحول ولا قوۃ۔

کبھی کبھی میری سہیلیاں ایک دوسرے سے پوچھتی تھیں کہ آخر خدا انسان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا اور میں کہتی تھی کہ ابھی انسان نے انسان ہی کو کب سمجھا ہے کہ وہ خدا کو سمجھے۔ انسان کو تو اپنے اندر جذب بھی کر لو تو جب بھی کم ہی سمجھ میں آئے گا (میں سمجھتی تھی میں نے انور کو سمجھ لیا ہے مگر کیا سچ مچ میں نے اسے سمجھ لیا تھا؟) انسان جب اتنی پُراسرار چیز ہے تو ہمارے ہاں جانے کیسے جیمن کے ذرا سا اٹھتے ہی فریفتہ ہو جانے کا ڈھکوسلا چلتا رہا۔ دیکھنا تو انسان کی صرف ایک ہی حس ہے اور عشق کرنے کے لیے تو حواس خمسہ کو مستعد ہونا پڑتا ہو گا۔ جب تک دوسرے انسان کو دیکھنے کے علاوہ اسے سنا نہ جائے، اسے سونگھا نہ جائے، چھُوا نہ جائے، چکھا نہ جائے اس سے تعارف ہی کہاں مکمل ہوتا ہے۔ پھر جب تک اُسے برتا نہ جائے وہ کسی کی سمجھ میں خاک آئے گا۔

میں روبینہ کے بھائی کی شادی پر سیالکوٹ گئی تو بظاہر وہ خوب بنی ٹھنی بیٹھی تھی مگر بڑی اداس دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اُسے الگ لے جا کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کے ایک چچیرے بھائی کے ساتھ کل اُس کی منگنی طے ہو گئی ہے اور ــــ "اور بھائی جان ویسے تو بڑے ہینڈسم ہیں اور انگلینڈ سے بھی ہو آئے ہیں اور ان کے پاس جو شیورلے کار ہے اس پر سے اب تک لندن کا نمبر بھی نہیں اترا ہے مگر نگہت ـ مجھے ان سے محبت ہی نہیں ہو پاتی۔

میں کل سے ان کی تصویر جمپر میں چھپائے پھرتی ہوں۔ میں نے ان کی پلک پلک کو غور سے دیکھا ہے۔ وہ ناک نقشے کے تو بہت اچھے ہیں مگر ان کو دیکھ کر میرے اندر کچھ ہوتا ہی نہیں۔ میں نے ایک بار لاہور کے چڑیا گھر میں سائبیریا کا سفید ریچھ دیکھا تو وہ کمبخت مجھے کئی دنوں تک یاد آتا رہا اور ادھر بھائی جان ہیں کہ تصویر واپس جمپر میں رکھ لوں تو بھول جاتے ہیں۔ پھر مجھے کسی اور سے بھی محبت نہیں ہے۔ ایک بار محلّے کا ایک لڑکا مجھے ذرا سا اچھا لگا کئی دن تک میں اسے ایک نظر دیکھنے کے موقعے نکالتی رہی اور وہ مجھے اچھا ہی لگتا رہا۔ پھر ایک روز جب اس نے پہلی بار سیدھا میری طرف دیکھا اور مجھے اپنی طرف دیکھتا پایا تو کمینے نے مجھے آنکھ مار دی۔ ایسا لگا یکایک اس کا سارا لباس اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ وہ مجھے ایسا بُرا لگا جیسے کبھی اچھا لگا ہی نہیں تھا۔ تم اتنا بہت سا پڑھتی رہتی ہو، بتاؤ میں کیا کروں؟

میں نے اُسے مشورہ دیا، "تم یوں کرو کہ اپنے چچیرے بھائی جان سے شادی کر لو۔ اگر وہ سچ مچ کا اچھا آدمی ہوا تو سال آدھے سال میں تمہیں اس سے عشق ہو جائے گا۔ اگر بُرا ہوا تو یوں سمجھ لینا کہ تم بھی پاکستان کی ننانوے فیصد بیویوں میں سے ایک بیوی ہو۔ خدمت کرو اور اجرت لو۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔"

روبینہ مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے افلاطون کو اس کے شاگرد دیکھتے ہوں گے۔ میرے اس مشورے سے وہ بہت خوش نہیں ہوئیں، ذرا گڑگڑا گئے۔ واپس مل گیا ہے اور اسے اپنے منگیتر سے ہیں دو دسروں پر ہنستی تھی، اب اتنی لمبے

جا بیٹھے تو وہ چہکنے لگی، جیسے بھائیوں کی شادیوں پر بہنیں چہکتی ہیں۔

یہ رسم بھی عجیب ہے کہ شادی کے جمگھٹے میں پردہ نشین لڑکیاں غیر محرموں کے سامنے کسی قسم کی جھجک کے بغیر آجاتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ ٹھسے بوڑھے بھی اس پردہ دری کی کوئی خاص پرواہ نہیں کرتے۔ زیادہ سے زیادہ "دو اری لڑکیو، اد شرارت کی پوٹو" کہہ کر رہ جاتے ہیں۔ سو جب رد ملیہ اپنے بھائی کے سہرا باندھنے چلی اور ہم بہت سی لڑکیاں بھی اس کے ساتھ ہولیں تو میں نے دیکھا کہ جس کمرے کے وسط میں بھائی دولہا بنا بیٹھا تھا، وہاں اور بھی بہت سے نوجوان موجود تھے اور ——

—— اور ان میں سے ایک نوجوان بڑا عجیب سا نوجوان تھا۔ اس کا چہرہ ان چہروں میں شامل تھا جن کے بارے میں ہم سوچتے ہیں کہ یہ چہرہ زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے اور پھر یہ بھی سوچتے ہیں کہ یہ چہرہ ہم نے خوابوں میں ہزار بار دیکھا ہے۔ بڑا اجنبی سا۔ بڑا جانا پہچانا سا چہرہ!

میں نے اس قسم کے کتنے ہی چہرے دیکھے ہوں گے جو راہ چلتے دیکھنے والوں کو ٹھٹکا کر چھوڑ جاتے ہیں۔ مگر یہ چہرے پھر بھول بھی تو جاتے ہیں اور ایک یہ چہرہ تھا کہ واپس لاہور روانہ ہونے سے پہلے مجھے بار بار یاد آیا۔ جب برات واپس آئی اور ہم لڑکیاں کھڑکیوں میں سے اور چھتوں پر سے برات کا تماشا دیکھنے لگیں تو اس وقت بھی مجھے محسوس ہوا کہ میں اس ہجوم میں انگلینڈ سے بھی ہو آئے ہیں اور —۔ رات کا وقت تھا۔ بجلی کی روشنیوں میں سب تک لندن کا نمبر بھی نہیں اترا ہے مگر نگہند ہے تھے اور مجھے ہر نوجوان پر اسی کا گمان

ہوتا تھا۔ دوسرے روز ولیمہ میں مردوں عورتوں کا الگ الگ انتظام تھا اور شام سے پہلے میں لاہور واپس چلی آئی۔

جب میں ابّا اور امّی سے مل کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور کپڑے بدلنے کے لیے چٹکنی چڑھائی تو ایک دم وہ چہرہ میرے کمروں کی دیواروں میں سے کھڑکیوں میں سے، کتابوں میں سے، چھت میں سے اور فرش میں سے میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا نظر آیا۔ ایسا لگا جیسے وہ مجھ سے پہلے یہاں چلا آیا ہے اور میرے انتظار میں یہاں چھپ کر بیٹھ گیا ہے اور اب میں آئی ہوں تو ہر طرف سے پھوٹ نکلا ہے۔

میں سنگار میز کی طرف بڑھی کہ کم سے کم مجھے اپنا ہی چہرہ نظر آئے تو اس چہرے کا محاصرہ ختم ہو اور میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا بھی، مگر یہ چہرہ صرف ایک پل کے لیے میرا رہ سکا اس کے بعد میرا چہرہ بھی اس کے چہرے میں بدل گیا۔ اور میں ڈر کر ہٹ گئی اور مجھے رونا آگیا اور جب تک آئینے میں ایک بار پھر میں نے اس کا چہرہ نہ دیکھا، میں روتی ہی رہی۔

یوں مجھے باقاعدہ عشق ہو گیا۔ میں نے اُسے صرف ایک بار دیکھا تھا اور اگرچہ اس ایک بار میں بھی مسلسل دیکھا تھا مگر نہ تو میں نے اُسے بولتے سنا تھا نہ چلتے دیکھا تھا۔ اُسے چھونے یا برتنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ میں نے اپنا جی بہلانے کے لیے پرانی ناولیں اور داستانیں نکال لیں مگر انھوں نے مجھے رُلا رُلا دیا۔ ان کے بے معنی شعر میرے سینے میں خنجروں کی طرح گڑ گڑ گئے۔ میں جو دیکھتے ہی عشق ہو جانے کے سلسلے میں دوسروں پر ہنستی تھی، اب اتنی لمبے

بس تھی کہ اپنے آپ پر ہنس بھی نہیں سکتی تھی۔ جانے وہ کون تھا؟ اس کا نام کیا تھا؟ وہ کہاں سے آیا تھا؟ وہ کہاں چلا گیا؟ وہ اس وقت کیا کر رہا ہوگا؟ پڑھ رہا ہوگا؟ سو رہا ہوگا؟ سوچ رہا ہوگا؟ وہ کس رُخ سے بیٹھا ہوگا؟ دھوپ کس زاویے سے اس پر پڑ رہی ہوگی؟ ممکن ہے اب اس نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا ہو! ممکن ہے اب وہ انگڑائی لے کر چھت کو گھورنے لگا ہو! وہ جب چائے پیتا ہوگا تو کیسے لگتا ہوگا؟ بولتا ہوگا تو اس کے ہونٹ کیسے الگ ہوتے اور ملتے ہوں گے؟ کہیں اس وقت وہ کسی لڑکی کو چُوم نہ رہا ہو؟ اور کیا اس وقت میں اسے یاد آرہی ہوں؟ کیا میں اُسے یاد آسکتی ہوں؟ کیا اس نے میری طرف دیکھا بھی تھا؟ میں تیس چالیس لڑکیوں میں ایک لڑکی تھی تو کیا اس نے صرف میری طرف دیکھا تھا، مگر دیکھا بھی تھا کہ نہیں؟

روبینہ اپنی ماں کے ساتھ لاہور سے اپنا جہیز خریدنے آئی تو میرے ہاں ٹھہری۔ اس نے مجھے الگ لے جا کر پوچھا کہ تمھیں کیا روگ لگ گیا ہے؟ —"تمھاری آنکھیں پہلے بھی چمکتی تھیں اور اب بھی چمکتی ہیں مگر پہلے ان میں مسکراہٹ کی چمک تھی، اب آنسوؤں کی چمک ہے۔ ایسا کیوں ہے نگہت؟"

—اور میں نے اُسے صاف صاف بتا دیا کہ مجھے عشق ہوگیا ہے۔ پھر میں نے اُسے ساری تفصیل بتائی مگر وہ میری کوئی مدد نہ کر سکی۔ میری طرح وہ بھی پردہ کرتی تھی۔ اس روز اس نے بھی پہلی بار اتنے بہت سے لڑکے دیکھے تھے اور ان میں اس کے رشتے دار بھی تھے اور اس کے بھائی کے بہت سے دوست بھی تھے اور گلی محلّے کے بھی بہت سے نوجوان تھے۔ نام مجھے معلوم

نہیں تھا اور جب میں نے اپنے تئیں اسے اپنے محبوب کی سب سے بڑی نشانی بتائی کہ وہ بے حد و حساب، شدید حد تک، ناقابل یقین حد تک خوبصورت تھا تو روبینہ ہنسنے لگی اور بولی "اری کہیں تم میرے چچیرے بھائی جان صاحب پر تو نہیں مر مٹیں۔ اس وقت تو میری نظر میں دنیا کا خوبصورت ترین نوجوان وہی ہے!" —— اس نے تو مجھے صرف چھیڑا تھا مگر میں بری طرح چونکی۔ پھر اس نے پرس میں سے اپنے منگیتر کی تصویر نکال کر مجھے دکھائی اور اب مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا "نہیں بی بی۔ نہ تو اس کا چہرہ اتنا لمبوترا تھا اور نہ اس کی آنکھیں اتنی گول تھیں اور نہ اس کے ہونٹ اس زنانہ حد تک پتلے تھے"۔ جل کر روبینہ نے مجھ سے تصویر چھین لی اور اس کے سیالکوٹ جانے کے بعد بھی میں سوچتی رہی کہ روبینہ اتنی بد ذوق کب سے ہو گئی ہے؟ آخر اس کے چچیرے بھائی کے چہرے میں ایسی خصوصیت ہی کون سی ہے کہ اس سے عشق کیا جا سکے۔ کسی بنک میں چلے جاؤ تو وہاں اس صورت کے ایک سو کلرک بیٹھے مل جائیں گے تو کیا تم بیک وقت سب پر فدا ہو جاؤ گی؟

کبھی کبھی سکون کے کسی لمحے میں، خوب سو لینے یا خوب کھا لینے کے بعد میں سوچتی تھی کہ آخر یہ کیا حماقت ہے۔ نام پتا کچھ بھی معلوم نہیں۔ یہ تک یقین نہیں کہ اس نے بھی ایک نظر مجھے دیکھا ہو گا۔ پھر بھی سڑکوں پر، بازاروں میں، فلم کے پردے تک پر مجھے اسی چہرے کی جستجو رہتی ہے! یہ تو صاف پاگل پن ہے۔ مگر میں اتنی پاگل نہ ہوتی تو اب تک کتنی بے وقوف، کتنی بدھو سی لڑکی ہوتی!

ایک روز گھر میں کچھ مہمان آئے۔ دن بھر کھسر پھسر کی سی فضا قائم رہی اور شام کو امّی نے میرے کمرے میں آکر مجھے بتایا کہ میری منگنی ہو گئی ہے اور لڑکا لائل پور کا رہنے والا ہے اور وہیں کسی مل میں دو ہزار ماہانہ کماتا ہے اور نام سرفراز ہے۔

مجھے عرصے سے معلوم تھا کہ میرے ساتھ یہی ہو گا۔ عام حالات میں مجھے اپنے والدین کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا مگر ان خاص حالات میں مجھے شدید اعتراض تھا۔ البتہ مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس اعتراض کا اظہار کر سکتی۔ میں رونے لگی اور امّی ہنستی ہوئی واپس چلی گئیں کہ نگہت نے وہی حرکت کی جو انھوں نے اپنی منگنی کا سُن کے کی تھی۔ اس پر میں نے ابّا کی بھی ہنسی کی آواز سُنی۔ یوں میرے آنسوؤں نے میری منگنی طے کر دی۔

میں اب تک صرف محبت کرتی آئی تھی مگر اس روز پہلی بار میں نے نفرت کا ذائقہ چکھا۔ مجھے لائل پور سے، دو ہزار کی آمدنی سے، سرفراز کے نام سے نفرت ہو گئی۔ ایک بار تو میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مجھے امّی اور ابّا سے بھی نفرت ہو گئی ہے مگر پھر جب امّی بڑے چاؤ سے میرا جہیز جمع کرتی نظر آئیں اور ابّا مجھے دیکھتے ہی میری جدائی کے تصوّر سے پیلے پڑ گئے تو مجھے ان کی معصومیت پر پیار آ گیا۔ بھلا ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ میں کس سے محبت کرتی ہوں۔ ماں باپ کے دل میں تو صرف عزّت ہوتی ہے نا۔ اور پھر خود مجھے بھی تو معلوم نہیں کہ میں کس سے محبّت کرتی ہوں۔

اور نہ جانے یہ سرفراز صاحب کیسی مخلوق ہوں گے۔ بھلا یہ سرفراز بھی کوئی

نام ہے۔ جب لوگ سربفلک اور سربرآوردہ قسم کے نام نہیں رکھتے تو سرفراز کو
کیسے قبول کر لیا گیا ہے! اور یہ سرفراز صاحب لائل پور کے قصبے میں بیٹھے کیا کر
رہے ہیں؟ لاہور کیوں نہیں آتے یا کراچی کیوں نہیں چلے جاتے؟ خاصے
بدذوق معلوم ہوتے ہیں کہ کچھ دیکھے سنے بغیر شادی پر رضامند ہو گئے، یا
ممکن ہے، سنا ہو کہ میرے ابا نے گلبرگ میں دو بنگلے بنوا لیے ہیں اور منٹگمری
میں ان کے مالٹے اور کنّو کے باغ ہیں اور انھوں نے اپنی بڑی بیٹی کے
جہیز میں دو لاکھ روپے کا چیک بھی دیا تھا اور وہ اپنی بیٹی کو سخت پردے
میں رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی بیٹی نے اب تک کسی سے کیا محبّت کی
ہو گی!

ان سرفراز صاحب پر کبھی تو مجھے رحم آتا کہ ممکن ہے میری طرح ماں
باپ کی سعادت مند اولاد ہوں اور ان کا غرور قائم رکھنے کے لیے مجھ
سے شادی پر رضامند ہو گئے ہوں! کبھی غصّہ آتا کہ ممکن ہے میری بجائے
ایک بڑے باپ کی بیٹی کو بیاہنے تشریف لا رہے ہوں کیونکہ آج کل
بعض شوہر اپنی بیویوں ہی سے تو پہچانے جاتے ہیں۔ اور ان کی یہ سازش
کس بُری طرح خاک میں مل جائے گی جب میں انھیں بتاؤں گی کہ میں تو
کسی اور سے محبت کرتی ہوں! اس سے جس کا مجھے نام بھی معلوم نہیں
اور جانے زندہ ہے کہ مر چکا ہے۔ ہائے میں مر جاؤں۔ میں یہ کیا بک دی۔
جب مجھے مایوں بٹھایا گیا تو ایک بار میں نے سوچا کہ موقع اچھا ہے
اس وقت خودکشی کر لینی چاہیے۔ پھر میں نے دیکھا کہ مہندی کی خوشبو سے

بسی ہوئی لاش پر جھکی ہوئی عورتیں جیسے کسی کو راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹ گئیں اور وہ لپکا چلا آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا اور اس کے چہرے پر زردی کے سوا کوئی رنگ نہ تھا اور اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور وہ مجھ پر جھکا ہوا پوچھ رہا تھا ”بس اتنا ہی حوصلہ تھا؟ بس اتنی ہی دوستی تھی؟“

سو میں نے یہ سوچ کر مرنے سے انکار کر دیا کہ ایک انسان اپنی زندگی میں کوئی ایک لاکھ انسانوں کا راستہ تو ضرور کاٹتا ہو گا۔ پھر کیا عجب کہ ان لاکھ چہروں میں مجھے وہ چہرہ نظر آ جائے جو میرے حواس پر کھُد کر رہ گیا تھا۔

جب برات رخصت ہونے لگی اور مجھے تھام کر ایک پھولوں لدی کار تک لے جایا گیا تو میں نے کنکھیوں سے اِدھر اُدھر براتیوں کے چہرے ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر اوپر بادامی رنگ کا برقع تھا اور نیچے سُرخ رنگ کا گھونگھٹ تھا اس لیے مجھے صرف ایک رنگین غبار سا نظر آیا جیسے میں آنکھیں بند کر کے سورج کی طرف گھوم گئی ہوں اور دھوپ میرے پپوٹوں کا خون بن گئی ہے۔

مجھے جب کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا اور دو عورتیں میرے دائیں بائیں ٹھنس کر بیٹھ گئیں تو کچھ دیر کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ کار کے اندر کچھ تشویش کی فضا ہے۔ پھر میں نے کار کے آس پاس بڑی محتاط سرگوشیاں سنیں اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ رسم کے مطابق تو دولہا کو اس کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھنا تھا مگر وہ کسی کی مانتا ہی نہیں۔ کہتا ہے میں اپنے دوستوں میں بیٹھوں گا۔

"دلہن کیا کہے گی!" میرے ایک طرف بیٹھی ہوئی عورت نے جو بعد میں میری بڑی نند نکلی، بہت مہین سرگوشی میں کسی سے پوچھا۔

اور میں نے دل میں کہا۔ "دلہن خدا کا شکر بجا لائے گی اور کیا کہے گی۔"

پھر کار چل پڑی اور میں نے سوچا کہ اگر میں نے خودکشی کر لی ہوتی تو جس طرح اس وقت میری برات جا رہی ہے، اسی طرح اس وقت میرا جنازہ جا رہا ہوتا، اور اسے، جو اتنا کافر چہرہ لیے میرے سامنے آیا تھا، پتا بھی نہ چلتا کہ میں نے اس کے لیے جان دے دی۔ مگر اسے اب بھی کیسے پتا چلے گا کہ میں نے اس کے انتظار میں زندہ رہنے کی سزا قبول کر لی ہے۔ اور اگر کبھی وہ مجھے دکھائی بھی دے گیا تو میں اسے کیسے بتا سکوں گی کہ میں نے اس کے لیے کیا کچھ محسوس کیا ہے اور اگر میں نے کسی طرح کہہ بھی دیا اور میری حماقت کا قصہ سن کر اس کی ہنسی نکل گئی تو پھر کیا ہوگا۔

"پھر کیا ہوگا؟" میں کچھ ایسی کھو گئی تھی کہ اپنے آپ سے پوچھ بیٹھی۔

اور میری نند ہنس پڑی۔ "کیا ہونا ہے میری جان۔" اس نے کہا: "سونے میں لدی ہو، پھولوں میں تلو گی۔ اور کیا ہوگا ـــــ" پھر اس نے میرے دوسرے پہلو میں بیٹھی ہوئی عورت سے کہا۔ "قربان جاؤں قدرت کے۔ دنیا کی ہر دلہن کے دل میں شادی کے پہلے دن یہی سوال پیدا ہوتا ہے۔"

میں وہ کرب کبھی نہیں بھولوں گی جو میں نے لائل پور کے ایک بنگلے کے صحرا کے سے کھلے کمرے کی تنہائی میں محسوس کیا۔ میں نے سوچا، میں تو خیر خودکشی نہ کر سکی مگر آج میری محبت کی خودکشی کی رات آ گئی ہے۔ ہائے یہ کتنا

بے معنی مگر کتنا پیارا جذبہ تھا۔ اس کے چہرے کے تصور میں میری نسیں کس کس طرح کھنچی ہیں، میرا گلا کیسے کیسے رندھا ہے اور جب میں اپنی بے بسی کے دُکھ سے رو دی ہوں تو میں نے کیسی نشے کی سی کیفیت محسوس کی ہے جیسے میں خدا کے حضور کھڑی ہوں اور اس سے ڈر بھی رہی ہوں اور اسے پوچ بھی رہی ہوں۔ جب مجاہد راہِ خدا میں لڑتے ہوئے زخمی ہو جاتے ہوں گے تو موت کو قریب آتا دیکھ کر ان کو اسی طرح سرشار کر دینے والے درد کا لطف آتا ہوگا۔ تو کیا میں جس لطیف جنون میں مبتلا رہی ہوں، وہ آج رات ختم ہو جائے گا اور کیا وہ چہرہ اس کے بعد بھی تصور میں آ سکے گا؟ اور اگر آیا تو کیا میں اس سے آنکھیں چار کر سکوں گی؟ میں کتنی شرمناک حد تک بے وفا ہوں! کیا میں اس شادی سے انکار نہیں کر سکتی تھی؟ یہی ہوتا نا کہ امّی اور ابّا مجھ پر برستے اور مجھے واسطے دیتے اور کچھ روتے اور کچھ طیش میں آتے مگر پھر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جاتا۔ اور میں انتظار کرتی رہتی۔ کیا میں اتنی کم ظرف ہوں کہ ایک برس یا دس برس یا پچاس برس تک بھی مجھے اس کی راہ تکتے رہنے کا حوصلہ نہ تھا؟ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ مجھے زندگی میں پہلی بار خیال آیا کہ میں بد چلن ہوں! بے وفائی سے بڑی بد چلنی اور کیا ہو سکتی ہے؟

پھر میں نے سنا کہ آہستہ سے دروازہ کھلا ہے، آہستہ سے چٹکنی لگی ہے اور ذرا سے وقفے کے بعد کوئی آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے کے اُس طرف چلا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ سرفراز صاحب تھے۔ بے چارے جی میں برکے

خوش ہوں گے کہ خوب میدان مارا ہے۔ مگر انھیں کیا پتا کہ میں اپنا دل مر کر بھی ان کے حوالے نہیں کروں گی۔ دلوں کے سودے یوں آسانی سے تو نہیں ہو جاتے کہ نکاح کر لیا اور محبت ہو گئی۔ مگر سرفراز صاحب اس طرف کیوں نہیں آتے؟ اتنی دیر گذر گئی ہے اور وہ کہیں اُدھر ہی جم کر رہ گئے ہیں؟ آخر یہ صاحب بار بار میری ہتک پر کیوں تل گئے ہیں؟ پہلے انھوں نے دلہن کی کار میں بیٹھنا گوارا نہ کیا اور پھر سے مجمع کو یہ تاثر دیا کہ انھیں دلہن کی کچھ ایسی پروا نہیں ہے۔ اب وہ یہاں آئے ہیں تو رسم کے مطابق مجھے "منہ دکھائی" کا کوئی تحفہ کیوں نہیں دیتے۔ وہ تو مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں آج ہی انھیں سب کچھ بتا دوں۔

بڑی احتیاط سے کہ کوئی آواز پیدا نہ ہو۔ میں نے اپنے لمبے گھونگھٹ میں سے اس طرف دیکھا جہاں پہنچ کر سرفراز صاحب کے قدموں کی آواز رک گئی تھی۔ گھونگھٹ میں سے مجھے صرف یہ نظر آیا کہ وہ دیوار سے لگی ہوئی ایک میز کے سامنے کرسی پر بیٹھے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کچھ لکھ رہے ہیں روشنی کے پس منظر میں مجھے ان کا صرف سلہوٹ نظر آیا، مگر آخر انھیں شادی کی پہلی رات کو لکھنے کی کیا سوجھی! کہیں وہ شاعر تو نہیں ہیں! ہائے کہیں وہ شاعر نکلے تو پھر کیا ہوگا۔ شاعر تو سنا ہے بڑے آوارہ اور ترسے جذباتی ہوتے ہیں اور ان کا دل ان کے سینے کی بجائے ان کی ہتھیلی پر رکھا رہتا ہے۔ وہ بے چارے اس دنیا کے آدمی تو ہوتے ہی نہیں۔ مگر وہ جو بھی مخلوق ہیں، سامنے تو آئیں۔ کیا میں اتنی ہی بے حقیقت ہوں؟ میں خود

ان سے کیوں نہ پوچھ لوں کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟

مگر اچانک وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور میں پلٹ کر اور سر جھکا کر بیٹھ گئی اتنی وحشت سے میرا دل اس وقت بھی نہیں دھڑکا تھا، جب میں نے اپنے میکے کے گھر کی دہلیز پر سے آخری قدم اٹھایا تھا۔ یا جب ابھی ابھی سرفراز صاحب نے آہستہ سے دروازہ کھول کر چٹکنی لگائی تھی۔ وہ اسی رفتار سے، جس رفتار سے وہ دروازے سے میز تک گئے تھے، میری طرف آ رہے تھے۔ ان کے ایک قدم اٹھانے کے بعد دوسرا قدم رکھنے تک مجھ پر پوری صدی گزر جاتی تھی۔ پھر وہ میرے قریب آ کر رکے اور بس رکے رہ گئے اور تب مجھے ایسا لگا کہ میرا خون میری کنپٹیوں کو پھاڑ کر فوارے کی طرح بہنے لگے گا۔

پھر انھوں نے ایک کاغذ میرے سامنے رکھ دیا اور بہت آہستہ سے بولے "اسے پڑھ لیجیے"۔ یہ کہہ کر وہ اسی رفتار سے واپس چلے گئے۔

جب ان کے قدموں کی چاپ رک گئی تو میں نے وہ کاغذ اٹھایا۔ روشنی ویسے ہی مدھم تھی اور اوپر سے گھونگھٹ کا سایہ تھا، اس لیے میں نے میز کی طرف پیٹھ کر کے گھونگھٹ الٹ دیا اور پڑھنے لگی:

نگہت صاحبہ! آج سے مذہب، قانون اور معاشرے کے اصولوں کے مطابق آپ میری بیوی ہیں، مگر میں چاہتا ہوں کہ ہماری زندگی کا آغاز بددیانتی سے نہ ہو۔ میں آپ کے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے محبت

نہیں کرتا۔ والدین کے مجبور کرنے پر میں نے آپ سے شادی کی ہے ورنہ بیوی کی حیثیت سے میرا سب کچھ آپ کا ہے، مگر میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میں آپ کو ایک چیز مر کر بھی نہیں دے سکوں گا اور وہ میرا دل ہے۔ مرد ہو کر بھی مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ میں آپ کے سامنے اپنی زبان سے یہ اعتراف کر لیتا۔ مجبوراً قلم کا سہارا لینا پڑتا ہے آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا مناسب سمجھیں تو ممکن ہے زبانی بات کرنے میں آپ کو بھی میری طرح جھجک محسوس ہو، اس لیے میز کی طرف تشریف لے آئیے۔ آپ پلنگ پر سے اٹھیں گی تو میں ادھر دروازے کی طرف چلا جاؤں گا۔

سرفراز

شدید ہتک کے احساس کے ساتھ ہی مجھے شدید مسرت کا بھی احساس ہوا کہ میں خالی ہاتھ نہیں ہوں۔ جو پتھر سرفراز صاحب نے میرے دل پر مارا ہے ویسا ہی پتھر میری مٹھی میں بھی ہے اور میرا نشانہ بھی خطا نہیں جائے گا۔ والدین کی ساری تربیت اور رخصت ہونے سے پہلے امی کی ساری نصیحتیں بھول کر میں تیزی سے اٹھی تو سرفراز صاحب میز چھوڑ کر ایک طرف چلے اور میں یہ سوچے بغیر کہ میری آواز آس پاس کے کمروں میں بھی گونج جائے گی، پکاری "نہیں، سرفراز صاحب۔ وہیں ٹھہریئے۔ لڑکی ہو کر بھی مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ میں سچی بات آپ کے منہ پر اور آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکوں۔" میں ننگے پاؤں سرفراز صاحب کی طرف بڑھی "آپ کو تو مجھ سے صرف محبت نہیں تب نا سرفراز صاحب

مگر مجھے تو آپ سے نفرت ہے۔ مجھے دنیا میں صرف ایک شخص سے محبت ہے اور وہ آپ نہیں ہیں۔ سمجھے آپ؟"

پھر لمحہ بھر کے لیے میرا دل جیسے رُک گیا اور میرا خون جیسے جم گیا اور میرے چاروں طرف برف کے گالے سے تیرنے لگے اور میں گرنے لگی۔ میں کہیں نیچے ہی گرتی چلی گئی۔ تب میں نے گھبرا کر سرفراز صاحب کا سہارا لینا چاہا مگر وہ تو مجھ پر جیسے جھپٹ پڑے۔ مجھے اپنی باہوں میں جکڑے ہوئے وہ میرا چہرہ ٹیبل لیمپ کے نیچے لے آئے اور پھر وہ مجھے چومنے لگے۔ میرے چہرے سے اپنا چہرہ رگڑنے لگے۔ اس وقت وہ رو بھی رہے تھے اور مسکرا بھی رہے تھے اور کہتے جاتے تھے "تم تو وہی ہو نگہت، مگر تم نگہت کب سے ہو گئیں تمہارا تو کوئی نام نہ تھا! تمہارا کوئی نام نہیں ہونا چاہیے!"

اور اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ چہرہ ذرا سا بھی تو نہیں بدلا تھا، ذرا سا بھی تو نہیں! وہی اجنبی سا، وہی جانا پہچانا سا چہرہ! فرق صرف یہ تھا کہ اس کا ایک نام تھا۔

فنون:

الطاف فاطمہ

اعتراف

بڈھی جمعدارنی نے جب کام چھوڑا اور اپنے پنڈ واپس چلی گئی تو صلّو نے غور ہی نہ کیا کہ اس کی جگہ کام کس نے سنبھالا۔

اس کو تو اس کے جانے کی بھی خبر نہ ہوئی تھی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ جب سارے دن بچّوں کے پھاڑے ہوئے کاغذ اور پھل ترکاری کے چھلکوں کے علاوہ برآمدے میں جگہ جگہ دھبّے نظر آتے رہے تھے تو شام کو امّی جان چیخ پڑی تھیں۔ "دو دن ہو گئے اور دوسرا مہتر نصیب نہ ہوا۔"

فلش والے گھروں میں بھی تو ہوتا ہے کہ جمعدار کا چلا جانا اس طرح نہیں کھلتا کہ اس کے جاتے ہی آپا دھاپی پڑ جائے۔ اور کچھ نہیں تو کوئی سڑک جھاڑتا جمعدار پکڑ بلایا جائے، مگر اب یہ دوسرا دن شروع ہو گیا تھا اور مہتر کی ضرورت تو فلش والے گھروں میں بھی باقی ہی رہتی ہے۔

ہر طرف کی بھنکار کا سارا غصّہ امّی جان نے لال شاہ پر اتارا جس کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ بن کہے مہتر کا انتظام کرتا۔ تب ان کی چیخیں سن کر لال شاہ بیڑی کی سنک میں دم لگے برتن چھوڑ کر منہ پھلائے مہتر کی تلاش میں نکل گیا۔

مگر صلّو کو پتہ نہ چل سکا تھا کہ بڈھی جمعدارنی کی جگہ کس نے پُر کی تھی اور

بڈھی جمعدارنی کی بات اور تھی، کئی برسوں سے وہ دونوں وقت گھر کے کونے کونے میں گھومتی پھرتی نظر آتی تھی اور صلّو کی ذات سے اُسے خاص دلچسپی تھی۔ بند لٹکنا، اُجلی اُجلی قمیص پہنے کف کھلے اس کو گڈیوں کے پیچھے لپکتے دیکھ کر ہنس ہنس کر کہتی "آ گیا میرا دولہا"۔ وہ اس سے شادی کرنے کی دھمکیاں کئی سال سے دیتی چلی آئی تھی۔ اتنی کہ وہ اس سے شرمانے لگا تھا۔

اور جب سے صلّو اپنا پورا قد نکال کر کالج میں داخل ہوا تھا تو اس نے یہ دھمکی دینا بند کر دی تھی اور اس کو دیکھتے ہی یوں کہا کرتی تھی "بیٹی جی! میں صلّو میاں کے بیاہ پر ریشمی جوڑا لوں گی۔"

صلّو کی گردن لٹک جاتی تھی۔ پر بدستور اپنے کاموں میں لگا رہتا تھا۔

ظاہر ہے کہ جب وہ چلی گئی تو صلّو کو اس کی جگہ آنے نہ آنے والے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ پھر جب اس دن اس نے امّی جان سے کہا تھا کہ کوئی جمعدار نہیں ملا تھا تو لال شاہ سے کہ کر ہی کمرہ صاف کروا دیتیں تو امّی جان اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے نئی جمعدارنی کو غائبانہ ڈانٹنے لگی۔ "تو یہ ہے لڑکے کا کمرہ ہر روز چھوڑ جاتی ہے۔ نا بھئی اس سے میر گذر ہرگز نہیں ہونے کا۔ اور بھئی میں کدھر کدھر جاؤں اتنا بڑا تو گھر ہے۔"

وہ سب کچھ بھول کر اپنی ذمہ داریوں کا ذکر کرنے لگیں اور صلّو کے کمرے کی صفائی کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ البتہ دوسرے دن کالج سے واپسی پر اسے احساس ہوا کہ کمرہ صاف ستھرا ہو گیا ہے۔ پھر اتوار والے دن جب وہ امّی جان کے پاس تخت کی پٹ پر لٹکائے بیٹھا دس روپے کی ضد کر رہا تھا تو اچانک

ہی سر سر کرتی جھاڑو اس کی ٹانگوں میں لگی۔ اور وہ جھنجھلا کر بولا۔ "مائی تجھے دکھائی نہیں دیتا ہٹ کر بیٹھ۔"

امی جان ہنس پڑیں "کیسا باؤلا لڑکا ہے! ارے یہ مائی ہے تیرے نزدیک؟"

وہ جھلا گیا۔ ایک تو روپے نہیں دے رہی تھیں اور اب بیٹھی اس کا مذاق اڑا رہی ہیں۔ اس نے پھر بھی نہ دیکھا کہ وہ مائی نہیں تو پھر کیا تھی۔

جھاڑو وہیں اس کے پیروں میں ڈال لپک کر وہ کمرے میں گھس گئی جہاں سلمیٰ بیٹھی ہوم ورک کر رہی تھی "بی بی جی! اس نے کچھ اس انداز میں سرگوشیاں کیں کہ پوری بات صاف صاف سنائی دے رہی تھی۔ صلّو صاحب تو جھلا گیا ہے۔" پھر بھی کہہ کے ہنسی روکنے کی کوشش میں وہ فرش پر لوٹ گئی۔

"ارے ہٹ کر بیٹھ!" سلمیٰ نے دھیمی انداز میں اس طرح کہا کہ امی جان سن لیں اور پھر بڑے اشتیاق سے بھائی جان کے جھلے پن کی بات سننے کے لیے اس طرف متوجہ ہو گئی۔

"میں بولا کر دینیدی بئی سی۔" پھر رک کے ہنسی کا ایک تازہ فوارہ اس کے منہ سے نکل کر بکھر گیا "کیندا اے، مائی تجھے دکھائی نہیں دیتا۔"

سلمیٰ بھی ہنس پڑی اور صلّو کو غصہ آنے لگا۔ ایسی کیا بات ہو گئی ——— توبہ! اور بنتے کتنے عقلمند ہیں۔

سلمیٰ کو دو دھولیں لگانے کے خیال سے وہ تنتنایا ہوا اندر گیا تو اس کو دفعتی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

نئی جمعدارنی تو ایک ذرا سی چھوکری تھی جھلسے ہوئے رنگ کے منہ پر سے

سے چہرے والی جس کا دہانہ قابلِ غور حد تک بڑا اور پھیلا ہوا تھا۔ چوڑے چوڑے دانتوں والی بتیسی ایک اشارے میں کچھ اس طرح باہر آجاتی کہ نچلے ہونٹ پر چھپر سا چھا جاتا۔ ہنستے میں اس کے دونوں رخساروں میں چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑجاتے تھے۔ وہ دبلی پتلی اور بے حد چھچھوری سی لڑکی تھی۔

اور اب اگر اس کے سامنے وہ سلمیٰ کو دھوپ میں لگاتا تو حسبِ عادت وہ اس سے زبان چلاتی اور اس چھچھوری سی لڑکی کے سامنے اس کی بے عزتی ہوتی۔ جو پہلے ہی اس کو دیہلے کے لقب سے یاد کر چکی تھی۔ اور اب تو دراصل اس کو غصّہ خود اپنے آپ پر آرہا تھا کہ اس کو اتنی ذرا سی بات کا بھی نہ پتہ چل سکی تھی۔ اصل میں اس کا اپنا کچھ ایسا قصور نہ تھا۔ یہ تو اس کی عمر کی اس منزل کا قصور تھا۔ جب لڑکے ماں کے سوا دنیا کی ہر دوسری عورت کو دیکھ کر سٹ پٹا جاتے ہیں اور خالاؤں، پھوپھیوں تک کے سامنے آتے ہیں تو ان کی گردن آپ سے آپ لٹک جاتی ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی وہ سٹ پٹا کر باہر نکل گیا۔

اسے کالج جانے کی دیر ہو رہی تھی اور جوتوں پر پالش نہیں ہوتی تھی۔ وہ خود اپنے جوتوں پر پالش کر لیتا، یہ تصوّر اس کے ذہن میں موجود ہی نہ تھا۔ نہ اسے کسی کام کا ڈھب تھا۔ گھڑے سے ایک گلاس پانی لیتا تو وہ گلاس چھلکا دیتا۔ بس اس کو تو اچھی جان کو بوکھلانا آتا تھا۔

"اری چھوڑ دے جھاڑو۔ انھوں نے زرینہ کو بوکھلایا۔ ذرا اس کے جوتوں پر پالش کر دے۔"

اور وہ بیچ برآمدے میں جھاڑو ڈال کر پالش کرنے بیٹھ گئی۔ وہ بھسکڑا مارے بیٹھی پالش کر رہی تھی۔ جوتے، پالش کی ڈبیا اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھے تھے۔ ایک جوتا اس نے اپنے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا اور بڑی محنت اور مشاقی سے برش چلا رہی تھی۔

"شیشے کے مافک چمکا دیاں گی" اس نے نہ جانے کس سے کہا اور پھر تھک تھک کر کے جوتے پر تھوکا اور رگڑنا شروع کیا۔ "بی بی جی، تھوک نال جوتا ڈاڈا چمک جاندا اے" یہ اس کی مجبوری تھی اور اب جو اس کا برش چلا تو رکنے کا نام ہی نہ لیا۔ وہ ایک دھن کے ساتھ جوتے کو چمکائے چلی جا رہی تھی۔

"کم بخت پاگلوں کی طرح جوتے کی جان کو آ گئی۔ اب دے چک مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

اس نے جوتا بے نیازی سے صلّو کے آگے ڈال دیا اور پھر جلدی جلدی اپنی مخصوص سنائی دینے والی سرگوشی میں بولی "بی بی جی! آج معلوم پڑ گیا، صلّو صاحب بھی ٹیڈی صاحب اے۔ اک دم ٹیڈی!"

"کیوں کیسے؟" سلمیٰ کو بھی اسکول جانے کی جلدی ہو رہی تھی۔

"جوتا دیکھو، کتنا نوکدار اے، بالکل ٹیڈی جوتا اے۔"

صلّو نے گھوم کر اس سنائی دینے والی سرگوشی کو سنا اور پھر ایک نظر اپنے جوتے کو دیکھا جو آئینے کے موافق چمک رہا تھا۔ جیب سے دوّنی نکال کر اس نے زرینہ کے سامنے ڈالی اور سائیکل لے کر روانہ ہو گیا۔

"بڈی صاحب دا گھڑی والا ہاتھ کتنا شاندار معلوم ہوندا اے" اس کی کالی کالی آنکھیں چم چما رہی تھیں - اور دانتوں کا چھپرا گلے ہونٹ پر آکر رک گیا تھا۔ وہ جتنی گیگلی اور بے ساختہ تھی کام کے معاملے میں اتنی ہی چلتی ہوئی۔ سامنے سامنے کی خوب صفائی کرتی تھی۔ بیگم صاحب والے برآمدے میں "ٹاکی" لگا تے میں اوندھا اوندھ جاتی تھی اور فرش شیشے کی طرح چمکنے لگتے لیکن اِدھر اُدھر کونوں کھدروں میں کوڑا چھپا جاتی۔ سب سے زیادہ ناقابلِ اعتنا اس کے نزدیک صلّو کا کمرہ تھا اس لیے کہ بیگم صاحب ادھر کبھی جاتی ہی نہ تھیں۔

صلّو کا شمار ان مردوں میں تو کیا نہیں جا سکتا جو کمر بند نہ ملنے پر پیجامے میں ٹائی ڈال کر بڑے اطمینان سے گھومتے رہتے ہیں اور اچھی خاصی اُجلی قمیصوں سے جوتے پونچھ کر راز فاش ہونے کے ڈر سے ان کے گولے بنا کر پلنگوں کے نیچے ٹھونس دیتے ہیں - اور کپڑے کا کونہ پکڑ کر کھینچ لینا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ وہ تو اچھا خاصا سلیقہ مند لڑکا تھا۔ پھر بھی مرد کی ذات آخر کتنا سلیقہ کر سکتی ہے۔ چنانچہ صلّو کو بہت دن تک احساس ہی نہ ہوا کہ کمرہ سخت بے ترتیب ہونے کے علاوہ گرد آلود بھی ہو رہا ہے اور کونوں کھدروں میں کوڑا کم ہونے کے بجائے بڑھتا جا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اکثر فرش پر کاغذوں کی کترنیں اور رنگ برنگ کپڑوں کی چندیاں بھی بکھری ہوتی ہیں۔

لیکن اس روز امتحانوں سے چند روز پہلے وہ خلافِ معمول جلد گھر واپس آیا تو اس نے زرینہ کو اپنے کمرے میں پایا۔ وہ بڑے اطمینان سے

پاؤں پسارے فرش پر بیٹھی تھی جھاڑو اس کے پہلو میں پڑی تھی اور وہ کاغذ کی پھول پتیاں کاٹنے میں منہمک تھی۔ اب جو غور سے دیکھا تو اس کا خون کھول گیا۔ اتنی نازک اور نفیس قینچی جو اس کے ایک قلمی دوست نے کینیڈا سے تحفتاً بھیجی تھی۔ زرینہ کے ہاتھ میں تھی۔

کیمسٹری کے پریکٹیکل کی لمبی اور سخت کاپی پورے زور سے اس کے سر پر پڑی۔ "بدذات۔ صفائی کرنے کے بجائے اور کوڑا کر رہی ہے۔ چل اُٹھ، سمیٹ یہ سب گند۔ اور اب اگر میری قینچی یا کوئی بھی چیز چھوئی تو یاد رکھ، ہاں!" اُس نے اپنا الیکٹرک شیور اُٹھا کر اسے دکھایا۔ "اسی سے تیرا سر مونڈھ دوں گا۔ یوں سر سر بال گریں گے۔" اس نے انگلی کے اشارے سے بتایا۔

کالے سیاہ چہرے پر جمی ہوئی گرد پر بہتے ہوئے آنسوؤں سے کیچڑ سی اس کے چہرے پر بہہ نکلی۔ اور وہ آواز نکالے بغیر روتی رہی۔ اور ایک دم ہی صلّو اپنی نازیبا حرکت پر سٹ پٹا گیا۔ اس کو ہمیشہ سے لڑکیوں پر ہاتھ اٹھانے کو منع کیا جاتا رہا ہے اور وہ تھا کہ ...... خیر اب تو ہاتھ اُٹھ ہی چکا تھا۔

اس نے جیب میں سے چونی نکالی۔ "اچھا، چل چپ کر یہ لے۔ اس کی آئس کریم کھا لینا اور جلدی جلدی میرا کمرہ صاف کر دے، میرے دوست آ رہے ہیں پھر میں اور پیسے دوں گا۔"

فوراً زرینہ کے آنسو خشک ہو گئے اور جھاڑو لے کر وہ صفائی پر پل پڑی۔

گرد سے اکتا کر صلّو باہر نکل گیا۔ ابھی اس کو کئی اور کام کرنا تھے۔

پڑھائی کرتے کرتے جب لڑکے تھک کر چور ہو چکے تھے تو انھوں نے یہ

طے کیا تھا کہ یار پھر ہو جائے تا ایک کوک ٹیل پارٹی ساتھ میں ٹوسٹ بھی رہے۔
اور واقعی راتوں اور دنوں کو بیٹھ بیٹھ کر پڑھ پڑھ کر صلّو کا ایک ایک جوڑ بند ھ کر رہ گیا تھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ اتنے زور کی ایک انگڑائی لو کہ سارا وجود اِدھر کا اُدھر ہو جائے۔ اور ایسے میں یہ ٹوسٹ بھی کیا بُرا رہے گا۔ یہ بھی تو تھکے دل اور بیزاری ہی کی ایک زوردار انگڑائی تھی اور اس کام کے لیے صلّو کا کمرہ ہی قرار پایا تھا۔ یہاں اس کے گھر میں ذرا ایسی باتوں پر اعتراض کم کیا جاتا تھا اور ہوتا بھی تو بہت ڈھیلے ڈھالے اور دبے ہوئے لہجے میں۔ پھر یہ کہ فریج بھی اسی کے یہاں موجود تھا۔ بوتلیں تو وہیں ٹھنڈی کی جاسکتی تھیں۔

صلّو بوتلیں فریج میں لگا کر واپس آیا تو زربنہ اس کو برآمدے میں ملی۔
"صاحب جی، میں نے ایڈی سوہنی صفائی کیتی اے۔" اس نے بہت لہک کر اور کھینچ کر بات شروع کی۔
"اچھا لے پھر۔" صلّو نے ایک دونی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔
اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

چاروں دوست اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ چکے تھے۔ صلّو نے ٹیپ ریکارڈ کھول لیا تھا اور اب میز پر رکھی ہوئی بوتلوں پر بوتلیں کھل رہی تھیں۔ تقریباً آدھا جگ تو برف کے کیوبوں سے بھرا ہوا تھا۔

سیون اپ، کوک، فینٹا، پیپسی کولا کے ملے جلے کوک ٹیل میں لیمو اور روح افزا کے ساتھ ساتھ نمک نے وہ زور باندھا کہ ہر لڑکا جھوم رہا تھا۔ قدم

ڈال کہیں رہے تھے اور پتہ کہیں رہے تھے۔ صلّو کے غسل خانے کے پردے کے پیچھے چھپی زرینہ کے خشک اور گھر بھر کی گرد کھاتے ہوئے گلے کو ایک عجب، مٹھاس، ٹھنڈک اور تسکین کا احساس ہوا۔

اور پھر اچانک ہی وہ خوف زدہ ہو گئی۔ انھوں نے سچ مچ شراب ہی نہ پی رکھی ہو!

بلیو جینز اور بیٹلس کے ادھم مچاتے، زمین آسمان ایک کرتے ریکارڈوں کی گت پر ان کے قدم اور دھڑ تیزی سے تھرک رہے تھے۔ ان گانوں کے بول کیا تھے اور ان کو گانے والے کون تھے، وہ یہ کیا سمجھ سکتی تھی۔

اس کو تو پھرکی کے موافق ناچتے ہوئے یہ جسم بہت دلچسپ نظر آرہے تھے۔ خود بخود اس کے قدم ان کی تال پر تال دینے لگے۔ اس کے ہاتھ تیزی سے ہل رہے تھے۔ ایڑی زمین سے ذرا اٹھی ہوئی تھی۔ پنجے اور تلوے کا اگلا حصّہ پھرتی سے اِدھر سے اُدھر گھوم رہا تھا۔ اس کے پیر میں کوئی پتلی نوک والا جوتا نہ تھا اور پیروں میں بجُر بھری تھی۔ اس کا پنجہ اور تلوے کا اگلا حصّہ بھی جھل جھلانے لگا تھا۔ صلّو صاحب کے کمرے میں تو پنکھا چل رہا تھا۔ پر غسل خانے میں کوئی پنکھا نہ تھا۔ وہ پسینے میں تر بتر تھی اس کے بدن سے شعلے نکل رہے تھے۔ پھر بھی وہ بے اختیار ان کی تال پر گھوم رہی تھی جیسے یہ ہاتھ پیر اور جی اس کا اپنا نہ ہو، کسی اور کا ہو۔ اور صلّو اور اس کے ساتھی بھلا کس طرح جان سکتے تھے کہ سیاہ رنگت، چوڑے اور اونچے دانتوں کے ہونٹ والی کوئی چھچھوری سی چھوکری منہ پر لٹوریاں بکھرائے ان کی نقل کر رہی

ذہانت اور خوبی سے کر رہی ہے۔

ان کو تو اپنے سر پیر کی سدھ نہ تھی۔ تھکے اور گڑبڑائے ہوئے، جیسے ان کی رگ رگ پگھل رہی ہو اور انھوں نے یوگا کا کوئی ایسا ریاض کیا ہو جس میں انگ انگ کا ناطہ ذہن اور دل سے ٹوٹ چکا ہو۔

پھر شاید انھیں مزید تیز تیز غل مچانے گانوں کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اس لیے اب ٹیپ ریکارڈر پر کلف کی ٹھیری ہوئی آواز گونجی "وَن دا گرل ان یور آرم"۔

اس گانے والے نے کیا بول گائے تھے یہ اس کا کیا پتہ تھا مگر یہ آواز دھیمی تھی، پُرسکون اور غم انگیز تھی۔ رفتہ رفتہ بکھرا ہوا انگ انگ ایک دوسرے سے ربط قائم کر رہا تھا۔ وہ کھڑے سے زمین پر بیٹھ گئی۔ اور ہلکے ہلکے ہانپتی رہی اور پھر بے خیالی میں یا پھر جان کر غسل خانے کے ٹھنڈے اور سفید فرش پر اوندھی لیٹ گئی۔

پردے کے نچلے حصّے میں سے اب وہ لوگ فرش پر بیٹھے نظر آرہے تھے۔ ان کے ادھ مہرے خاموش اور سنجیدہ تھے اور وہ سب کے سب اس کو بہت پیارے معلوم ہو رہے تھے۔ اور ان سب کے درمیان صلّو صاحب کا جانا پہچانا چہرہ۔ جیسے راجے کا بیٹا۔ اس نے سوچا اور پڑی ہی پڑی رہی، اور پھر اچانک اس کو خیال آیا۔ یہ صلّو صاحب نے یہاں جھپے دیکھ لیا۔ تو دہشت کے مارے وہ پچھلے دروازے سے بھاگ نکلی۔ گندے پانی کی ہودی کے پاس کتنی دیر کھڑی وہ اپنی اُکھڑی سانسیں درست کرتی رہی۔

اس شام زرینہ نے سلمی کو بتایا تھا: "آج صلّو صاحب نے پہلے نچّیے
چوفی دتّی فیر دوڑنی۔ اب تاں ہیں جاکر ہیکو دی چوک بار کھاواں گی۔ پہلے میرے
سراُتّے کاپی ماری، فیر چوانی دتّی۔ ہور ڈھیر سارے ٹیڈی صاحب آئے
تھے۔ ایڈے سوہنے، ایڈے سوہنے —" وہ سلمی کو ہر رپورٹ بڑے
مبالغے سے اور اتنا للچا کر دیا کرتی تھی کہ یوں لگتا تھا اسکول میں تو اس
کا دن یوں ہی ضائع ہو گیا۔

پھر اچانک ہی صلّو کو محسوس ہوا کہ اس کا کمرہ اتنا صاف، ستھرا
رہنے لگا ہے کہ شریف آدمی کو اس کی صفائی کھلنے لگے۔ اور جب۔ پرچہ
کرنے کے بعد واپس آکر وہ امی جان کو نخرے سے دکھا رہا تھا "اتنا ورد ہے
ہاتھ پیروں میں کیا بتاؤں۔" تو اچانک ہی دو ہاتھوں نے لپک کر اس
کے پاؤں دبانا شروع کیے۔

اس نے ایک نظر ڈالی، اور گھبرا کر چیخ ہٹ پاگل تو نہیں ہو گئی۔
بھئی عجب بدتمیز لڑکی ہے۔" اور وہ فوراً ہی وہاں سے ہٹ گیا۔
"میں ابّا کو بتاؤں گا، ابّا کو بتاؤں گا۔" اس کے بھائی اسد نے تالیاں
بجا کر کہا۔ تو وہ جھلا گیا۔

"کیا بتاؤ گے؟"

"میں ابّا کو بتاؤں گا۔ بھائی جان نے اپنے کمرے میں صبیحہ اور نہ جانے
کس کس کی تصویریں لگائی ہوئی ہیں۔"

"کیا بکواس ہے۔" وہ بگڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اندر داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک گیا۔ موٹے موٹے چہرے والی دو تین ایکٹرسوں کی تصویریں عین اس کی رائیٹنگ ٹیبل کی، ساتھ والی دیوار پر گوند سے چپکی ہوئی تھیں اور اس کی گوند دانی ساری گوند میں لتھڑی پڑی تھی۔

اور اس دن دوبارہ اس نے زرینہ کو ڈانٹا تھا "کم بخت، گنوار، مت آیا کر میرے کمرے میں۔"

اس لیے کہ اس نے قبول نہ کیا تھا کہ کارروائی اسی کی تھی اور وہ تصویریں ساتھ والی کوٹھی سے مانگ کر لائی تھی۔

"ایک تو خود اتنی غلیظ ہے۔ بال بکھرے، آنکھیں پچ پچاتی، اوپر سے میری ساری دیوار ناس کر دی۔"

وہ خاموش گردن جھکائے کھڑی رہی تھی اور اس دن خلافِ عادت جلد جلد کام کر کے چلی گئی۔

اس شام کو سلمیٰ نے اس کو ٹوکا۔ "آج تو بڑے ٹھاٹ ہیں۔"

اس دن اس کے سر سے سرسوں کے تیل کے بھبکے بھی آ رہے تھے۔ خوب چمکا کر بنے ہوئے بالوں اور سرمے سے کالی آنکھوں میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ مسخری نظر آ رہی تھی، جیسے کسی نے سوانگ بھرا ہو۔

اور اب صلّو صاحب نہ جانے کدھر رہنے لگا تھا۔ اِدھر آیا اُدھر نکلا۔ جانے کس چکر میں لگا رہتا تھا۔

ایک دن اس نے سلمیٰ سے کہا۔ "اب صلّو صاحب بارہ ہو جاوے گا۔"

"بارہ کیا!" سلمیٰ نے پوچھا۔ "آوارہ! توبہ کر، کا ہے سے تو نے کہا۔"

"میرا بھائی ایسے گھوبدا پھردا اے ۔ ذرا دیر نوں بھی گھر نہیں بیٹھدا میری امّی کہندی اے یہ بارہ ہو گیا ۔"

"چل ہٹ ۔"

اور وہ ہٹ گئی ۔

پھر اس نے ایک دن اپنی مخصوص بآواز سرگوشی میں سلمیٰ سے پوچھا۔ "ٹکٹیں جمع کرتی ہو ۔ مجھ سے لوگی ؟"

"کہاں سے لائے گی ؟"

"بس لادیواں گی ۔ پردانی کے چار ملن گے ۔"

"اچھا پھر لادے ۔" سلمیٰ نے ہوم ورک کرتے ہوئے بے پروائی سے کہا ۔ اس سے پہلے ایک مرتبہ بڈھی جمعدارنی نے بھی مٹھا بھر ٹکٹ لادیئے تھے ۔ سب بیکار ۔ نرے پاکستانی ڈاک کے تھے ۔ لیکن جب اس نے پرانے لفافے میں رکھے ہوئے ٹکٹ دیئے تو سلمیٰ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں یہ تو الجزائر، یوگوسلاویہ، چین اور ترکی کے ٹکٹ تھے ۔

دوسرے دن صلّو نے گھر میں غدر مچا دیا ۔ دونوں بھائیوں کو مارا اور گھر بھر میں بڑبڑاتا پھرا ۔ "میری البم کا ناس مار دیا ۔ سارے اچھے اچھے ٹکٹ اکھاڑ لیتے ہیں ۔"

بھائی جان کے ٹکٹ کس نے اکھاڑے ہیں ۔ یہ سلمیٰ فوراً سمجھ گئی ۔ لیکن وہ خاموش رہی ۔ رات ہی تو ان سے اس کی لڑائی ہوئی تھی ۔ اچھا ہے ۔ اللہ کرے سارے ٹکٹ چرا چرا کر بیچ دے ۔

اور پھر دو چار دن بعد ایک دن صلّو نے ہنگامہ مچا دیا۔ اس کے لائے ہوئے رسالوں میں سے ساری اچھی اچھی تصویریں کسی نے کاٹ لیں۔ کلف اور ایلوس کی تصویریں سلمٰی کے سوا کون چرا سکتا تھا وہ اس سے خوب لڑا۔ سلمٰی چاہتی تو زرینہ کا نام لے سکتی تھی لیکن وہ جان بوجھ کر خاموش رہی۔

ہر روز کی طرح سارا کام ختم کر کے وہ صلّو کے کمرے میں پہنچی۔ طرح طرح کی چیزیں، صلّو صاحب کی دوربین، کپڑے، شیو کا سامان، اتنی بہت کتابیں اور اکیلا کمرہ۔ یہ سب چیزیں مل کر اس کے ذہن میں اتنا ڈنگا کرتیں کہ اس کے اندر کا سویا پڑا شیطان جاگ اٹھا کرتا۔ پھر وہ دیر دیر تک کپڑوں والی الماری کے شیشے کے سامنے مٹکا کرتی۔ وہ پھیکی پھیکی ناک، ہنسنے میں گڈھے پڑتا ہوا سیاہ فام چہرہ اور ذرا سی مسکراہٹ پر کھڑے کھڑے دانتوں کا باہر نکل آنے والا چوکا، صلّو صاحب کے ستھرے ستھرے آئینے میں کتنا نامناسب اور رنگ سک سے درست معلوم ہوتا۔ پھر وہ لرزتے ہاتھوں سے پوڈر کا ڈبہ اٹھا کر گلے کے پاس سے مسکی ہوئی میلی لبباندی قمیض کا گریبان کھولتی اور پوڈر چھڑک لینے کے بعد آئینے کے سامنے سجی شیشیوں کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ ان کو سونگھتی اور ان کی مہک کے بھید دل میں گم ہو جاتی۔ ان میں پڑے ہوئے خوشبو بھرے تیل اور نہ جانے کیا کیا اس کے اندر ایک ان جانی امید اور خوشی کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگاتے اور بڑے اعتماد سے شیو کے بعد لگانے والے لوشن کو بالوں میں چپڑتی، شیمپو کو منہ ہاتھوں پر مل کر غسل خانے کی سفید چینی والی سلفچی کے پاس کھڑی اس کے

نرم نرم جھاگوں سے کھیلا کرتی۔ اور یہ ریشمی جھاگ اس کی روح تک کو
ریشم کی طرح ملائم کر دیا کرتے۔ پھر بڑے ٹھسے سے منہ دھونے کے بعد
میلے میلے پلّو سے منہ پونچھتی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر کنکھجورا سی
مانگ پٹی سنوار سنوار کر نارنجی گالوں اور ڈڈوؤں کی شکل والے پیلے پیلے کلپ
لگا کر اپنے سراپا کو سراہتی اور پھر بڑے اطمینان سے پنکھا کھول کر صفائی
شروع کر دیتی۔ کھٹر کھٹر جھاڑو میں مار مار کر کوڑا میز کے اور کپڑوں کی الماری
کے نیچے دھکیل دیتی۔ پھر یوں بھی ہوتا کہ کمرے کے عین وسط میں بچھی
ہوئی بھوری دری پر پڑ کر سو جاتی۔ یا پھر کتابوں کی تصویریں دیکھتی اور ان
میں سے جو پسند آ جاتی وہ چپکے سے کاٹ بھی لیا کرتی۔

اور آج تو صلّو صاحب مری گیا ہوا تھا۔ کمرہ کتنا سُونا سُونا ہو رہا تھا
جلدی میں صلّو اپنی تصویروں والی البم میز پر ہی بھول گیا تھا۔ دری پر
بیٹھ کر اس نے البم اپنے سامنے کھول کر پھیلائی اور ورق پلٹ پلٹ کر
تصویریں دیکھنا شروع کیں۔ ڈرامیٹک سوسائٹی کے گروپ میں صلّو کے
کندھے پر ہاتھ رکھے اور اس کے بالکل قریب کھڑے ساڑھی اور شلوار
دوپٹے میں ملبوس لڑکوں کے اس نے خوب منہ چڑائے۔ "کنجری بھسماں
نوں کھانی!" اور پھر اودی پنسل کو تھوک لگا لگا کر اس نے دونوں کے
چہروں پر گہری گہری مونچھیں بنائیں۔ البم کو ہاتھ سے دھکیلا۔ پنکھا بند
کیے بغیر نکل آئی اور دیر تک جامن کے پیڑ پر ٹنگی اودی اودی کھٹ مٹھی
جامنیں کھا کھا کر اپنا غم غلط کرتی رہی۔

اس شام جب امی جان نے اسد کو ڈانٹا کہ بھائی کے کمرے کو الٹ پلٹ کر کے پنکھا کھلا چھوڑ آئے تو زرینہ اپنے ہونٹوں اور ٹھوڑی پر پنسل کے ادھورے نشانوں سمیت سر جھکائے بیٹھی ٹاکی لگاتی رہی۔

"ائے ہے گھر کیا ہوا، چوراہا ہو گیا۔ ادھر پیسے رکھے ادھر غائب۔" لال شاہ کے سوا ان کو ہر ایک پر شبہ تھا۔ کئی دن سے پیسے غائب ہو رہے تھے اور پتا نہیں چلتا تھا۔ وہ غصے سے بھری ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں تو دیکھا زرینہ آئینے کے سامنے کھڑی لپ اسٹک لگا رہی ہے۔ قدموں کی چاپ پر وہ چونکی اور لپ اسٹک اپنی شلوار کے نیفے میں کھوس لی پھر جب ان کو اپنی لپ اسٹک میز پر نظر نہ آئی تو ان کو یقین ہو گیا کہ زرینہ نے جو لپ اسٹک اپنے نیفے میں کھوسی تھی، وہی تھی۔

اور اب یہ بات صاف ہو چکی تھی کہ صلّو کی قینچی کون لے گیا تھا۔ اور اس کی جیب سے پیسے کون نکال رہا تھا۔

وہ باہر نکل آئیں اور بہت دھیمی آواز میں اس سے بولیں "اری زرینہ آج شام اپنی ماں کو ساتھ لانا۔ مجھے اس سے ایک کام ہے۔"

زرینہ کی ماں اور ان کے درمیان بڑی نیچی آواز میں بات ہوئی تھی لیکن انھوں نے سرگوشی کے انداز میں بات کی اور اس کی ماں نے پوری آواز اٹھائی "بی جی تم اس کو مارو، سر توڑ دو اس کا۔"

میں کس کس کو ماروں۔ اپنے بچے کم ہیں جو اس کے مارنے کا کام بھی اپنے ذمے لگا لوں۔ تو خود سمجھا، کمئی مار، جو تیرا جی چاہے کر۔"

دوسرے دن اس نے جھاڑو دیتے دیتے سلمیٰ سے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔ "آج میں جلدی جاواں گی۔"

"کیوں؟"

"آج میری امّی مینوں گرجے لے جاوے گی۔"

"گرجے؟ کیوں؟"

"تم کو نہیں پتا، ہم کنفیشن کرنے جاتے گا۔" وہ ایک دم کھڑی بولی پر اُتر آئی۔

"کیا پتہ نہیں کیا بولتی ہے۔" سلمیٰ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"جیڑا خادل ہوندا اے۔ اس کے سامنے کنفیسن کو۔ ہم تو سائی ہیں نا۔ جیڑا کم خراب ہوندا اے اس کے پاس بولتے۔"

"اچھا کنفیشن کے لیے جائے گی!"

"ہاں اور کیا۔ ہم تو سائی ہے۔ میرا اصل نام جرینہ تھوڑی ہے۔ میرا نام ٹو گریس ہے۔" وہ پھر اس انداز میں مٹکی کہ سلمیٰ کو ایک بار پھر اپنی کمتری کا احساس ہونے لگا۔

سلمیٰ کی پھولدار پرانی قمیص، اجلی اجلی نیلی شلوار اور پیلا دوپٹہ اوڑھے پٹیاں سنوارے وہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے گرجا کی طرف چلی۔ وہ بار بار اپنے ڈڈوں کی شکل والے کلپ درست کر رہی تھی۔ اور جلی لکڑی جیسی سیاہ انگلیوں کی نوکوں پر جیسے جیسے خون کے رنگ میں ڈوبے ناخنوں کو بار بار دیکھ رہی تھی۔ بات بات پر باہر نکل آنے والا اچو کا اس وقت بالکل اندر تھا۔

اور نیلے ہونٹوں والا دہانہ ایک لمبی سی "ف" کی شکل میں یہاں سے وہاں تک نہایت ذمہ داری سے کھنچا ہوا تھا۔ وہ سُرخ و سفید لمبے چوڑے سفید عبا اور کالی پٹی والے فادر کے سامنے جا رہی تھی جس سے وہ ہر پندرہ دن کے بعد امریکن دودھ کا "ڈبہ" لینے آیا کرتی تھی۔ اور اب ہر بات اسے سچ سچ بتا دینا تھی۔

مگر گرجا کے دروازے پر اس کو جو فادر ملا وہ سرخ و سفید لمبا چوڑا فادر نہ تھا۔ اس کے بجائے وہ جس کے حوالے کی گئی تھی وہ چونے کی طرح سفید، بہت دبلا اور لمبا فادر تھا جس کی سنہری ڈاڑھی چھوٹی تھی اور نیلی آنکھیں روٹھے ہوئے بچے کی طرح چُپ چُپ تھیں۔

کنواری مریم کی مقدس قربان گاہ کے قریب دوزانو ہو کر اس سیاہ فام لڑکی نے مختلف اعتراف کیے۔ چھوٹے چھوٹے اور قطعی غیر سنگین اعتراف! گویا وہ چھوکری اور اس کی ماں جلتی ہوئی ان شمعوں کے سامنے محض اس کا مذاق اڑانے آئی ہوں۔ بھلا یہ بھی کہنے اور سننے کے قابل باتیں تھیں ——"میں نے ٹیڑھی صاحب کی ٹکسوں والی کتاب سے ٹکس چرا کر سلمٰی بی بی کے ہاتھ دیچے تھے۔ ہور صلّو صاحب کی قینچی ٹھالی سی۔"

"کیوں!" سنہری ڈاڑھی اور چپ چپ سی آنکھوں والے فادر نے رعب دار آواز میں پوچھا تو وہ بوکھلا کر اپنے ناخن دانتوں سے کترنے لگی۔

"ہور میں بیم صاحب کے صندوکڑے وچوں چرائی اور اٹھبانی بھی کڈھی سی ——"

یہاں وہ رُکی اور اس کے کانوں میں اپنی ماں کی وہ آواز گونجی جو اس نے گرجا کے پھاٹک پر اس سے کہی تھی "ساری بات تہ یو کوئی گل چھپائیو مت۔"

"فادر جی۔ میں اس کر کے لپ اسٹک، کا ٹوپ ——" اس کا دل بھر آیا تھا۔ اور وہ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

"اچھا اچھا۔ کوئی گل نہیں۔"

"قطعی واہیات اور غیر سنگین اعترافات!" وہ بڑبڑایا۔ وہ دونوں قربان گاہ کے پاس سے ہٹ کر باہر نکلنے کو تیار ہوئے تو گرجا کے اندر مکمل خاموشی اور تنہائی تھی۔

"اور تو نے پوری بات تو فادر جی کو بتائی نہیں!" اس کے دل کا چور بار بار اسے ملامت کر رہا تھا۔ دو رویہ نشستوں کے درمیان سے گذرتے گذرتے بات اس کی برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ وہ رُکی، جھجکی اور بولی: "فادر جی، اک ہور گل وی دسنی سی۔" اس کی آواز جرم اور ندامت سے بھرپور تھی۔

"بولو!" وہ پُر امید انداز میں مڑا۔ وہ دونوں دروازے کے بہت نزدیک پہنچ چکے تھے۔ قربان گاہ بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ اور وہاں ایک بھی شمع روشن نہ تھی۔

"فادر جی —— میں" —— اس نے دوپٹے کا پلو اپنے دانتوں تلے کچلا —— "میں جی! ایڈی صاحب جو ہے نا۔ جیڑا سلّو صاب اسے۔ میں

اس کو جی ——— اوہ ———"

"کیا بات ہے ؟" فادر جھنجھلایا۔ اور یہ پہلا پہلا اعتراف تھا جو اُس نے سُنا تھا۔

"وہ ٹینوں پیارا ——— مینوں بڑا ہی سوہنا لگدا اے۔ ہور ہیں اس دی تُست بیر" بھی چرائی سی۔ اسے ویکھو۔"

زرینہ عرف گریس ولد یوزف مسیح نے اپنی شلوار کا نیفہ ٹٹول کر ایک مڑی تڑی تصویر نکالی۔ اور فادر کی نیلی آنکھوں نے جھک کر اس تصویر کو دیکھا ایک عام سے اسمارٹ لڑکے کی چرائی ہوئی تصویر کے مقابل زرینہ عرف گریس کے چہرے پر اس کا دہانہ ایک طویل "ب" کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ چہرے کی سیاہی میں، اس کی آنکھیں روشن ستاروں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ اور اب اس کا چہرہ یوں نظر آرہا تھا جیسے اس نے سارے قرضے چکا دیئے ہوں۔ چپ چپ سی آنکھوں والے فادر نے خاموشی سے گرجا کا دروازہ کھول دیا۔

اور جب وہ لاپرواہی اور مگن پن سے جھولی میں پڑے مکا کے دانے پھانکتی ہوئی اپنی ماں کے پیچھے چلی تھی تو اسی وقت سیڑھیوں کے نزدیک سے گذرتے ہوئے لڑکے کے ٹرانسسٹر نے آواز لگائی۔

"گوٹ آفنی فیلنگ ——— فالن اِن لو وِد دیو!"

فادر نے زیرِ لب مسکرا کر خاموشی سے اپنے سینے پر لٹکی ہوئی صلیب کو درست کیا اور سیڑھیاں اُتر گیا۔

ختم شد:

۳۱ مارچ

تب اس نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا کہ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس نے اپنی ساری پسلیوں کو شمار کیا اور طے کیا کہ وہ آگ سے سالم نکل آیا۔ اسے اپنی کمینی ذلتوں کا خیال آیا۔ مگر پھر اس نے غیر جذباتی، غیر جانبدارانہ انداز میں فیصلہ کیا کہ ذلتیں تجربے کا حصہ ہیں۔ اور آدمی بننے کے لیے ان سے گذرنا ضرور ہے تو وہ اب آدمی بن گیا ہے اور اپنی ذات میں مکمل ہو گیا ہے، اس نے ایک احساس برتری کے ساتھ طے کیا اور مطمئن ہو گیا۔

وہ اب مکمل تھا اور فارغ تھا۔ فراغت کے ساتھ بھولے ہوئے کام یاد آئے۔ اس نے ایک احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ان سارے کاموں کی اہمیت کو محسوس کیا جو کتنے دنوں تک غفلت کا شکار رہے تھے کتنے دنوں تک؟ ایک تحقیقی جذبے کے ساتھ اس نے اپنی ڈائری کھولی۔ اندھے جذبے کے گرداب سے وہ نکل آیا تھا۔ اب صرف تحقیقی جذبہ کام کر رہا تھا۔ یکم مئی ۵۸ء اور آج مارچ کا آخری دن ہے۔ ۳۰ مارچ ۵۹ء گیارہ مہینے۔ گیارہ مہینوں میں سب ہی مراحل گذر گئے۔ مگر اس سوچ میں کسی تاسف کا رنگ نہیں تھا۔ وہ تو بے تعلقانہ اپنا حساب کتاب کر رہا تھا۔ یکم مئی ۵۸ء کی تاریخ بھی تو اس نے ڈری،

بے تعلقی سے قلمبند کی تھی اور اس تاریخ کے بعد سے اس نے اپنی تھوڑی سی نگرانی بھی شروع کر دی تھی۔ بات یہ ہے کہ وہ ایسے کسی قصے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یوں وہ کتابیں پڑھ پڑھ کر اپنے حساب میں دانا بینا بن گیا تھا اور یہ جان گیا تھا کہ محبت کے بغیر آدمی مکمل نہیں ہوتا۔ مگر خود اپنی تکمیل کی وہ نیت نہیں رکھتا تھا۔ اپنی تکمیل کی نیت اسے انیسہ کے یہاں بھی نظر نہیں آئی۔ اور انیسہ پر اسے شروع میں ایک خشک بے رنگ پارسا لڑکی کا گمان ہوا تھا۔ ایسی لڑکی سے بھلا محبت کی جا سکتی ہے! اس نے قطعی انداز میں سوچا اور اسے اپنے ذہن سے یکسر خارج کر دیا ...... مگر پھر اس کے ذہن میں یہ سوال آیا کہ آخر یہ بات اس کے ذہن میں آئی کیوں؟ اب تک۔ تو اس لڑکی کے متعلق کوئی خیال اس کے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔ دانا بینا تو وہ بہت بنتا تھا نا۔ اس نے سوچا کہ ذہن میں کسی خیال کا آنا خود ایک خطرے کی گھنٹی ہے اور بعض قصے بہت انوکھے طریقوں سے شروع ہوتے ہیں تو اس نے احتیاطاً ڈائری میں تاریخ نوٹ کر لی تھی کہ کس دن ایسا خیال پہلی مرتبہ اس کے دماغ میں آیا۔ یہ سوچ کر کہ مبادا کوئی قصہ شروع ہو جائے اور قصے کی انتہا نہ معلوم ہو ابتداء تو معلوم ہونی چاہیے۔ اب اس قصے کی ابتداء اور انتہا اس کے سامنے تھی۔ یکم مئی ۱۹۵۸ء کو آغاز ہوا۔ آج ۳۰ مارچ ۵۹ء کو اس کا انجام ہوتا ہے۔ محبت اور کیلنڈر، وہ اپنے آپ پر تھوڑا ہنسا۔ مگر اس عہد میں اس کے سوا چارہ کیا ہے اور مجنون بننے سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ آدمی کیلنڈر کو سامنے رکھے اور اس نے یکم مئی کی تاریخ معروضی انداز میں نوٹ کی تھی۔ اور اس کے بعد اپنی نگرانی شروع کر دی

تھی جب انیسہ کا خط آتا تو وہ اپنے آپ سے دُور کھڑے ہو کر اپنے آپ پر
اس خط کے اثرات کا مشاہدہ کرتا۔ جب انیسہ کا فون آتا تو ایک حسن فون پر
باتیں کرتا۔ اور دوسرا حسن فون پر باتیں کرنے والے حسن کو تاڑتا رہتا اور
انیسہ فون پر بات کرتے کرتے اچانک رُک جاتی، ایسے جیسے ریشم کی لمبی
ڈوری میں ننھی سی گرہ پڑ جائے۔ گرہ پڑ جاتی اور پھر ریشم کی ڈوری کھنچتی چلی
جاتی۔ پھر گرہیں بڑھتی چلی گئیں اور ریشم کی ڈوری کھنچتی چلی گئی۔ اور دوسرا
حسن نگہبان بنا یہ مشاہدہ کرتا رہا۔ کہ پہلا حسن کس بے تابی سے فون کا انتظار
کرتا ہے اور بات کرتے کرتے کیا کیا گڑبڑاتا ہے۔ ریشم کی ڈوری میں الجھتا
ہے مگر نگہبانی کرتے کرتے وہ بھی فون کے قریب جا کھڑا ہوتا۔ اور اس کی نگرانی
ڈھیلی پڑتی چلی گئی۔ اور گیارہ مہینے غرق ہو گئے۔ زندگی کے گیارہ مہینے افسردگی
کی ایک ہلکی لہر آئی اور گذر گئی۔ وقت کے اس زیاں کو وہ مسئلہ بنانے کے
لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے پھر سے سرگرم ہونے کا جو تہیہ کر لیا تھا۔ تولیہ
کاندھے پر ڈال لپک جھپک غسل خانے میں داخل ہو گیا۔

اس نے غسل، غسل صحت کی مثال کیا، جیسے کوئی لمبا سفر کیا ہو۔ اور
نہا دھو کر ساری گرد، ساری تھکن اتار دینا چاہتا ہو۔ جیسے وہ غم و غصہ کی گرد
میں اٹا ہوا تھا اور ذلتوں اور رنجشوں نے اُسے میلا کر دیا تھا۔ اشنان کیا
اور وہ پوتر ہو گیا۔ غسل خانے سے وہ اپنے پھول بدن اور خوشبو دار روح کے
ساتھ ایک نیا آدمی بن کر نکلا۔

کپڑے بدلتے بدلتے نظر اس نیلے خط پر جا پڑی۔ جو پرسوں سے میز پر

کھلا پڑا تھا۔ یہ خط میرا ماضی ہے۔ ماضیٔ قدیم۔ اس خط کو اٹھا کر اس نے یوں پڑھا، جیسے وہ کسی قدیم قلمی نسخے کا مطالعہ کر رہا ہے۔ جس بے تعلقی کے ساتھ اسے اٹھایا تھا اسی بے تعلقی کے ساتھ اسے پھر میز پر ڈال دیا۔ نہایت واہیات خط ہے۔ اس میں اس نے کچھ بھی نہیں لکھا۔ مگر اس نے کب کس خط میں کچھ لکھا تھا۔ اک تلخ سے احساس کے ساتھ اس کے سب خطوط کو دھیان میں لایا۔ فضول بے معنی واہیات خطوط، مگر اس وقت وہ کتنے بامعنی، جذبے سے کتنے لبریز نظر آتے تھے۔ خط کا آنا ایک روحانی واقعہ بن جاتا تھا۔

"یار یہ لڑکی ہے نہیں، میرا مطلب ہے اینسہ۔" وہ اس خوشبو کو دنوں اپنے نافہ میں چھپائے پھرتا رہا۔ مگر آخر وہ خوشبو ہونٹوں کی راہ پھوٹ پڑی۔ "یار وہ مجھے خط بہت لکھتی ہے۔"

"اچھا؟" مقصود نے بہت اشتیاق سے پوچھا۔ "اور تم؟"

"میں بھی بہت خط لکھتا ہوں۔"

"رومانس ہے؟" عزیز نے بے تکلفانہ ٹکڑا لگایا۔

اس بے تکلفی پر حسن بہت سٹپٹایا۔ وضاحتی بلکہ معذرتی انداز میں کہا: نہیں یار ویسی بات نہیں۔ ہماری خط و کتابت انٹلکچول مسائل پر ہوتی ہے۔"

"انٹلیکچول مسائل پر؟" عزیز بھڑک گیا۔ "انٹلیکچول مسائل پر خط و کتابت۔ لڑکی سے؟"

اس نے پھر معذرت کی۔ "یار وہ لڑکی ویسی نہیں۔"

"ویسی نہیں؟" عزیز نے غصّے سے کہا۔

اور اس نے دبے لہجے میں کہا۔ "وہ بہت سنجیدہ لڑکی ہے یار۔"

عزیز نے اُسے غصّہ سے دیکھا اور کہا۔ "دیکھو حسن، ہر لڑکی سنجیدہ ہوتی ہے مگر کوئی لڑکی سنجیدہ نہیں رہنا چاہتی۔ اور ہر لڑکی جو کالج میں پڑھ چکی ہے انٹلیکچوئل خط لکھے گی۔ مگر کوئی لڑکی یہ پسند نہیں کرے گی کہ اس کے انٹلیکچوئل خط کا جواب انٹلیکچوئل خط سے دیا جائے۔"

"بکواس،" مقصود نے عزیز کو تحقیر آمیز نظروں سے دیکھا۔

"کیا مطلب ہے؟" عزیز نے سوال کیا۔

"مطلب یہ ہے کہ تعلیم یافتہ لڑکی کی نفسیات کو سمجھنے سے تم قاصر ہو۔ تعلیم یافتہ لڑکی یہ دیکھتی ہے کہ کیا آپ اس سے ذہنی طور پر برتر ہیں۔ ذہنی لحاظ سے اپنے سے کمتر کو وہ قبول نہیں کر سکتی۔"

اصل میں عورت کے بارے میں مقصود اور عزیز کے الگ الگ نظریات تھے۔ عزیز کہتا تھا کہ عورت سفنکس ہے۔ جو عورت تمہارے پاس آتی ہے وہ اک سوال بن کر آتی ہے۔ اگر تم نے اس کے سوال کو سمجھ لیا تو تم نے اسے توڑ دیا۔ نہیں سمجھا تو وہ تمہیں توڑ دے گی۔

مگر مقصود نے اور ہی بات کہی۔ "حسن تمہارے ساتھ دقت یہ ہے کہ تم عورت کے سامنے جھکنا نہیں چاہتے۔ مگر محبّت کڑی کمان بنے رہنے کا نام تو نہیں ہے اس میں اپنے آپ کو توڑنا پڑتا ہے۔"

اس نے کچھ باتیں عزیز کی سنیں، کچھ باتیں مقصود کی گرہ میں باندھیں۔ کچھ باتیں اس نے کتابوں میں پڑھی تھیں۔ اور کتابوں میں باتیں پڑھنے کے بعد اس نے

اپنے متعلق طے کیا تھا کہ وہ رومانٹک آدمی نہیں ہے۔ مگر ان دنوں مختلف نظریات و تصوّرات اس کے دماغ میں گڈمڈ تھے اور اس نے پریشان ہو کر مقصود سے کہا۔ "یار میں تھوڑا سا بے وقوف نہیں ہوں؟"

مقصود نے اسے دیکھا اور دلاسا دیا۔ "ہر عاشق بے وقوف ہوتا ہے۔ محبّت چالاکی کا نام نہیں ہے۔"

عزیز نے مقصود کو تحقیر کی نظر سے دیکھا اور پھر اس سے مخاطب ہوا "حسن، یہ تمھاری خط و کتابت بہت لمبی ہو گئی۔"

"ہاں یار کچھ زیادہ ہی لمبی ہو گئی۔" اس نے بڑی بے چارگی سے کہا۔

"اسے مختصر کرو۔"

"مگر کیسے کروں؟"

"دیکھو دنیا میں دو قسم کی لڑکیاں پائی جاتی ہیں۔" عزیز رکا اور بولا "میرا مطلب ہے کہ خط لکھنے والی لڑکیوں میں دو قسم کی لڑکیاں پائی جاتی ہیں، ایک وہ جو اپنے خطوں میں فلمی مکالموں سے استفادہ کرتی ہیں، ایک وہ جو انٹلیکچوئل قسم کے ناولوں سے استفادہ کرتی ہیں۔ مگر لفظ خواہ وہ "فلمی ڈائی لوگ" ہو خواہ وہ ہو اکس سے ماخوذ ہو عمل کا بدل نہیں ہے۔ خیر فلمی مکالموں سے استفادے کا تو ایک جواز ہے۔ مگر انٹلیکچوئل ناولوں سے استفادہ کر کے خط لکھنا سخت مبتذل حرکت ہے۔ خواہ یہ حرکت تم کرو یا وہ کرے۔ تو پیارے لفظوں کے اس ابتذال کو ختم کرو۔"

"مشکل ہے۔" اسے اس ابتذال سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے

رہا تھا۔

"پھر اس قصہ پر ہی خاک ڈالو۔ اس لڑکی پہ لعنت بھیجو ورنہ تم مارے جاؤ گے پوچھو کیوں؟"

"کیوں؟"

"دو بیوں کی محبت کوئی دائمی چیز تو ہے نہیں۔ ہر جذباتی صورتِ حال کی ایک مدت ہوتی ہے۔ اور اس کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ تقاضے اس مدت میں پورے ہونے چاہئیں۔ اگر مرد ان تقاضوں سے کترائے گا تو عورت اس پر لعنت بھیجے گی۔ اور متنفر ہو جائے گی۔ اگر عورت دامن بچائے گی تو مرد اسے ٹھوکر مارے گا۔ اور الگ ہو جائے گا۔ تو قبل اس کے کہ وہ تم پر لعنت بھیجے اور تم سے متنفر ہو۔ تم اسے ٹھوکر مارو اور الگ ہو جاؤ۔"

مقصود نے عزیز کو سخت حقارت سے دیکھا اور چپ ہو گیا۔

عزیز نے دونوں دوستوں کی خاموشی سے فائدہ اٹھایا اور حکیمانہ لہجہ میں کہا "حسن، تم اسے ٹھوکر مارو۔"

"عورت کو تم اس کی عزت کر کے ہی جیت سکتے ہو۔" آخر مقصود کو بولنا ہی پڑا۔

"عزت اور عورت کی؟" عزیز نے تعجب سے مقصود کو دیکھا۔ عورت کو سجدہ کرو، عورت تمہارے سر پر سوار ہو جائے گی۔ تم سے نفرت کرے گی۔ عورت کو ٹھوکر مارو۔ عورت تمہارے قدموں پر گرے گی۔"

وہ دو بصیرتوں کے درمیان لڑھک رہا تھا۔ کبھی وہ انیسہ سے یوں بیڑا

جیسے وہ سپاہی ہے اور اسے اس قلعہ کو فتح کرنا ہے، کبھی یوں جھکا جیسے وہ بھگت ہے اور مندر میں داخل ہو رہا ہے۔ مگر موت اور عورت، ان دونوں کے سامنے آدمی اکیلا ہوتا ہے۔ اپنی ہی بصیرت ہو تو کام آتی ہے۔ موت اور عورت۔ وہ موت اور عورت کی زد سے نکل آیا ہے۔ اس نے ایک دفعہ پھر اطمینان کا سانس لیا۔ مقابلے کی بصیرت نہ ہو تو بچ نکلنے کی بصیرت ہونی چاہیے۔

وہ اپنے آپ کو بچ نکلنے کی بصیرت پر داد دے رہا تھا اور کپڑے بدل رہا تھا۔ عجلت میں کپڑے بدلے، عجلت میں ناشتہ کیا۔ آج پہلی تھی اور اسے بہت کام نبٹانے تھے۔ ناشتہ کرتے کرتے اس نے اخبار پر بھی ایک نظر ڈال لینے کی کوشش کی۔ ۳۱ مارچ۔ اس نے اخبار کی تاریخ کو پھر غور سے دیکھا۔ تو گویا آج پہلی نہیں ہے۔ یعنی مارچ کا مہینہ ختم ہوا ہے۔ یعنی ابھی میعاد تمام نہیں ہوئی ہے مگر دوسرے سانس میں اس نے سوچا کہ جو کچھ لکھا گیا وہ لکھا گیا۔ کل میں اپنی ڈائری لکھ چکا ہوں۔ اب یہ ٹکڑا ایک دن کے سبب دوبارہ شروع نہیں کیا جا سکتا۔

جب پوری طرح تیار ہو لیا اور گھر سے نکلنے کو تھا تو اسے خیال آیا کہ کیا اسے واقعی آج ہی سے زندگی کا نیا پروگرام شروع کرنا ہے۔ مگر طے تو یہ ہوا تھا کہ مارچ کے ختم تک یہ پروگرام چلے گا اور مارچ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ تو کیا میں اسی تجربے کی تجدید کروں؟ تجربہ؟ کیا میں واقعی کسی تجربے سے گذرا ہوں؟ اس نے شک بھرے انداز میں سوچا۔ یہ شک اس قصہ میں بار بار اس کے یہاں پیدا ہوا تھا۔ یہ میں اتنے طول طویل خط کیوں لکھتا ہوں۔ میں نے محبت کو ایک علمی مسئلہ بنا دیا ہے۔ حالانکہ وہ ایک سیدھا سچا انسانی

تجربہ ہے۔ اس احساس کے تحت اس نے اپنے صبا رفتار قلم کو لگام دی، مگر پھر اس کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ کیا ہیں نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک تھا، اس وقت وہ ایک قطعی معروضی انداز میں اپنے اقدام پر محاکمہ کرنا چاہتا تھا۔ جب اس نے یہ کہا تھا اس وقت تو اسے کچھ پتہ نہ چلا کہ اس نے صحیح کیا یا غلط کیا۔

مقصود اور عزیز میں بھی اختلافِ رائے تھا۔

"بیوقوف یہ بات کہنے کی تھی؟" عزیز نے غصّے سے کہا۔

"یار بس میں نے کہہ دیا۔"

"اس نے کیا کہا؟"

"اس نے؟ اس کا دل ڈوبتا چلا گیا اور آواز جیسے اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے ساتھ چھوڑتی آواز کا سرا پکڑا۔" اس نے...... کچھ نہیں کہا اس نے...... خفا ہو گئی...... گئی۔"

مقصود اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے دردمندانہ لہجے میں کہا۔ "حسن تم نے بہرحال ٹھیک کیا۔ آدمی کو اس معاملے میں ایمان دار رہنا چاہیئے۔"

"مسٹر مقصود!" عزیز بولا۔ "ایمانداری سے جنت ملتی ہے۔ عورت نہیں ملتی۔"

اس نے عزیز اور مقصود کے اختلاف کو نظر انداز کیا اور کہا۔ "یار بات یہ ہے کہ میں رومانٹک آدمی نہیں ہوں۔ اور ہر تجربے کی اک عمر ہوتی ہے۔ میرے تجربے کی عمر پوری ہو چکی۔ ویسے میں عجلت پسند نہیں ہوں۔ میں نے نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں اس مسئلہ پر سوچا ہے اور ایک ہفتے کا مارجن دیا ہے۔"

مقصود نے تھوڑا بیزار ہو کر سوال کیا۔ "اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"میری مراد یہ ہے کہ آج مارچ کی ۲۳ ہے ــــــ یہ مہینہ بہر حال اپنے تجربے کے لیے وقف ہے اس سے کچھ ہوا تو ٹھیک ہے ورنہ میں مہینے کے ختم پر قطعی طور پر اس تجربے کے ختم کا اعلان کر دوں گا۔ آدمی کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ اور میں رومانٹک نہیں ہوں۔"

"بالکل ٹھیک بات ہے۔" عزیز نے تائیدی لہجے میں کہا۔ "بات یہ ہے کہ ہمارے عہد میں محبت کے تجربے کی عمر اتنی طویل نہیں ہو سکتی جتنی مجنوں اور فرہاد کے عہد میں ہو گئی تھی اور ان کے لیے عشق ہول ٹائم جوب تھا، ہم اسے پارٹ ٹائم ہی کر سکتے ہیں اسے لمبا نہیں چلا سکتے۔"

تو اس نے تجربے کو لمبا نہیں چلایا۔ اس نے پھر ایک اطمینان محسوس کیا۔ مگر آج ۳۱ مارچ ہے سامنے اس خیال سے الجھن ہونے لگی کہ مہینہ ختم نہیں ہوا ہے۔ مارچ کی اکتیس اگر مارچ ہی کا حصہ ہے تو میرے تجربے کی میعاد ختم نہیں ہوئی۔ اگر میرے تجربے کی میعاد ختم ہو چکی ہے۔ تو آج کے دن کو، کہ مارچ کی اکتیس ہے کس خانے میں ڈالا جائے۔ گذرتے بسرتے دنوں میں کوئی کوئی دن عجب طرح اڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور کسی خانے میں مقید ہونے سے انکار کر دیتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آج کا دن اُسے کیسے گذارنا ہے۔ پورا دن خالی پن کے سبب ایک پہاڑ کی مثال اس کے سامنے کھڑا تھا۔

اس نے اپنے کمرے کا جائزہ لیا۔ کتابوں پر نظر ڈالی۔ کتابوں کو اس نے کتنے دنوں سے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ الٹ پلٹ کتابوں پر گرد کی تہ جمی

دیکھ کر اس نے سوچا کہ لگے ہاتھوں آج کتابوں کو درست کر کے رکھ دو۔
دیر تک وہ کتابوں کو جھاڑتا رہا۔ جھاڑ پونچھ کر قرینے سے ترتیب دیتا رہا۔
الماری میں کتابیں سجانے کے بعد میز پر بکھری کتابوں کو جمع کیا، سلیقے سے ترتیب دیا
ردی کاغذ کچھ جاک کیے کچھ توڑ مروڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈالے پھر وہ نیلا خط اٹھایا
چونکہ اس خط میں کوئی خاص بات لکھی ہوئی نہیں ہے اس لیے اسے محفوظ رکھنا
بے سود ہو گا۔ اسے کھول کر ایک اڑتی سی نظر ڈالی۔ میں اپنی تنہائی کے جہنم میں
اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتی ہوں۔ یہ خط؟ اسے تھوڑا سا تعجب ہوا۔ یہ تو
بہت پہلے کا خط ہے۔ اب تک میز پر کیسے پڑا ہے۔ اس نے یاد کیا کہ یہ خط
کب آیا تھا اور اس کا کیا جواب دیا تھا۔ میری اکیلی ذات میرا جہنم ہے۔ میں اس
سے نکلنا چاہتا ہوں۔ رومانٹزم۔ وہ حقارت کی ہنسی ہنسا اور اپنے خلاف قرار نما
مذمت منظور کرتے ہوئے اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس نے دانشوری
کا لبادہ اوڑھ کر اس قسم کے کتنے رومانی فقرے اسے لکھے ہوں گے۔
اس خط کو اس نے اچھا خاصا توڑ مروڑ ڈالا تھا کہ اُسے وہ ردی کی ٹوکری
میں پھینکنا چاہتا تھا مگر پھر اس نے یونہی نادانستہ وہ خط کھولا اور پڑھنا شروع
کر دیا۔ یہ خط پورا پڑھنا چاہیے۔ آخر وہ کہتی کیا تھی۔ ایک دفعہ پڑھا۔ آخر کہنا کیا چاہتی
ہے۔ وہ پھر شروع سے پڑھنے لگا۔ اب کے اس نے ایک ایک فقرہ غور سے
پڑھا اور ایک ایک لفظ پر رُکا۔ خط ختم کرتے کرتے اسے ایک مبہم سا احساس ہوا
کہ اس کے اندر جما ہوا میل کچھ کچھ پھٹ رہا ہے۔ پھر اس نے یونہی بے ارادہ اپنے
ہاتھوں کو دیکھا جو کتابیں صاف کرتے کرتے بہت میلے ہو گئے تھے اس نے

ہاتھ رومال سے صاف کیے، پوروں سے خط کو پکڑا اور احتیاط سے لفافہ میں بند کر کے میز پر رکھ دیا۔

ڈھیر ساری کتابیں صاف کرنے اور سجانے کے کام سے وہ تھک گیا تھا۔ یہ تھکن تھی یا شاید وہ اداس ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند ہوئیں تو تصور کا دریچہ کھل گیا۔ نیلے کاغذ پر سجے ہوئے سب لفظ جی اُٹھے اور تصور میں منڈلانے لگے۔ اس کا بے اختیار جی چاہا کہ ابھی قلم سنبھالے اور لفظوں کے جواب میں لفظ لکھے۔ اس کی انگلیوں میں وہی اضطراب بھر جاگنے لگا جو پچھلے دنوں خط لکھنے سے پہلے پیدا ہوا کرتا تھا۔ جب وہ قلم اٹھاتا تو سارے بدن کا جی انگلیوں میں اتر آتا۔ پوروں میں آکر ٹھہر جاتا اور لفظ قلم سے کاغذ پر یوں لکھا جاتا جیسے ہونٹ ہونٹوں پر بوسہ نقش کرتے ہیں۔ مگر پھر اس نے فوراً جھرجھری لی۔ قصہ پاک ہو چکا ہے۔ اب تو میں نے سوچا وہ محض رومانٹسزم ہے تضیعِ وقت ہے۔

اس نے سونے کی کوشش کی مگر تھک جانے کے باوجود نیند نہیں آئی۔ پھر کتاب اٹھائی اور پڑھنے کی کوشش کی۔ بہت سے صفحے پڑھ گیا مگر پھر بیزار ہو کر کتاب بند کر دی۔ اصل میں اس نے اپنے رومانٹسزم پر قابو تو پا لیا تھا مگر لگتا تھا کہ اندر کسی علاقے میں بدستور بغاوت کی آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ جیسے یہ باغی علاقہ اپنی خودمختاری کا اعلان کر دے گا۔ اس نے بغاوت کو سختی سے کچلنے کی کوشش کی اور اپنے ارادے کو پورے شعور کے ساتھ بروئے کار لایا۔ بدامنی پھر بھی قائم رہی۔ جیسے دو سانڈ ہیں کہ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اسے لگا جیسے وہ ٹوٹ رہا ہے۔ جیسے یہ دو سانڈ آپس میں ٹکراتے رہیں گے۔ اور اس کی

مسنی پرچی کر ریزہ ریزہ ہوجائے گی۔ اس لیے، کہ علم و حکمت کے موٹی کتابوں سے چن چن کر اپنی شخصیت تعمیر کی تھی، محسوس کیا کہ اس کے اعضاء تولئی سے جڑے ہوئے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے جوڑ بند کھل رہے ہیں کہ وہ ایک ملبہ بنتا جارہا ہے۔

یکم اپریل

اس نے اس فقیر کی صورت صبح کی جس کے اعضارات کو بکھر جاتے اور صبح کو جڑ جاتے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو اکٹھا کیا اور اطمینان کا سانس لیا کہ مارچ گذر چکا ہے اور وہ صحیح و سالم نکل آیا ہے۔

بستر سے وہ ایک الکسایٹ کے ساتھ اُٹھا، آئینہ دیکھا۔ میلی چیپڑ بھری آنکھیں صاف کرتے ہوئے سوچا کہ کتنے برسوں سے وہ نہیں نہایا ہے۔ تولیہ کاندھے پر ڈال وہ غسل خانے میں چلا گیا۔

نہا دھو کر کپڑے بدلے، بال سنوارے، چلتے چلتے میز کی چیزیں درست کیں، نیلے خط کو بے تکلفی سے دیکھا۔ مٹھی میں مَل ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ پھر باہر نکل گیا۔

جب گھر سے وہ نکلا تو دن چڑھ چکا تھا۔ چاروں طرف دھوپ پھیلی تھی، چار قدم میں نہایا دھویا سب برابر ہو گیا۔ بس کے اڈے پر آ پہنچی خاصی بھیڑ تھی، کئی بسوں کو اس نے یہ سوچ کر گذر جانے دیا کہ ان میں رش بہت ہے لیکن جب رش کسی صورت کم نہ ہوا تو ہمت کی اور مار توڑ کرتا بس میں گھس گیا۔

پسینے میں بھیگے میلے مسافر آگے، پیچھے، دائیں بائیں اس طرح کھڑے تھے کہ سانس لینا دشوار ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ کیا وہ اپنی سفید قمیص کو اس غلاظت بھری بس سے سلامت لے کر نکل سکتا ہے؟

رفتہ رفتہ وہ اپنی سفید قمیص کو بھول گیا۔ پسینے کی لساند دل و دماغ میں اتر رہی تھی۔ اس نے جانا کہ وہ مری ہوئی مکھیوں کے انبار کے درمیان کھڑا ہے۔

ایک بار اس نے پھر بچنے کی کوشش کی۔ ایک مسافر کے اترنے پر وہ پسینے میں شرابور کالے بھجنگ آدمی کے برابر سے ہٹ کر آگے سرک گیا۔ یہ قدرے بہتر جگہ تھی۔ وہ آسانی سے سانس لے سکتا تھا۔ ایک گوری گردن اس کے سانس کی زد میں تھی۔ اس ہرے بھرے پچھائے کو اس نے اوپر سے نیچے تک نظر بھر کر دیکھا۔ پھر نظر ان شاداب لمبی باہوں پر گئی جو کھوے تک کھلی ہوئی تھیں۔ اس جسم کو وہ دیکھتا رہا۔ مگر پھر اسے احساس ہوا کہ اس گلشن جسم کو وہ ایک بے تعلقی سے دیکھ رہا ہے۔ ہرا بھرا پچھایا۔ گوری گردن، شاداب باہیں، قاعدے کی رُو سے یہ سرسبز جسم مجھے اچھا لگنا چاہیے۔ عقل کے اس فیصلے کے بعد ایک مرتبہ پھر اس نے اس گلشن بدن کو نظر بھر کر دیکھا۔ دیکھتا رہا۔ دیکھتے ہوئے طبیعت اداس ہوتی چلی گئی۔ اس آن اُسے احساس ہوا جیسے وہ سالم نہیں ہے، جیسے جمع ہوتے ہوتے اس کا کوئی ریزہ، کوئی کنکی باہر پڑی رہ گئی ہے، جیسے اس کے جہنم کا کوئی انگارہ کہیں باہر پڑا دہک رہا ہے۔ میری ذات میرا جہنم ہے میرے جہنم کے سب انگارے میرے اندر رہنے چاہئیں۔

اپنے جہنم سے باہر نکلنے کی نیت باندھتے ہوئے اس نے سوچا کہ اس بھلی لڑکی

شاکرہ کے اس کے پیچھے دو فون آچکے ہیں۔ خط بھی آچکا ہے۔ اس سے ملنا ہے
اس خیال سے اسے ایک عجب تقویت ہوئی۔ اسے ایک اطمینان سا ہوا کہ
اس کے اکٹھا ہوتے ہوتے جو ریزہ باہر پڑا رہ گیا تھا پھر جڑ جائے گا۔ وہ پھر سے
سالم ہو جائے گا۔ اس نے شاکرہ کے لب اور رخسار کا دھیان کیا۔ قد و گیسو کو
تصور میں لایا۔ خوب لڑکی ہے۔ اور انیسہ؟ عجب کڈھب صورت ہے۔ اس
کڈھب صورت کا تصور کر کے وہ دل ہی دل میں ایک تحقیر آمیز جذبے کے
ساتھ ہنسا۔

شاکرہ کے تصور سے اس میں ایک گرمی آچکی تھی۔ گھر واپس چلو اور اسے
فون کرو۔ اس کا بس ہوتا تو وہ بس کو فوراً رکواتا اور باہر کود کر گھر کی طرف
واپس ہو پڑتا۔ ایک بے تابی کے ساتھ اس نے اگلے سٹاپ کی آمد کا انتظار
کیا۔ سٹاپ آتے ہی وہ بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا دروازے پر آیا اور کود کر باہر نکل
آیا۔

گھر واپس ہوتے ہوئے وہ چند فرلانگ بہت تیز چلا۔ مگر پھر خود ہی اس
کی چال دھیمی پڑ گئی۔ شاید وہ تھک گیا تھا۔ مگر اتنی جلدی؟ یہ سوچتے ہوتے
اسے احساس ہوا کہ اس کے تھکے اعضا کھل رہے ہیں، بکھر رہے ہیں۔
چلتے ہوئے اسے یوں لگا کہ وہ کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جیسے اس کے جسم
کے انگارے رستے میں گرتے بکھرتے چلے جا رہے ہیں۔ میری ذات میرا جسم ہے۔
میرے سب انگارے میرے اندر رہنے چاہئیں۔۔
اپنے گرے بکھرے انگاروں کے ساتھ وہ گھر پہنچا۔ تو شاکرہ کو فون کرنا

ہے۔ اس کا فون نمبر کیا ہے۔ اسے اپنی حماقت پر سخت غصہ آیا کہ اس نے اس کا فون اپنی نوٹ بک میں نہیں لکھا تھا۔ اس نے بڑھ کر ڈائرکٹری اٹھائی۔ ڈائریکٹری کے صفحے الٹتے پلٹتے اس نے سوچا کہ وہ اس وقت گھر پہ ہوگی؟ اگر ہو بھی تو کیا، اس وقت اُسے فون کرنا مناسب رہے گا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ مگر انیسہ کو تو فون کرنے کا سب سے مناسب وقت یہی تھا۔ انیسہ، ٹیلی فون، ریشم کی ڈوری میں ننھی گرہ۔ گرہ پڑ جاتی اور پھر ریشم کی ڈوری کھنچتی چلی جاتی۔ میں اپنی تنہائی کے جہنم میں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتی ہوں اور اس کی نظر ردی کی ٹوکری پر گئی۔ ڈائریکٹری ایک طرف رکھ وہ اٹھا۔ اس مڑے تڑے نیلے خط کو اس نے ردی کی ٹوکری سے یوں نکالا اور یوں اس کی شکنیں صاف کر کے پڑھا جیسے وہ آج ہی موصول ہوا تھا اور پڑھے جانے سے پہلے غلطی سے ردی کی ٹوکری میں چلا گیا تھا۔ اس نے اس نیلے خط کی شکنیں دوبارہ صاف کیں۔ اسے احتیاط سے تہہ کر لفافے میں بند کیا اور میز پر رکھ دیا۔ پھر اس نے اپنی ڈائری اٹھائی۔ یکم اپریل والا صفحہ کھولا۔ لکھا ۳۱ مارچ، اگلا ورق الٹا اور لکھا ۳۱ مارچ۔ پھر وہ ورق الٹتا چلا گیا اور لکھتا چلا گیا —— ۳۱ مارچ، ۳۱ مارچ، ۳۱ مارچ ۳۱ مارچ۔

○

فنون:

مجازی خدا

ننھی بسم اللہ رات بھر سے بھوکی تھی۔

تابی نے جو بچی کو گود میں لیا تو ایک بار ہمک کر اُس نے ماں کی چھاتیوں پر ہاتھ مارا اور زیر پیج سا دودھ جھل جھل رسنے لگا۔ اس وقت بھی ننھی کو دُودھ پلاتی تابی عجیب سی لگ رہی تھی جیسے پانچ کیوبک فیٹ کے فریج میں کسی نے دال کی لبالب بھری ہانڈی رکھ دی ہو۔ انگیا کے بنگلے بانکڑی سے بنے تھے اور پان پر کرن کی جھالر تھی۔ بر وکیڈ کی کٹوری پر غاری سیون صراحی دار موتیوں سے جگمگا رہی تھی۔ ململ کے کرتے تلے ایسی جگمگ جگمگ کرتی انگیا بھی عجیب سی لگ رہی تھی۔ ایک تو ویسے ہی یُوں پورے میک اپ کے ساتھ تابی کا دُودھ پلانا اچنبھے کی بات تھی لیکن یہ کس کو گمان تھا کہ تابی دُودھ پلانے سے پہلے وضو کرے گی؟ آگے نہ پیچھے کبھی وضو کا پانی کہنیوں تک گیا ہی نہ تھا۔ یہ اچانک کایا پلٹ ہوئی کیسے؟

"نالڑاں سے تابی لوٹی تو گلی میں پہنچتے ہی سب سے پہلے اُس کے کانوں میں بسّو کی آواز آئی۔ خدا جانے یہ عرس کی کرامت تھی کہ بسّو کی آواز کا جادو تھا کہ تابی کی بھانویں صورِ اسرافیل پھونکی گئی، اپنے اعمال نامے دکھانے کا وقت آ

پہنچا۔ وہ تھرتھر کانپتی اوپر پہنچی۔ بچّی نہایت ہی بے سُرے پن سے پورا گلا پھاڑے
چیخ رہی تھی۔ کپڑے تبدیل کرنے کا وقت نہ تھا۔ ساڑھی اتارتے ہی اُس نے
جلدی سے ململ کا کرتا پیٹی کوٹ پر پہن لیا۔ اور وضو کرنے بھاگ گئی۔

اس سے پہلے تو تابی نے کبھی وضو کر کے بچّی کو دودھ نہ پلایا تھا۔ پھر یہ
کایا پلٹ ہوئی تو کیسے؟

وہ جھلنگی چارپائی پر پیٹی کوٹ کرتے میں ملبوس بڑے پیار سے بچّی کو گود میں
لیے بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر وہی ملکوتی معصومیت تھی جو مائیکل انجلو کی میڈونا
کے چہرے پر ہوا کرتی ہے۔ سامنے اچاری آموں سے لدا ٹرے اور بالٹی بھر پوسی
پڑی تھی۔ یہ وقت تخلیے کا تھا لیکن نادر بغیر کھانسے، بنا دستک دیے مستول کی
طرح آکھڑا ہوا۔

دراصل رات کو تابی کا ارادہ نالڑاں جانے کا نہ تھا۔ ننھّی بسم اللہ سے
اُسے واقعی بہت پیار تھا اور وہ اسے ساری رات چھوڑنے کے لیے رضامند
نہ تھی۔ کچھ اُس کی اپنی طبیعت بھی اداس تھی۔ لیکن نادر شاہ کی لچھے دار باتوں کے
دم میں وہ آ ہی گئی۔ کئی سالوں سے وہ شریف شاہ کے عُرس پر مجرا کرنے جا رہی
تھی اور اُسے ایسے لگتا تھا جیسے یہ گھر بار، بسم اللہ، عزت، دولت سب شاہ
ہی کی دعاؤں کے طفیل ہو۔

نادر نے ٹسر کا فیروزی تہمد باندھ رکھا تھا۔ گلے میں موتیے کا لمبا سا ہار تھا۔
وہ پردہ اٹھائے بیمرغ بنا کچھ دیر کھڑا رہا۔ کمرے میں رات بھر کی گرمی نل سپیڈ
پنکھے کے تھپیڑے کھا رہی تھی۔ تابی کو نادر کی آمد کا احساس اُس وقت ہوا جب

وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ تابی کے پاس بیٹھ گیا سارے کمرے میں نادر کی مردانہ خوشبو پھیل گئی۔ تابی نے کرتے سے بچی کا منہ ڈھانپ لیا اور نادر کی جانب پیٹھ کر لی۔ نہ جانے آج اس سفلے پر تابی کو کیوں شدید غصہ آ گیا۔ تابی کو یوں بچی کا منہ ڈھانپتے دیکھ کر نادر بڑے کھردرے پن سے ہنسنے لگا۔

نہ جانے یہ شریف شاہ کے عرس کی برکت تھی؟

خدا جانے یہ نادر کے ملائم قہقہے کا اثر تھا؟

کون کہہ سکتا ہے کہ ننھی لبو کے دودھ میں بھیگے ہونٹ بھینچے دیکھ کر تابی کو اپنے آپ سے شدید نفرت ہو گئی۔

نادر کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ تابی سیخ پر لگے کباب کی طرح بھن رہی ہے۔ کتھئی رنگ کے ہاتھ بڑھا کر انگیا کے پچھوار کساوٹ کھولی اور آہستہ آہستہ ڈوری یوں کھولنے لگا جیسے نلکے دانی ڈھیلی کر رہا ہو۔

"دودھ پینے دو بچی کو ——— رات بھر سے بھوکی ہے۔"

"ہم بھی رات بھر کے بھوکے ہیں" وہ بے شرمی سے ہنسنے لگا۔

اپنے خلاف، نادر کے خلاف اور نہ جانے کس کس کے خلاف لمحہ بھر میں دیوارِ چین تعمیر ہو گئی۔ نعل در آتش تابی نے کیوٹکس لگی انگلیوں کا بھرپور ہاتھ اس زناٹے سے نادر کے مارا کہ وہ اپنا ٹسر کا تہمد سنبھالتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"بات کیا ہے؟ ——" اس نے خفت اور غصے کے ملے جلے جذبات سے پوچھا۔

"کوئی بات نہیں ہے بس جاؤ اور پھر کبھی نہ آنا ———"

"نشہ تو نہیں ہو گیا تجھے؟ ——"

"ہو گیل ہے —— تُو جا!"

"دیکھ لے پچھتائے گی۔ شہر کے سارے دل پھینک میری مٹھی میں ہیں۔"

نادر نے بالوں بھری مٹھی اُسے دکھا کر کہا:

"بھاڑ میں جائیں تیرے دل پھینک اور تُو! ——"

نادر نفریں بھرے قہقہے لگاتا سیڑھیاں اُتر گیا۔

اس وقت تک نہ تو تابی کو علم تھا اور نہ ہی نادر کو شبہ ہوا تھا کہ تابی اپنی پچھلی زندگی کو تیاگ رہی ہے لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے تابی کے کچے زخم پر کھرنڈ نہ بندھا بلکہ اور دن بہ دن پیپ پڑنے لگی۔ جو بات یونہی دل کو ڈس گئی تھی اب پٹہ خانگی بنا کر اُس نے دل کے سیف میں رکھ لی۔

نادر کا خیال تھا کہ تابی گیلا بارود ہے چند دن فراق کی کڑوی دھوپ سینکی گئی تو آپ ہی سلگ اُٹھے گی۔ کوئی کورا پنڈا تو تھا ہی نہیں کہ مرد کی شناسائی کے بغیر رہ سکتا لیکن جب کافی دن گزر گئے اور تابی کا کوئی پیغام نہ ملا تو وہ خود ہی کچھ شرمندہ، کچھ محجوب، کچھ مشتاق سا کوٹھے پر گیا۔

تابی کو دیکھ کر نادر کا دل تڑاقا کھا گیا، نہ بالوں میں فتح پیچ تھے نہ کپڑوں میں دھنک کی سی کیفیت تھی۔ نقلی اصلی سب لٹیں غائب۔ رانڈوں کی طرح بال کھینچ کر جوڑا کسا ہوا۔ نہ وہ پُھندنے دار سینڈلیں، نہ ناخنوں پر رنگ برنگی کیوٹکس۔ نہ کانوں میں پتّے بالیاں نہ ہاتھوں میں آرسی انگوٹھیاں نہ گلے میں رانی ہار۔ ہاتھ سے ننگی بُوچی —— تابی کی جگہ وہ ایک خصی بکرا نظر آتی تھی۔

نادرہ نے بہت سر مارا۔ منتیں کیں، سمجھایا، واسطے دیے، دھمکیاں دیں۔ لیکن اُس کی باتیں سُن کر وہ اور بھی بھپر گئی۔ تابی کو ایسی ضد چڑھی تھی کہ قسم کھالی برتن مانجھنے منظور، روڑی کوٹنے کا پیشہ سر آنکھوں پر، جھاڑو بہارو بچہ نا قبول، لیکن پھر حرام کاری کا دھندا نہ کرے گی۔ اِدھر تابی نے سونا سوگندھ کھائی، اُدھر سارے ہیرا منڈی میں جیسے متفرقی باتوں کے غبارے اُڑنے لگے۔ بنگلے کی خورشید جہاں نے چوری چوری دیگ چڑھائی اور دربار بھجوادی۔ عرصے سے اُس کے سارے گاہک کسی چور راستے سے تابی کے کوٹھے ایسے چڑھتے کہ پھر وہیں کے ہو رہتے۔ چھ کی والی نازو نے برقع اوڑھا اور محلّے محلّے وہ تو تیے جوڑتی پھری کہ افواہ کو ہیٹ طیّارہ کی اُڑان لگ گئی ــــ

جتنے منہ اتنی باتیں ــــ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ ــــ!

پنکھے کی تیز ہوا میں جاپانی ہوا والا کیلنڈر آنچل کی طرح لہرا رہا تھا۔

حمیدہ کے گریبان میں منہ دیے ننّھا سا جاوید چُپڑ چُپڑ دودھ پیے جا رہا تھا۔

حمیدہ کی گردن پر پسینے کے قطرے سونف کے گچھّوں کی طرح اُبھر آئے تھے۔ اُس نے جاوید کی پیٹھ میں دھموکا مار کر اُسے پرے کیا اور شیخ جی کے ہاتھ پر انگلی بجا کر بولی ”سُنیے ذرا ــــ! اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔ ڈاکٹر سے ضرور کوئی دوا لے کر آئیں کل ــــ“

”اتنے سے بچّے کے پیٹ میں کیڑے! ناصرا تو حمیدہ کے پیٹ میں ہوں تو ہوں ــــ“

”سارا دن میری جان نہیں چھوڑتا۔ نہ دن کو آرام ہے نہ رات کو۔ اس کے پیٹ

میں کیڑے ہیں ورنہ رات کو تو سو مر جاتا!" جاوید بڑی ڈھٹائی سے اب حمیدہ کی پشت سے چمٹا ننھے ننھے ہاتھوں سے اُس کی چوٹی کو چوس رہا تھا۔

"میں تو جب تک اس کے ساتھ لیٹی رہوں گی یہ میری بوٹیاں نوچتا رہیگا۔"

"اِدھر آجاؤ میرے پلنگ پر ــــ" شیخ جی نے لجاجت سے التجا کی۔

لیکن حمیدہ اُٹھ کر ناصر کے ساتھ لیٹ گئی۔ نہ جانے کیوں اُسے شیخ جی کے تھل تھل وجود سے گھن آتی تھی۔ گہری نیند میں جب اُن کا مُنہ کھل جاتا اور خراٹوں کی ڈاک بیٹھ جاتی تو حمیدہ کو اُن سے بڑی نفرت پیدا ہو جاتی۔ وہ تو قدرت کی ستم ظریفی سے وہ حمیدہ کے نان نفقہ کے کفیل تھے ورنہ حمیدہ کبھی اس پلنگ کا کنارہ بھی نہ چھوتی ــــ اللہ ماں باپ نے بھی کیا دیکھ کر بیاہ دیا۔

جب حمیدہ ناصر کے پلنگ پر چلی گئی تو ننھے جاوید نے پہلے زقند بھری، پھر چیخ ماری اور تھوڑی دیر منہ کھول کر روتا رہا۔ شیخ جی نے اپنا بھاری ہاتھ اُس کی پُشت پر رکھ دیا اور بڑی دیر تک تھپکتے رہے۔ جب نیند کا پورا غلبہ ہو گیا تو جاوید غلاف کے کونے پھوٗلتا آہستہ آہستہ سو گیا۔

ناصر کے ساتھ سر جوڑ کر حمیدہ بولی ــــ "اِس بار پھر آپ ہمیں شریف شاہ کے عُرس پر نہیں لے گئے ــــ ہاں!"

"جاوید چھوٹا ہے۔ اگلے سال سہی۔"

"ہر سال آپ یہی کہتے ہیں۔"

"خُدا قسم صرف جاوید کی وجہ سے نہ لے گیا ورنہ اس بار نوشاہ صاحب بھی تمہارا پوچھتے تھے۔"

عُرس کی ایک ایک بات، ایک ایک لمحہ شیخ جی کی نظروں میں گھومنے لگا۔ بازو اُٹھا اُٹھا کر گاتی اور گاتے ہوئے پلٹ پلٹ کر دیکھتی ٹیارتابی بے طور اُنھیں یاد آنے لگی۔ ایسی دبنگ مُنہ زور جوانی ـــــ اللہ اللہ اللہ!

تابی کو پیشہ کرتے صرف پانچ سال ہوئے تھے۔ لیکن اس تھوڑے سے عرصے میں اس لکّہ قیامت کی شہرت خمیر کھلئے ہوئے گھوڑے کی طرح بہت دُور نکل چکی تھی۔ شہرت کو چھوڑیئے وہ تو ہوئی سو ہوئی لیکن آتی نامور طوائف نے جب پیشہ چھوڑنے کی ٹھانی تو کوئی بھی عاشق منصہ شہود پر نہ اُبھرا جو اس کے ماتھے کا سیس پھول بن کر باعزّت بیاہتا زندگی گزارنے کے لیے ساتھ دیتا۔ ہولے ہولے جہاں پہلے مجرا بجتا تھا اب وہاں بالا پڑ گیا۔ سارا دن ننّھی ببتو کو گود میں لیے پہاڑ سے دن کاٹنے لگی۔ کہاں تو شام کے وقت دیدار کے طالب پرے سے پرا لائے بیٹھے ہوتے تھے کہاں اب بیٹھک میں سوائے گاؤ تکیوں کے اور کوئی بیٹھنے والا نہ رہا۔

اپنی بستی والیوں سے قطع تعلق کرنے کے بعد کچھ روز تو تابی کو یہ سکون ملا کہ نت نئے قصّوں اور بھانت بھانت کی نصیحتوں سے چھٹکارا ہو گیا لیکن جب تابی مکمل ٹابو بن گئی تو دن کی بے مصرف طوالت سے اس کا جی گھبرانے لگا جب سے تابی نے سیج چڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ آپو نے چُپ سادھ لی تھی۔ یہ دونوں میں محض رسمی سی گفتگو ہوتی اور تابی کے دل پر ہر بار چوٹ سی پڑتی۔ اُس کا جی کہتا تو صاحب اچھی نیکی کی راہ پکڑی سب نے ٹکسال باہر کر دیا۔ کہاں تو لوگ آنکھوں

پر بجلیاں نے گرتے کہاں اب منہ پر مکھی تک نہیں جھولتی۔

جس دن خورشید علی پروانہ اس سے ملنے آیا وہ اُداس اور خاموشی کے دباؤ سے مجبور ہو چکی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کوئی اس کے اس فعل کی تعریف کرے۔ کوئی تو کہے شاباش تابی بچا ہے بدیر بہ راہ اختیار کی لیکن جزاک اللہ بہت خوب کیا۔ پروانہ صاحب زندگی میں بھی بڑی اُونچی باتیں کرتے تھے۔ تابی اُن سے دادِ تحسین وصول کرنے کے لیے نیچے اُتری اور بیٹھک میں اُنھیں بلا لیا۔ پروانہ اس کے کوٹھے پر ہمیشہ مہمان خصوصی بن کر آتا تھا۔ رخصتی کے وقت دامن چوم کر خدا حافظ کہتا۔ اُس نے طوائف کے عنوان سے تابی پر ایک سہ غزلہ بھی لکھا تھا جس میں اس نے طوائف کو ہمالہ کی برف، سیپ کے موتی، اچھوتے خواب اور بہشت کی حور سے تشبیہہ دی تھی۔ اس سہ غزلہ کے چیدہ چیدہ اشعار وہ عموماً مجروں میں گاتی بھی رہی تھی اور پروانہ صاحب اُسے اپنے لیے باعث عزت بھی سمجھتے رہے تھے۔ پروانہ صاحب کو دیکھ کر تابی کا دل رقت، انفعال اور دُکھ سے بھر گیا۔ اُسے اپنے آپ پر اس شدت سے ترس آیا کہ سلام کا جواب دیتے ہی اُس نے پروانہ صاحب کے پاؤں پکڑ لیے اور گڑگڑا کر بولی: "پروانہ صاحب مجھے بچا لیجیے —— خدا کے لیے مجھے بچا لیجیے ——"

پروانہ صاحب آدمی بلبلے تھے۔ تابی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھاتے ہوئے بولے —— "صاحب ہم آپ کو کیا بچائیں گے۔ کیا پدی کیا پدی کا شوربہ"۔ تابی پر نیک باعزت بیوی بننے کا بھوت سوار تھا۔ اپنے مدعا کو غلافی صورت میں پیش کرنے کا صبر کہاں جھٹ کہہ بیٹھی: "پروانہ صاحب آپ مجھ سے نکاح کر لیجیے۔ خدا!

قسم حج اکبر کا ثواب ہو گا۔

پروانہ صاحب کنی کھا کر دور جا بیٹھے اور گاؤ تکیے کے پھندنے ادھیڑنے لگے۔ جب بہت دیر تک وہ یونہی بیٹھے کنیاتے رہے اور منہ سے کوئی بات نہ نکلی تو تابی ایک بار پھر ہمت کر کے اُن کے پاس جا بیٹھی اور بڑی بے چارگی سے بولی ——

"کیوں پروانہ صاحب، میری بات کا کیا جواب ہے؟ ——"

کہاں تو چپ چاپ بیٹھے پھندنے اُدھیڑ رہے تھے اور کہاں ایک دم کسی منبر سے پھٹ پڑے "کاش تم نے صبر کیا ہوتا۔ یہی بات میں خود تم سے کہنے والا تھا۔ لیکن تم نے سب کچھ چھوڑا۔ کسبیوں والی بے شرمی نہ چھوڑی۔ تُف ہے ایسی عورت پر جو زیورِ حیا سے آراستہ نہ ہو ——"

تابی کو اپنی جلد بازی اور بے حیائی پر بہت غصہ آیا۔ تلملا کر بولی —— "کیوں پروانہ صاحب میں نے کونسی بے شرمی کی ہے بھلا؟ آپ سے نکاح کی درخواست کی ہے کوئی رات گزارنے کے پیسے تو طلب نہیں کیے۔"

"اور یوں نکاح کا خواستگار ہونا کیا بے شرمی نہیں بے حیائی نہیں —— —— استغفر اللہ!"

"پہلے ہی چوسے پر جو گال کاٹا گیا تو پھر تابی میں کسی سے عرضِ مُدعا کی ہمت ہی باقی نہ رہی۔ آپ سے بول چال پہلے ہی بند تھی۔ محلّے والیوں نے اُسے اصل کی نہ پاکر ویسے ہی ترک کر رکھا تھا۔ نادر سے معاملہ یوں ہی چوپٹ ہو چکا تھا۔ زندگی گرمیوں کی دوپہر ہو گئی۔ اُٹھتے بیٹھتے خیال آتا کہ یہ پارسائی کی چادر کب تک گرمی دے گی، اگر کسی کا ساتھ نہ ملا تو ٹھٹھر ٹھٹھر کر جوانی کی سرد رات کب تک کٹے گی؟

پھر بچی پر نگاہ پڑتی تو دل دھک سے رہ جاتا۔ اللہ میں تو بار سا بن گئی۔ یہ بن باپ کی بچی کس کی کہلائے گی، جوان ہو کر کہاں جائے گی، کہاں سے کھائے گی؟ خود میری زندگی کا کیا بنے گا؟ جس رفتار سے وہ بینک کے چیک کاٹ کاٹ کر دے رہی تھی اس رفتار سے تو سارا اثاثہ دنوں کا کھیل تھا۔

اللہ، آمدنی کی صورت نہیں اور اخراجات حمل کی صورت ہر دن چڑھے دونے ہوتے جاتے ہیں۔

ایسی ہی باتوں نے جب تابی کی زندگی کو کڑکڑا کر دیا تو ایک شام وہ اٹھی اپنا نیلا پیڈ نکالا۔ اُس پر فرانسیسی خوشبو چھڑکی نادر کو پشیمانی بھرا محبت نامہ لکھا اور نیچے اتری۔ حویلی نما مکان کی نچلی منزل میں تین دوکانیں تھیں اور ایک کمرہ تابی نے طبلچی فتح دین کو دے رکھا تھا۔ فتح دین طبلہ بجانے کے علاوہ سودا سلف لانے اور گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے کام بھی آتا تھا۔ جب وہ فتح دین کو خط پکڑانے نیچے جا رہی تھی تو سامنے شیخ جی نظر آ گئے۔

تابی نے پچھلی مروّت کے مارے سلام کو ہاتھ اٹھایا۔ شیخ جی مسکراتے مسکراتے آگے آ گئے۔ اخلاقی جرأت کی تابی میں کمی تھی ورنہ اُسے ڈیوڑھی سے نکال دیتی۔ ہنس کر ایک طرف ہو گئی اور شیخ جی اندر آ گئے۔

اور ـــــ تابی کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔

حمیدہ نے دمّو کا مار جاوید کو یوں دھکا دیا کہ بھوہے برابر بچہ نالی میں گرتے گرتے بچا۔ خالہ اصغری نے ناک پر انگلی رکھ کر اُسے فوراً ٹالنا ـــــ کیوں اپنا غصہ

اس بے زبان پر نکالتی ہو۔ میں تمھاری جگہ ہوتی تو اُس بدبخت نابی کی آنکھیں نوچ لیتی۔ پر تم کو تمھاری نیکی نے مارا ۔۔۔ ہاں۔"

حمیدہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تلیٹی میں بڑھنے والی چھاؤں کی طرح آکر بیٹھ گئی۔ خالہ اصغری نے پیڑھی کو جو تڑوں سے گھسیٹ کر اُس کے قریب کر لیا اور رازداری سے بولیں ۔۔۔ "بھئی تم نام خدا معصوم ہو، دین دار ہو، اچھے خاندان کی ہو تم کو مردبھیا نے کہاں آئیں۔ یہ طوائفیں تو سارے موہنی منتر جانتی ہیں۔ جانے کیا تعویذ گنڈا کر دیا ہے اس چلتر باز نے شیخ جی پر!"

تلیٹی کی چھاؤں ساون کے بادلوں میں بدل گئی اور بوندا باندی ہونے لگی۔

"یہ تو سفلی کام ہیں، سفلی کام انہی لوگوں کو آتے ہیں۔ گھر کی شریف بیبیاں ان باتوں کو کیا جانیں۔ لیکن بھئی اتنا میں ضرور کہوں گی، خبردار رہو وہ نہ ہو، شیخ جی نکاح ہی پڑھوا لیں اُس کٹنی کے ساتھ!"

حمیدہ دانتوں میں تنکا لیے نگھری بیٹھی تھی۔ نکاح کے نام پر کسمسائی۔ ایک روز شیخ جی کا اُس سے بھی نکاح ہوا تھا۔ آج بھی اُس دن کے تصور سے اُسے اُبکائیاں سی آنے لگیں۔ اللہ اُسے تو پہلے دن سے شیخ جی بُرے لگے تھے، موئے بھدے سے۔ اُزبک سے! کہیں جو اُن سے رزق کی ڈوری نہ بندھی ہوتی تو ۔۔۔ لیکن اب تو بندھی تھی اسی لیے وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ اللہ نہ کرے خالہ جو کہیں نکاح ہی پڑھوا لیا تو میں یہاں کیوں رہوں گی؟"

خالہ اصغری سے عطر پھلیل کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ کانوں میں موتیا کے پھول، ہونٹوں پر لاکھا رنگ دنداسے کی رنگت، بڑی طرحداری سے کلیوں

کا ہلکا پھلکا ریشمی برقعہ اُٹھا کر بولیں "تمھاری رہتی ہے جوتی ؛ اُن کو کسبی پیاری ہے تو پھر تم کیوں دین ہاتھ سے جانے دو۔ کل کو اس حرّافہ کی اولاد تمھاری اولاد بہن بھائی ہی تو کہلائے گی۔"

برستے بادلوں میں سے بجلی کڑکی ۔۔"ہائے اللہ نہ کرے، ہائے اللہ نہ کرے توبہ خالہ مُنہ سے کچھ تو بھلی بات نکالا کرو ۔۔۔"

"بھئی میں تو کشمیری بازار جا رہی ہوں ۔۔۔ کلیجہ پھٹا جا رہا تھا تمھارے دُکھ سے، دل میں سوچا حمیدہ کو ملتی جاؤں، کہو کچھ منگوانا تو نہیں کشمیری بازار سے؟"

خالہ اصغری گئیں تو پھوپھی جمال آرا آ گئیں۔

دو گھنٹے وہ بیٹھی باز پُرس کرتی رہیں اور حمیدہ تل نظری بنی گُم سم بیٹھی رہی۔ دراصل یُوں تو شیخ جی سے ہیرا منڈی کا تعلق پُرانا تھا، لیکن اس رابطے کو سوائے حمیدہ کے اور کوئی نہ جانتا تھا۔ بلکہ حمیدہ کو تو اُلٹا سُکھ تھا۔ گند سنبھالنے کو کوٹھے والیاں اور سُکھ پانے کو حمیدہ ۔۔۔ لیکن کچھ عرصہ سے وہ تابی کے ہاں بڑے تواتر سے آنے جانے لگے تھے۔ جیسے تیز گام وقت مقررہ پر آتی ہے۔ اِدھر دودھ والے کا رِیڑھا گلی میں داخل ہوتا، اِدھر شیخ جی سیاہ اچکن، جناح کیپ، پشاوری چپّل پہنے نکڑ پر پہنچتے۔ دودھ والا اسلام کرتا، اِدھر سے سر کے اشارے سے جواب ملتا۔ علیک سلیک ہوتی۔ لیکن اتنی صبح نہ کدھر سے آتے ہیں، اس بات کا بھید کچھ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ لوگوں نے بہت جلد خطوط وحدانی میں چھُپے ہوئے راز کو پا لیا۔ بات کا نکلنا تھا کہ حمیدہ کے لیے ہمدردی کا ایک انوکھا باب کھُل گیا ہائے ہائے تُف تُف بیچاری ماری گئی، اوئی اللہ ہائے اللہ توبہ نوج ....

کی بوچھاڑ سے حمیدہ کے دل کا آنگن بالکل بھیگ گیا۔

سانپ تو نکل گیا مگر راستہ ٹیڑھا پڑا۔ تابی نے بازار حسن بھی چھوڑا اور شیخ صاحب کی بیوی بھی نہ بن سکی۔ بیٹھے بیٹھے جی میں خیال آتا کہ وہ نہ ہو سو جوتیاں بھی کھانا پڑیں اور سو پیاز بھی زہر مار کرنا ہوں۔

شیخ جی چالیس کے پیٹے میں تھے اور تابی کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ ایک تو عمر میں بیس برس کا فرق تھا۔ دوسرے شیخ جی کی صحت بالو کا ڈھیر تھی تھپتھپا کر کے گھر بناتے، ادھر دو بوند پانی کے پڑتے اور رارارار دھم ساری عمارت زمین پر۔ چھینک کیا آتی سارا سینہ بلغمی ہو جاتا۔ ذرا سی سردی پڑتی اور جوڑ جوڑ میں ورم آجاتا۔ بند بند دکھنے لگتا۔ کبھی سانس اکھڑا ہوا ہے کبھی نسیں کھنچی چلی جاتی ہیں۔ کاٹھی اچھی تھی، شکل وصورت بھی بھولی بھالی تھی پر ایسے تناور درخت کو اندر ہی اندر دیمک نے چاٹ لیا تھا۔ نال بکھانے جیسی رنگت اور عناب کے ہونٹوں والی تابی اُن کی پوتی لگتی۔

عجیب سی بات تھی کہ نہ تو شیخ جی کی صحت پر تابی کو کوئی اعتراض تھا نہ اُن کی عمر پر ــــــ اُسے تو اُلٹا یہی اُن کی خوبیاں لگتی تھیں۔ ایسے بیمار شخص کو کسی ساتھی کی ضرورت تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ شیخ جی تابی کو ساتھی تو بنائے ہوئے تھے پر نکاح کی بات دو سال سے کھٹائی میں پڑی تھی۔ نکاح کا وعدہ تو شیخ صاحب نے بڑی فراخدلی سے کیا تھا لیکن آج کل کرتے دو سال بیت گئے۔ کبھی تابی کے منہ سے نکاح کا نام سن لیتے تو فوراً کھوں کھوں کرنے لگتے۔ فوراً یا تو سردی لگ جاتی

پانوڑوں کا درد اُبھر آتا۔

شیخ جی کچھ ایسے بد نیت بھی نہ تھے۔ پر فی الحال اپنے آپ کو پابند بھی نہ کرنا چاہتے تھے۔ ہر طرح سے تابی کا خیال رکھتے۔ ننھی بستو سے باپ کی سی محبت برتتے۔ خرچ اخراجات کے وہی کفیل تھے۔ پر جس کو مفت دودھ ملے وہ بھینس کا جھنجھٹ کیوں پالے؟ ادھر تابی کو کھونٹے سے بندھنے کا ایسا سودا ہوا تھا کہ دن رات یہی دُکھ کھائے جاتا کہ یہ زندگی پہلے سے بھی بلبلیہ ہے۔ رہ رہ کے سوچتی کہ شیخ جی کے ٹکڑوں پر پلنے سے تو بہتر تھا کہ اپنی جوانی پر اعتبار کیا ہوتا۔ وادی سم وادی سروں کی سمجھ تھی، گلے میں قدرتی سر تیاں بھری تھیں۔ شکل و صورت بھی کشمیرنوں جیسی گوری چٹی ——— کچھ دیرا اور لیلاوتی بنی رہتی تو کم از کم کچھ اثاثہ ہی جمع ہو جاتا۔ پھر یہ اطمینان ہوتا کہ جو ظاہر ہے وہی باطن ——— جیسی باتیں ہیں ویسے ہی اعمال۔

بیچاری تابی کی تو یہی حالت ہو چکی تھی کہ کھوں تو ماں ماری جائے نہ کھوں تو باوا کُتا کھائے۔ ادھر شیخ جی سے اُسے ستی ساوتری جیسی محبت ہو چکی تھی۔ شیخ جی کو دیکھ کر سارے پاپ کٹ جاتے، سارے گلے بھول جاتے۔ لیکن جب اکیلی ہوتی تو ضمیر ڈستا۔ یوں داشتہ بنی رہنا اس کے ضمیر کے منافی تھا۔ ادھر آپو سارا دن اُسے طعنوں سے گانستی رہتیں۔ اس رسّہ کشی کو تابی اندر ہی اندر برداشت کرتی رہی۔ لیکن ایک روز اُس کا کلیجہ شق ہو گیا۔

اس روز تابی کو بُلبلا کر بخار چڑھا۔

بستو ماں کو پلنگ پر بے سُدھ لیٹے دیکھ کر بات بے بات ضد کرنے لگی۔ کبھی یہ دو کبھی وہ لے دو۔ نوکرانی پل پل باہر لے جاتی لیکن ہر بار بستو کہتی ———

نیئں نیئں نیئں۔۔۔۔ آخر پتہ چلا کہ کہیں ہمسائے ہیں نئی گڑیا دیکھ لی ہے کسی کی وہ مانگتی ہے۔ شیخ صاحب تابی کی کلائی پکڑے کرسی پر بیٹھے تھے تھک ہار کر تابی بولی۔ بسم اللہ کو شیخ جی انار کلی لے جائیے اور ویسی گڑیا دلوا دیجیے۔ اس کا رونا سن سن کر تو سر پھٹنے لگا ہے۔"

انار کلی بازار کا سنتے ہی بٹو لپک کر شیخ جی کے کندھے سے چمٹ گئی اور تب تک چمٹی رہی جب تک گال پر کالر کی لکیریں نہ پڑ گئیں۔ تابی تو حکم لگا کر مطمئن ہو گئی لیکن شیخ جی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ تابی یا بٹو کو لے کر وہ آج تک کہیں باہر نہ گئے تھے۔ کھنکار کھنکار کر بہانے بناتے رہے۔ کبھی کہتے اس حال میں تمھیں چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ کبھی کہتے اب تو شام ہو رہی ہے ابھی بچی سو جائے گی۔ شیخ جی نے بہت پینترے مارے مگر تابی کو آج بسم اللہ کی ضد بہت پیاری تھی۔ بال ہٹ میں تریا ہٹ بھی شامل ہو گئی۔

بخار میں تپی ہوئی آنکھیں کھول کر تابی نے پوچھا "ہیں بات کیا ہے آپ بچی کو لے جاتے کیوں نہیں؟۔۔۔۔"

بوکھر کے نتھرے پانیوں میں انگارے دہکتے دیکھ کر شیخ جی بدک گئے اور اٹھ کر کھڑکی کی طرف چلنے لگے۔

"آپ سچ سچ اصلی وجہ بتا دیں شیخ صاحب ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

شیخ صاحب کو سچ بولنے کی عادت نہ تھی مگر تابی کے مزاج سے خوب واقف تھے۔ سہتے سہتے لہجے میں بولے "بھلا میں اسے کیسے انار کلی لے جاؤں؟ کوئی واقف ہی مل گیا اگر؟ ساری بات کھل جائے گی۔۔۔۔"

اب تک تابی نے عطر کے پھوئے کی طرح شیخ جی کے ساتھ محض خوشبو بھری باتیں کی تھیں، یہ جواب سنتے ہی وہ کٹ گئی۔ کچھ بخار سے تمتائی بیٹھی تھی۔ کچھ غصّے نے آنچ دی شعلہ جوالا بن کر پلنگ سے نکل آئی۔

شیخ جی اس بپھری ہوئی پلنگ زادی کو دیکھ کر دس قدم پیچھے ہٹ گئے اور کھڑکی کے شیشے کو ٹن کا ٹن کا کر بینڈ بجانے لگے۔ اُن کا خیال تھا "ننھی" کو یوں بہلاتے دیکھ کر تابی کا دل پسیج جائے گا۔ لیکن جوار بھاٹا بڑھا چلا آرہا تھا۔

"کیا بات کھُل جائے گی شیخ جی؟ ---"

شیخ جی نے سُنی پھر اَن سُنی کر دی اور نشادو کو گانا سنانے لگے۔

"میری طرف دیکھیے شیخ صاحب میری طرف ---"

"تم کو بخار ہے خواہ مخواہ بستر سے نکل آئی ہو ---"

"آپ بخار و خار رہنے دیجیے، ایسی ہمدردیاں بہت ہو چکیں۔ میری طرف دیکھیے ---"

بڑے تردّد سے شیخ جی نے تابی سے نظریں ملائیں۔

"آپ کا بسم اللہ سے رشتہ کیا ہے؟ ---" تابی ترشول کی طرح تنی کھڑی تھی۔

"بیٹی ہے --- کمال ہے یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے!"

تابی غصّے میں کانپ رہی تھی۔ سنگار میز کا سہارا لے کر بولی۔ "اور مجھ سے آپ کا رشتہ کیا ہے شیخ صاحب؟"

"یہ آج تمھارے سر پر سنیچر کیوں سوار ہو گیا ہے ---؟" شیخ صاحب اہل

موضوع پر جبین جمائے رکھنا چاہتے تھے۔

میرا آپ کا رشتہ کیا ہے؟ ــــ تابی اب اُن کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ــــ"

"آپ کے نزدیک تو بالکل اہم بات نہیں لیکن میری تو جان پر بن آئی ہے۔" تابی چیخ کر بولی۔

"ہاں ..... تم ..... میری بیوی ہو تابندہ! آج تمھیں ہو کیا گیا ہے، خدا کے لیے لیٹ جاؤ، ہرا الگ جائے گی۔"

چراغ پا تابی بولی ــــ "بیوی تو ہوں شیخ صاحب لیکن بغیر نکاح نامے کے ــــ میں نے تو کسبی پن چھوڑ کر بھی پیشہ ہی کیا۔ لیکن آپ کو شرم نہیں آتی آپ تو بڑے دین دار، وضع دار معزز شہری ہیں۔"

شیخ جی بسم اللہ کو کندھے سے لگائے کھڑکی کے پاس بیٹھ گئے اور یہ موٹے موٹے آنسو گرانے لگے کہاں تو تابی بھری لہر بن کر اٹھی تھی اور کہاں دیسی صابن کی جھاگ بن کر بیٹھ گئی۔ موٹے موٹے آنسو اور وہ بھی شیخ جی کی فربہ گالوں پہ تابی انھیں گھر بدر کرنے کا سوچ رہی تھی لیکن بھاگ بنکر اُن کے پاس جا بیٹھی اور آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔

"شیخ جی کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔ لائیے بسم اللہ کو مجھے دے دیجیے۔"

شیخ جی نے بتو کو اور بھی بھینچ کر سینے سے لگالیا اور ناک سے نسلک نسلک کی آوازیں نکال کر رونے لگے۔ تابی بے تاب ہو کر کمرے میں پھرنے لگی۔ اُسے سمجھ نہ

آرہی تھی کہ اپنے سے بیس برس بڑے مرد کو کیسے جیب کرا ئے ہیں۔ ویسے بھی اُسے اب شیخ جی اتنے اچھے لگنے لگے تھے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پشیمان نہ ہونا اس کے اختیار کی بات نہ رہی تھی۔ ادھر شیخ جی گلے کا گھنگرو بجا بجا کر کہہ رہے تھے "خدا قسم میری نیت نیک ہے مجھے تمہاری قسم تابی نکاح میں ضرور پڑھوا لوں اور پڑھواؤں گا بھی، لیکن کیا کروں جس علاقے میں تم رہتی ہو — وہاں ..... وہاں رہ کر ایسے کیونکر ہو سکتا ہے۔ اگر کہیں تم باہر مکان لے لو تو ..... تو کیا مجال جو میں رتی بھر حیل وحجت کروں۔ خدا قسم تابی —"

تابی واپس پلنگ پر چلی گئی جیسے ایک سوچھ بخار میں برف کا غسل لے چکی ہو آہستہ سے بولی — "شیخ جی آپ نے پہلے کیوں نہ کہا۔ میں آج ہی سید و دلال کو بلا کر گلبرگ میں کوٹھی لے لوں گی۔ خرچ ورچ آپ کے ذمے نہیں ہوگا۔ جب نہ ہوں گے آپ ہی سے لینے ہیں ناں بس — لائیے ببّو کو میرے پاس ڈال دیجیے، ہائے بیچاری روتے روتے سو گئی۔"

تابی کو گلبرگ میں آئے دو مہینے ہو چکے تھے۔ لیکن کسی دن تو وثیقہ نویس نہ ملتا تھا کسی دن نکاح پڑھوانے والے مولوی کے گردے میں درد ہونے لگتا، یہ دونوں مل جاتے تو گواہ گھریاں بھگتنے چلے جاتے۔ غرضیکہ شاہی مسجد کے پچھواڑے سے اُٹھ کر آنے کا فقط ایک نفع ہوا، وہاں سارا محلہ جانتا تھا۔ سارے کام گھر بیٹھے ہوتے۔ گلبرگ میں اکنّی کی جگہ روپیہ خرچ ہونے لگا۔ پھر تابی کے لیے اس نئے ماحول میں ایک اور بڑی مشکل در پیش تھی۔ اپنے محلّے میں اُن کی

پرانی ساکھ تھی۔ حیثیت عُرفی سے سب واقف تھے۔ یہاں اس محل نما کوٹھی میں
رہن سہن تو تمام بیگموں کی سی تھی۔ لیکن جی کا چور جینے نہ دیتا تھا۔ ہر وقت لوگوں
سے چھپی رہتی تھی یہی سوچ کر کسی سے نہ ملتی کہ اپنا تعارف کس نام سے کراؤں؟
خیال تو تھا کہ کوٹھی لیتے ہی پاسا پلٹ جائے گا لیکن ہوا یہ کہ بیچاری اور دُھند
میں پڑ گئی۔ گلبرگ کی کوٹھی تابی کو کٹڑ کی نظر آنے لگی۔ لیکن شیخ جی سے کہی بدی بات
کا بھرم رکھنے کے لیے چپکی بیٹھی رہی ---

اور سب سے بڑی بات یہ بھی تھی کہ خدا جانے کیوں اور کیسے اُسے شیخ
جی سے عشق ہو گیا تھا۔ اس خیال سے ہی جی لرز اُٹھتا کہ وہ جو کہیں شیخ جی نے
بالکل چھوڑ دیا تو کیا بنے گا؟ ویسے بھی تابی میں نخاس والیوں جیسی بے لحاظی نہ تھی۔
ہر بات کا الزام گھوم پھر کر نہ جانے کیسے اپنے سر منڈھنے کی عادی تھی۔ دو
مہینے گزر گئے اور شیخ جی پر دباؤ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی اِدھر شیخ جی تابی کو گلبرگ
پہنچا کر سخت ہو گئے۔ روز ہیرا منڈی جانے کا کھٹکا کم ہوا تو نسل دار لوگوں کی
طرح فوراً اپنا وعدہ بھول ناک میں نسوار لے خاموش ہو رہے۔ شاید اسی طرح کچھ
برس اور گزر جاتے لیکن حالات نے یک دم کروٹ لی۔

برسات کا موسم تھا۔ کینال پارک کی جانب سے آندھی چڑھی گھنگھور ہوا
نشہ پانی لیے کھڑکیاں دروازے توڑتی رہی۔ شام کو مٹی کی تہیں موزیک کے
فرش پر سے دُھلواتی ہوئی تابی نے دیکھا کہ ٹیکسی میں سے شیخ صاحب اُتر رہے
ہیں۔ ساتھ دو کھانچے آم کے اور ایک کھٹا کھٹا آلو بخارے کا چلا آ رہا ہے۔ ابھی
وہ سب بیٹھے برف لگے آلو بخارے کھا ہی رہے تھے کہ شیخ جی کو دو چھینکیں

آگئیں۔ ساتھ ہی سر میں ایسا شدید درد اُٹھا جیسے کوئی پھاوڑے سے بھیجا نکال رہا ہو۔ تابی نے اسپرو پلائی تو ایسی قے آئی کہ آنتیں اُلٹ گئیں۔

شیخ جی چارپائی پر پڑ گئے۔

بیس دن تابی نے شیخ جی کی وہ خدمت کی کہ پتی ورتا ساوتریوں کے تمام پچھلے ریکارڈ توڑ دیے۔ کچھ تو شیخ جی تابی کے حسنِ سلوک سے متاثر ہوئے، کچھ اپنے بچنے کی امید نہ تھی۔ دل میں رہ رہ کر یہ خوف اُبھرتا کہ قبر تک سانسوں کا فاصلہ ہے اس عورت سے جھوٹا وعدہ کر کے گیا تو مشتبہ مثل ساتھ لے کر جانا ہوگا۔ اور پھر جانے کیا ہو؟

ایک روز نیم بیہوشی کے عالم میں شیخ جی نے آپو کو بلایا اور مولوی صاحب کو بلوا بھیجنے کی تاکید کر دی۔

رات کو جس وقت سفید کپڑوں میں ملبوس، رانڈوں کی طرح جُونڈا کسے ننگی بوچی تابی کا نکاح پڑھوانے تین آدمی آئے وہ ہاتھ میں شیخ جی کا استعمال شدہ بیڈ پین لیے غسل خانے کی طرف جا رہی تھی۔

سارے محلے کی زبان پر اُس کے لیے ہمدردی کے بول تھے۔

پہلے خالہ اصغری آئیں۔ عطر پھلیل سے سارا آنگن مہک گیا کلیوں والے ریشمی برقعے کو چارپائی پر قرینے سے رکھ کر وہ بھائیں بھائیں رونے لگیں خالہ کے جاتے ہی پھوپھی جمال آرا آگئیں۔ اُن کے ساتھ اُن کی دونوں کم عمر بیٹی بھتیجیاں بھی تھیں۔ بڑی دیر تک شیخ جی کا کیریکٹر زیرِ بحث رہا۔ پھوپھی گئیں تو منہ بولی

بہن زاہدہ کا تانگہ بمع سات بچوں کے آگیا۔

دو کریٹ کوکا کولا کے ختم ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ اتنے آنسو بہائے گئے کہ کوکا کولا کا سارا کھارا پن ختم ہو گیا۔

سارا دن ہمدردیوں کی ٹھاک بندھی رہی۔ ہر کارے پر ہرکارہ آتا رہا۔ رات آئی تو حمیدہ کا بند بند دکھنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کھینچی مار مار کسی نے ادھ مؤا کر دیا ہو۔ بڑی دیر بیٹھی سوچتی رہی۔ اب کیا کرنا چاہیے؟ غیرت بر توں اور گھر چلی جاؤں یا چپ چاپ روٹی کپڑا حلال کیے جاؤں اور اپنے بچوں کا بھلا چاہوں؟ شیخ صاحب کے ساتھ محبت یا عزت کا سوال تو پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔ اُسے تو اُن کا تھل تھل وجود دیکھ کر ہی وحشت ہونے لگتی تھی پھر سوتے میں ان کے نرخرے سے جو آوازیں نکلتی تھیں اُن سے حمیدہ کو بڑی وحشت تھی۔ صحت اُن کی بلا کا ڈھیر تھی، دبلانے، سینک دینے، مزاج پرسی کرنے کا نہ تو حمیدہ کو شوق تھا نہ وقت۔ ویسے بھی وہ ہمیشہ سے کہتی آتی تھی کہ وہ بیوی ہے نرس نہیں۔ لیکن اب تو ایک کسبی سے مقابلہ آپڑا تھا۔ ڈوم ڈھاڑیوں کے آگے وہ ہار ماننے والی تھوڑی تھی۔ وہ تو ادبدا کر میکے چلی جاتی لیکن کار، بنگلہ، قالین، فریج سب سے ہاتھ دھونا پڑتے تھے اور پھر کون جانے شیخ جی نان نفقہ کے بھی پیسے دیں نہ دیں۔ یہ خوف جان کا لاگو ہو رہا تھا۔ ادھر جس طرح تابی نے اُسے اڑنگا دے کر پچھاڑا اس پینترے کی تو یہی شرط تھی کہ ایسی روٹھ کر میکے جائے کہ یا تو شیخ جی تابی کو طلاق دے دیں یا ہمیشہ کے لیے حمیدہ سے کھٹا پٹی ہو جائے۔

محلے والیوں کی ہمدردی بھرے جملے ٹپکے کے آموں کی طرح تھوڑی دیر بعد کانوں میں بھد بھد گرتے تھے۔ ”اُرے یہ طوائفیں مردوں کو مٹھی میں لینا جانتی ہیں، تم یہ فن کیا جانو ——“

”دیکھا میں نہ کہتی تھی حمیدہ —— کوئی مردوں کو بھی یوں آزاد چھوڑ دیتا ہے؟“

”تم کو کیا معلوم؟ کیا کیا کچھ کرتی ہیں یہ کوٹھے والیاں۔“

”اللہ جی! اب رنگ لائی گلہری ——ہم بھی کہیں یہ شیخ جی روز روز کہاں جاتے ہیں۔“

بڑی دیر حمیدہ بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر اُٹھی صندل کا شربت، دو گھونٹ حلق میں ٹپکایا۔ نائیلون کے دوپٹے سے آنکھ کے کونے کو پونچھا اور جی کو پچکار کر بولی —— ”چلو بہن کیا، نکاح پڑھوا لیا تو اچھا کیا۔ ہماری جان چھوٹ گئی۔ روز ہماری بوٹیاں توڑ توڑ کر کھاتے تھے لیکن ہم اپنا گھر کیوں چھوڑیں۔ آپی خرچا دیں گے۔ جب دوہری بیپا پڑے گی تب عقل ٹھکانے آئے گی۔“

ساری فکر حمیدہ کو اپنے مالے کی تھی۔ بار بار سوچتی کہ وہ جو کہیں اُس مال زادی نے خرچ بند کروا دیا تو کیا ہوگا؟ رفتہ رفتہ اپنی کم نصیبی کی عظمت سے وہ کچھ اس طرح متاثر ہوئی کہ اُٹھ کر ململ کا سفید دوپٹہ کانوں کے دونوں طرف اڑس لیا اور تکیے پر یوں آلیٹی جیسے حنوط شدہ قدیم مصر کی کوئی شہزادی ہو۔ آنسو آہستہ آہستہ کانوں کی طرف بڑھنے لگے ——

ٹپ ٹپ ...... بوند بوند۔

تکیہ بھیگنے لگا —— لیکن عجیب سی بات تھی اتنے سارے آنسوؤں میں

ایک آنسو بھی شیخ جی کی یاد میں نہ تھا۔ سب اپنی بدنصیبی، اپنے بچّوں کی بدنصیبی، اپنے مستقبل کے اندھیرے پن پر مچل رہے تھے۔

بارش آہستہ آہستہ برس رہی تھی۔

تابی کی پتنگا سی نگاہیں بار بار پلنگ کا طواف کرتی تھیں۔ پکڑ کی ہیں بیٹھے اُسے لگ رہا تھا جیسے وہ صندوقی بوہرج بیں بیٹھی تسخیر آفتاب کا منتر پڑھتی کسی مہم سے لوٹ رہی ہے۔ سارے گھر میں سُکھ شانتی کا پھریرا لہرا رہا تھا۔ گو باہر بوندیں برس رہی تھیں لیکن گھر کے اندر باہر سرزیوں کی گرم گرم دھوپ کا سا سماں تھا۔ آج بادلوں میں مایوسی، تکان اور آنسو نہ تھے۔ بلکہ آج تو اودے اودے دوپٹے اوڑھے۔ کندھوں پر برجی گاگریں اُٹھائے رادھا نگری سے گوپیاں قطار در قطار پانی لا رہی تھیں۔

تابی کی پتنگا سی نگاہیں سوئے ہوئے شیخ جی پر منڈلا رہی تھیں۔ یہی مرد کل تک شیخ صاحب تھا، اس سے اُسے محبت تھی۔ لیکن اس کے وجود سے تابی کے انگ انگ میں گناہ کی خارش اُٹھتی تھی۔ ضمیر کے تازیانے کسی گھڑی اپنی کارگزاری بند نہ کرتے تھے۔ تابی کا سب کچھ پہلے بھی شیخ صاحب کے لیے تھا لیکن نکاح کے دو بول اس گھر میں کیا سُر ہوئے سارے گھر میں اس شخص کے وجود سے بہار آگئی۔ تابی کو شیخ جی کی ہر بات اچھی لگتی تھی، بلا وجہ۔۔۔ احمق پن کی حد تک۔

آپو کو یہ اعتراض تھا کہ شیخ جی موٹے بہت ہیں اور عمر میں تابی سے بڑ

بھی بہت ہیں۔ آپوکے سامنے تو تابی چپ رہتی لیکن اکیلے میں تابی سوچتی، موٹے ہیں تو کیا ہوا؟ شوہر موٹا نہ ہو تو رعب داب نرالا نہیں لگتا۔ عمر مرد کی عورت سے بڑی ہی ہونی چاہیے ورنہ شادی کے دسویں سال میاں بیوی کا رشتہ ماں بیٹے کا نظر آتا ہے۔ اُن کی بیماری سے بھی تابی کو مریضانہ لگاؤ ہو گیا تھا۔ سوچتی وہ تو شیخ جی قسمت سے بیمار رہتے ہیں۔ ورنہ ان ہاتھوں کو ان کی خدمت کا موقع ہی کب ملتا؟

شادی سے پہلے محض ایک وعدے کی بنا پر تابی شیخ جی کی ہو چکی تھی۔ تن من دھن سے ان کی غلام تھی۔ اب تو ہر پل احسان مندی سے بھی دل ڈدیا چلا جاتا تھا۔ اُس کا جی چاہتا کہ اُٹھ کر شیخ جی کے پاؤں چوم لے۔ اپنے چمڑے کے ہاتھ سلیپر بنوا کر شیخ جی کے گدگدے پیروں میں پہنا دے ——

اللہ مجھ جیسی راندہی ہوئی سے شیخ جی نے نکاح پڑھوایا۔ مجھ بازار والی کو یہ عزت بخشی۔ کوڑے کی ٹوکری کو سر پر اُٹھایا۔ جب یہ باتیں اس کے ذہن میں آتیں تو شیخ جی کی محبت کا سوتا جسم پر آبشار بن کر گرتا اور روح تک کو سرشار کر جاتا۔ اس محبت میں اندھیرے بادلوں کی سی ستر پوشی تھی، حضرت بلالؓ کی سی عبودیت تھی۔ رام رام سمرن کرتی چتا کے گرد چکر لگاتی پدمنی کی لگن تھی۔

تابی آہستہ سے صندوقی بوروج سے اُٹھی اور سوئے ہوئے شیخ صاحب کے پیروں پر سر رکھ کر ہولے ہولے رونے لگی۔

حمیدہ اُٹھی تو طوفان بن کر لیکن نشیب برگشتہ کی طرح پھر ڈھیر ہو کر چوکی پر بیٹھ گئی۔

ماموں نے چھٹی مرتبہ پھر وہی بات کہی — "لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ شیخ صاحب دوسرے نکاح کے بعد بھی حمیدہ کی کفالت کرتے رہیں گے — اس سارے معاملے کا تو بس ایک ہی حل ہے کہ کسی طرح شیخ صاحب اُس بدمعاش کو چھوڑ دیں۔"

جہاں تک حمیدہ کا تعلق تھا وہ یہ چاہتی تھی کہ شیخ صاحب چاہے جسمانی طور پر تابی کو چھوڑیں نہ چھوڑیں لیکن مچلکہ لکھ دیں کہ اس کا ہزار روپیہ ہر ماہ کھرا ہے گا۔ ایک طرح سے تو وہ خوش تھی کہ گناہ سمیٹنے کو ایک دوسری آ گئی لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ بقول ماموں تابی کسبی تھی، رنڈی تھی، روپے پیسے کی لوبھی، وہ کب تک برداشت کرتی رہے گی کہ حمیدہ کو ہزار روپیہ ماہوار مفت کا ملتا رہے۔

"ارے تم نہ ڈرو حمیدہ ہم تمھاری پشت پر ہیں۔ ادھر تو کارخانے کو انڈسٹری کے ڈائریکٹر سے کہہ کر بند کروا دیں گے ادھر پٹرول پمپ ہاتھ سے نہ نکلوا دیا تو کہنا۔ جب بزنس کا دریچہ بند ہوا تو یہ ساری محبت آپ ہی دم بخت ہو جائے گی۔"

حمیدہ لرز گئی۔ محبت کو دم بخت کرنے کا یہ طریقہ اُسے ایک آنکھ نہ بھایا اللہ وہ جو کہیں سے ایسا علاج ہو کہ سانپ بھی مر جائے اور بزنس کی لاٹھی بھی سلامت رہے تو ہی لطف ہے۔

خالہ اصغری ریشمی بقچے کو اُٹھا کر بولیں، بھائی جی ہماری حمیدہ تو سیدھی

سادی ہے آپ خود جا کر اُس کل موہی سے ملیے۔ اُس رنڈی کے ہتھکنڈے بیچاری یہ کیا جانے —"

مشکل تو یہی ہے کہ شیخ صاحب نان نفقہ کے ضامن بھی بن گئے تو کوٹھے والی کیسی کب کفیل رہنے دے گی۔ شیخ صاحب کو تو واپس ہی لانا پڑے گا — ہر قیمت پر —"

اپنے ساتھ والے پلنگ پر ٹہل ٹہل کرتے ہوئے زرخرے سے بھیانک آوازیں نکالتے شیخ جی کے تصور سے ہی حمیدہ لرز گئی۔ اُس کے دل میں آنگن میں پرانی آہنی پر شیخ جی کی وہ ساری باتیں افسوس کرنے آئی بیٹھی تھیں جن کا شیخ جی کی محبت سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ رنڈی کے ہاتھوں خرچ بند ہو جانے کا خدشہ تو تھا ہی دوجے یہ واہمہ ستاتا تھا کہ سارے میں ناک کٹی ہوگی ہماری توپ کو کیسی انجک بیاٹے گئی کہ شیخ جی جیسا کو دن شکار ہاتھ سے جاتا رہا۔

جب ماموں نے گلبرگ جانے کا قصد کیا تو خالہ اصغری نے بچّوں کو گندے میلے کپڑے پہنا کر یتیموں کی ساری خوبیاں پیدا کر کے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر لا بٹھایا پہلے تو حمیدہ ساتھ جانے پر رضامند نہ ہوتی تھی لیکن جب اٹھارھویں مرتبہ چلتے چلتے ماموں بولے۔ "دیکھو حمیدہ! وہ حرفہ باز ہے بات دے گی تھیں یہ مت سمجھنا کہ ایسی عورتوں کے وعدے اعتبار کے قابل ہوتے ہیں مجھے یقین ہے کہ سامنے ضرور مان جائے گی، لیکن ایسی عورتوں کا اعتبار کیا۔ بہتر تو یہی تھا کہ تم ساتھ چلتیں اور کسی طرح شیخ جی کو لوا لاتیں ورنہ ان کے چلتر تم کیا سمجھو۔ آنکھوں میں مٹھیاں دے دے کر روؤ گی —"

حمیدہ خوفزدہ ہو کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

آدھ کھلی کھڑکی سے سر اندر ڈال کر خالہ اصغری بولیں ——" اے حمیدہ! جب ماموں دبکا چکیں تو ہٹبر دلا سے کام لینا کہیں پھانسا ہوا شکار نہ بدکا دینا۔ وہ تو ایسے سب گن پڑھی ہیں۔ میں تم کو تاکید کرتی ہوں لگاوٹ کی باتیں کرنا لگاوٹ کی —— وہ نہ ہو کہیں شیخ صاحب کی ہر شے کی وہی مالک بن بیٹھے ——"

کینال پارک کی جانب سے اُٹھنے والا فیل مست بادل گلبرگ پر بے جان لیٹا تھا۔ ٹیکسی کی پیلی چھت پر شہد جیسی بوندیں پھوار بن کر ٹپک رہی تھیں اور میٹر دم بدم بڑھ رہا تھا۔

تائی شکست خوردہ راجپوت رانی کی طرح صندوقی ہوئے میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔

پہلے ماموں نے پون گھنٹہ اس کی، اس کے بیٹے کی، اس کے آبا و اجداد کی بے غیرت زندگی کی لمبی داستانوں سے ضیافت کی۔ اس اثنا میں حمیدہ چارپائی کے سرہانے یوں کھڑی رہی جیسے اس کمرے کی ہر چیز میں پھولی ماتا کے جراثیم ہوں۔ جب اپنے بھانویں ماموں تائی سے نپٹ چکے تو غصے کی گاڑی شنٹ کرتے ہوئے شیخ جی سے بولے ——" تم جانتے ہو، کہ ڈائریکٹر آف انڈسٹریز سے میرے کیسے تعلقات ہیں، پل بھر میں ساری فیکٹری پر تالا نہ ڈلوا دیا تو شیخ الٰہی بخش نام نہیں، جس دولت کے مان پر تھیں یہ اللّے تللّے سوجھے ہیں۔ اُس دولت کا پرنالہ ہی بند کر دوں گا، انشاءاللہ!"

شیخ جی کچی نیند سے جاگے تھے، چہرے پر پیلاہٹ، جسم پر لرزاہٹ اور دل میں وسوسے تھے۔ پھر نگاہ جو کھلی تو سامنے حمیدہ اور ماموں کی شکل نظر آئی۔ بیماری نے پہلے ہی قوتِ مدافعت چھین لی تھی۔ پلنگ پر عادی مجرموں کی طرح بیٹھ گئے۔

"تم کچھ بولتے کیوں نہیں ـــــ لیکن اس آوارہ سے نکاح پڑھوا کر اب بولو بھی کیا ـــــ بے شرم کار، گھر پر ہی رہنے دیتے، یہ لوگ تو سارا مال ہتھیا کر بھی اپنی نہیں بنتیں۔"

"یہ میری ویسی ہی بیوی ہے جیسی حمیدہ ..... آپ آپ"۔ انھوں نے تابی کے لیے آواز کو بلند کرنا چاہا، لیکن آواز کہیں حلق ہی میں سوکھ گئی۔

برآمدے میں حمیدہ کے بچوں نے ہلڑ مچا رکھا تھا۔ ننھی بسم اللہ کی سائیکل کو دھڑا دھڑ دوڑا رہے تھے۔ آسمان پر گھرے سرمئی بادلوں میں خوفناک سی چمک کوڑیالے سانپ بن کر بار بار لہرا رہی تھی اور میٹر دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔

تابی آہستہ سے ہودج میں سے اتری۔ حمیدہ کے بچوں کی آوازیں اس کے کان میں گرم سیسہ بن کر اتر رہی تھیں۔ آخر ان معصوم روحوں کا کیا قصور تھا؟ جس طرح بنّو کو ایک والد کی ضرورت تھی اُسی قدر ان بچّوں کو بھی تو سہارے درکار تھے؟ وہ آہستہ آہستہ الماری تک آئی اور ہینگر پر ٹنگی ہوئی اچکن اتارنے لگی۔

شیخ جی نے تابی کی طرف دیکھنا چاہا لیکن اسی وقت آگے بڑھ کر حمیدہ نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا اور جوتیاں پیروں سے کھسکا کر ان کے برابر

کر دیں۔ جاتے ہوئے نہ تو شیخ جی نے پلٹ کر دیکھا اور نہ ہی طوائف انھیں ٹیکسی تک چھوڑنے گئی۔

کبنال پارک سے آنے والے بادل کی قنائیں پھٹ گئیں اور کاجل بھری پھوار گلبرگ کی کوٹھی پر پڑنے لگی۔

تابی نے سارے کمرے پر نگاہ دوڑائی اور پھر شیخ جی کے خالی پلنگ کی پائنتی جا بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں سے گرم گرم آنسو بہہ رہے تھے اور ایک ایک آنسو میں شیخ جی کی شبیہ ٹوٹ رہی تھی، نکھر رہی تھی۔ اُس کے سر کا سیس پھول پتّی پتّی سارے گھر میں بکھرا پڑا تھا۔

نقوش:

○

حجاب امتیاز علی

چٹان

عجیب واقعہ گزرا ـــــ!

یہ اُس سال کی بات ہے، جب میں اپنے بُوڑھے طبّی مشیر ڈاکٹر گار کے ساتھ کوہ الماس کے سبزہ زاروں پر اعصابی سکون کے لیے آئی ہوئی تھی اور اپنے ناول کا آخری حصّہ مکمل کر رہی تھی۔

موسم گرما کی بہاروں میں الماس کا چپّہ چپّہ سیاحوں اور مسافروں کی تفریح کا آماجگاہ بن جایا کرتا تھا۔ یہاں میں نے ایک نیلی چٹان کے سرے پر بنگلہ لے رکھا تھا جس کے سامنے چمن لہلہا رہا تھا۔

بوڑھا ڈاکٹر گار بڑا مجلس پسند آدمی تھا۔ اپنی ساری زندگی اس نے اعلیٰ معیار کی محفلوں کے فانوسوں تلے ہنس بول کر گزاری تھی۔ چنانچہ آج کل کی چھٹیوں میں وہ تمام تمام دن مرغزاروں کے چکر کاٹتا اور دوستوں سے گپ لگاتا۔ بندوق ہاتھ میں رہتی، اور جہاں کوئی شکار نظر آتا، اسے نشانہ بناتا اور میں نیلی چٹان کے زیرِ سایہ بیٹھی اپنی کتاب لکھا کرتی۔ پھر جب شام پڑتی اور آسمان پر تاروں کی آگ لگ جاتی تو ہم دونوں اسے ننھے سے جگمگاتے شہر کی سیر کے لیے نکل جاتے۔ دوستوں سے ملاقاتیں کرتے محفلوں

میں شریک ہوتے، میں اپنی نامکمل کتاب کی باتیں کرتی، ڈاکٹر گارا اپنے شکار کی ---- اور آدھی آدھی رات گئے واپس آتے غرض رات بڑے ہنگامے میں کٹتی اور دن مصروفیت میں۔ کوہ الماس چونکہ مختصر جگہ تھی اس لیے وہاں کی نصف سے زیادہ آبادی ہمارے جاننے والوں کی تھی۔

ایک صبح میں اپنے لکھنے پڑھنے کا سامان لیے بید مجنوں کے تلے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ سامنے درخت کی ایک گہرے کاسنی رنگ کی ٹہنی پر ایک زرد پروں اور نیلی چونچ والا پرندہ بیٹھا زور زور کی سیٹی بجا رہا تھا۔ ڈاکٹر گارا اپنی نسوار کی ڈبیا اور بندوق لیے پہاڑوں پر گھوم رہا تھا کہ اتنے میں مری بوڑھی بکشن زوناش حسب عادت منہ پھلائے نمودار ہوئی۔

"کیا بات ہے بوڑھی بلّی؟" میں نے اپنی گہری سوچ سے باہر نکل کر پوچھا۔

نجانے کیا بات ہے۔ بوڑھی زوناش عام طور پر صبح کے وقت چڑچڑی ہوا کرتی تھی۔ شاید رات بھر کے خوفناک خوابوں کا اثر اس کے ذہن کو پریشان رکھتا تھا۔ خشک لہجے میں بولی۔ "اپنا تار لیجیے۔"

"ارے کس کا ہے؟ ----" میں چونک پڑی۔

زوناش بغیر جواب دیے اپنی موٹی کمر ہلاتی واپس جا چکی تھی۔

میں نے جلدی میں لفافے کے ساتھ تار بھی پھاڑ دیا۔ پھر اسے جوڑ کر پڑھنے لگی اور پڑھتے ہی متوحش ہو گئی۔ تار زلفی کا تھا۔ لکھا تھا۔

"مجھے فوراً آملو۔ میرا ارادہ عنقریب خودکشی کا ہے۔ کبھی یہ زندگی مجھے کتنی

عزیز تھی! پراب ـــــ از لفی۔

میں نے اسی وقت تار کا جواب تار سے دیا کہ

"میرے آنے تک رکنا۔ روحی۔"

تار پڑھ کر میرے اعصاب تہ و بالا ہو گئے۔ زلفی کی ننھی سی لاش خون میں نہائی ہوئی مجھے صاف نظر آ رہی تھی اور اس پر سخت حسرت برس رہی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہم مکتبی کے دن، وہ بے فکری کا زمانہ، اور عیش کی گھڑیاں یاد آنے لگیں۔ جب میں اور زلفی بچیاں تھیں۔ زلفی مری پرانی دوست تھی مجھے اس کا بھی علم تھا کہ وہ سخت بزدل ہے اور خودکشی ہمت کا کام ہے لیکن اس کے باوجود اس کی لاش بار بار مری تصوّر کی آنکھوں کے آگے آجاتی تھی اور مری سسکیاں نکل جاتی تھیں۔

پریشان ہو کر میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے نو ہو رہے تھے۔ گیارہ بجے ایک جہاز جانے والا تھا۔ مجھے اسی میں اڑ جانا چاہیے۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔

ٹھاں۔ ٹھاں ـــــ! دُور پہاڑوں پر سے ڈاکٹر گار کی بندوق کی ناگوار آوازیں آ رہی تھیں۔ میں بُرا سا منہ بنا کر رہ گئی۔ مجھے شکار سے کبھی دلچسپی نہ تھی۔ اس ظالمانہ شغل سے مجھے نفرت تھی۔ جانے لوگوں کو کیا ثواب مل جاتا ہے جانوروں کو مار کر ـــــ پھر میں تو اس مخلوق کی شیدائیوں میں سے تھی۔

میں نے بڑبڑاتے ہوئے جلد جلد اپنے کاغذات لپیٹے۔ اندر کمرے میں جا کر ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس ٹھیک کیا اور ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گئی۔ جب میں ہوائی اڈے کو جانے کے لیے تیار ہو کر باہر نکلی تو ڈاکٹر گار

مجھے جنگل کے ایک موڑ پر بندوق ہاتھ میں لیے ہوئے ملا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں کوئی چیز لٹک رہی تھی۔

وہ چیخ چیخ کر مجھے آوازیں دینے لگا۔ "روحی! روحی! ادھر دیکھو۔ آج مرغابی ملی ہے۔ زوناش سے کہنا دوپہر کے کھانے کے لیے اُسے مصالحے میں خوب سُرخ تل دے ــــ ہاں دہی کا چھینٹا ضرور دے ــــ"

میں نے بے پروائی سے پلٹ کر دیکھا۔ مری ایک سسکی سی نکل گئی۔ "دہی کا چھینٹا ــــ!؟ زلفی خودکشی کر رہی ہے ڈاکٹر ــــ اور آپ مرغابی تل کر ــــ"

ڈاکٹر گار قریب آ گیا، "کیا کہا؟ زلفی؟ ــــ خودکشی؟ جا کہاں رہی ہو تم؟"

میں نے تار اسے دے دیا۔ وہ آنکھیں چندھیائے ہوئے تار پڑھ کر بولا: "اور تمھیں یقین آ گیا؟"

"نہیں ــــ" میں نے دوسری سسکی بھری "تاہم کیا معلوم ــــ؟"

ڈاکٹر گار ہنس پڑا "میں تم سب کو بچپن سے جانتا ہوں رُوحی۔ ارے خودکشی تو بڑے دل گردے کا کام ہے۔ زلفی خودکشی کیا کرے گی۔"

"لیکن اس نے مجھے فوراً پہنچنے کی تاکید جو کی ہے۔ جان کا معاملہ ہے ڈاکٹر میں اُسے ساتھ لے کر کل صبح کے جہاز سے واپس آ جاؤں گی۔ تاکہ خودکشی کا خدشہ ہی باقی نہ رہے۔" یہ کہہ کر میں چل دی۔ جہاز میں تمام رستے میں بادلوں کو تکتی اور اِدھر اُدھر متوحش نظریں ڈالتی ہوئی سفر کاٹتی رہی۔

ڈاکٹر گار مرغابی اُٹھا کر ہلانے اور مجھے خدا حافظ کہنے لگا۔

دو گھنٹوں بعد جب میں زُلفی کے ہاں پہنچی تو وہ ایک دھانی رنگ کے

خوبصورت لباس میں باغ کی دریچی پر بیٹھی گلہری کی طرح ایک سُرخ سیب کُتر کُتر کر کھا رہی تھی۔

اُسے دیکھ کر مجھے دلی اطمینان ہوا۔ مسکرا کر بولی "تم تو بنی سنوری بیٹھی سیب کھا رہی ہو۔ خودکشی کا پروگرام کیا ہوا؟"

اس نے مجھے گلے لگایا بولی: "دو دن سے فاقہ تھا روحی یہ پہلا سیب ہے میں تمھاری منتظر تھی۔"

"اور خودکشی؟" میں ہنس پڑی اور اٹیچی کیس نیچے ڈال دیا۔

"تم نے تار میں ملتوی کرنے کو لکھ دیا ورنہ مر چکی ہوتی۔"

"میں تمھیں کوہ الماس اپنے ساتھ لے جانے آئی ہوں زلفی۔ ایسی روشن گرم بہاروں میں خودکشی کرنا کفرانِ نعمت ہے۔"

"تم خودکشی کی وجہ نہیں جانتیں روحی۔ تم میری جگہ ہوتیں تو یہی کرتیں"

"میں مالیخولیا کی مریض نہیں ہوں جو یہ اقدام کرتی۔"

اس نے سیب باغ کی دریچی سے باہر پھینک دیا۔ کمرے میں اُتر کر ایک سُرخ قالین پارے پر پنکھے کے نیچے لیٹ کر بولی۔ "روحی، تم کو میری سوتیلی بہن نشا تو یاد ہے، طالب علمی کے زمانے ہی میں وہ کس قدر مکار مشہور تھی۔ اکثر لڑکیاں اسے ناپسند کرتی تھیں۔ محض اس کی مکاری کی وجہ سے۔"

میں کچھ یاد کر کے بولی، "ہاں ہاں مکار اور حسین۔"

"اسی نے مجھے خودکشی پر آمادہ کر دیا۔" زلفی نے دردناک لہجے میں کہا۔

میں متاثر سی ہوگئی۔ "ہائے زلفی۔ تم اس کے ساتھ آخر رہتی کیوں ہو؟"

—— اب آج ہی تم مرے ساتھ کوہ الماس چلو —— تم نے اب تک تفصیل تو مجھے کچھ بھی نہیں بتائی۔"

زُلفی کچھ سوچ کر بولی "میں نے تم کو اس لیے بلایا تھا —— کہ اگر تم میری بجائے شانو کو اپنے ساتھ کوہ الماس لے جاؤ تو میرا کام بن جائے گا۔"

میں اس کے قریب قالین پر بیٹھ گئی۔ صوفے پر کا ایک کشن کھینچ کر اس سے ٹیک لگائے ہوئے بولی "آخر بات کیا ہے زلف؟"

زُلفی اب سنجیدہ اور اداس نظر آ رہی تھی "اگر تم اُسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور اُس کی وہاں کہیں شادی کرا دو تو میں زندگی بھر تمھارے اس احسان کو نہیں بھُولوں گی۔"

"کسی کی شادی کرانا آسان ہے زُلفی؟ —— " میں حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی پھر بولی "مزید برآں اس عیار لڑکی کی شادی کرانے کے فرائض آخر تم کیوں سرانجام دو؟"

"رو جی۔ اس نے مری حق تلفی کی ہے۔ اب سارا قصّہ تم کو مختصراً سناتی ہوں۔ تین مہینے ہوتے ایک دعوت میں مری ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو بیحد دلکش اور خوش ذوق ہے۔ مارچ کا مہینہ ہم نے سرسری ملاقاتوں میں کاٹا۔ اپریل میں ملاقاتیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ اوائل مئی میں اس کا تعارف اپنے رشتہ داروں سے کرایا اور سب نے اُسے بے حد پسند کیا۔ اواخر مئی کا زمانہ محبت کے دلفریب خواب دیکھنے گزر گیا، لیکن جون کے پہلے ہفتے میں شانو آ گئی۔ اس کا آنا تھا کہ مری دنیا تہ و بالا ہو گئی۔ اس نے آتے ہی اس پر

جادو سا کر دیا۔ وُہ اس کے قریب ہوتی چلی گئی اور میں دُور ہٹتی گئی ۔۔۔اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اگر میں ایک قدم بھی اور پیچھے ہٹی تو ناکامی کے غار میں جا گروں گی ۔۔۔"

"لیکن وہ شخص ؟" میں نے پُوچھا۔

"اُس کے متعلق میں کچھ کہہ نہیں سکتی رُدحیا کہ وہ شانو سے محبت کر رہا ہے یا مجھ سے، مجھے دھوکا دے رہا ہے یا اُسے ۔"

"پھر تو وہ خاصا گرگ باراں دیدہ معلوم ہوتا ہے ۔" میں نے کہا۔

"وہ جیسا بھی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم شانو کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ کوہ الماس کی دلچسپیوں میں اسے اتنا محو کر دو کہ وہ اُسے بھُول جائے ۔ اور اگر ہو سکے تو اس کی وہیں کہیں شادی بھی کرا دو۔ کوہ الماس پر گرم بہاروں میں جگہ جگہ سے مسافر آتے ہیں۔ ایسی جگہ بڑی آسانی سے رشتے کرائے جاتے ہیں ۔"

میں پریشان ہو کر بولی "۔ لیکن میں اس فن کی ماہر نہیں ہوں دُوسرے ۔۔۔"

زلفی بات کاٹ کر بولی "میں کب کہتی ہوں رُوحی کہ تم کچھ کرو۔ تم سدا کی نکمّی ہو۔ ڈاکٹر گار اس سلسلے میں بے حد کار آمد ثابت ہو گا۔ وہ دُنیا جہان کے لوگوں کو جانتا ہے ۔"

باغ کی روش کی طرف سے ہلکی ہلکی سیٹی کی آواز آنے لگی پھر تھوڑی ہی دیر بعد سریلی آواز میں ایک عشقیہ مصرعہ سنائی دینے لگا۔ میں نے زلفی

سے پوچھا۔ "یہ کون گا رہا ہے؟"

مرا جملہ ختم ہوا تھا کہ شانو نیلی مخمل کی تنگ جینس پہنے بازوؤں پر سیاہ بال لٹکائے گنگناتی ہوئی اندر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہونٹ گلناری رنگ کی لپ اسٹک سے انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ اس کے آتے ہی کمرہ گھاس کے عطر کی تیز خوشبوؤں سے مہک اٹھا۔

مجھے دیکھتے ہی بولی "ارے رُوحی! تم یہاں! میں نے سنا تھا تم کوہ الماس کے ہنگاموں میں مشغول ہو۔ مجھے رشک آرہا تھا تم پر۔ ہائے مجھے کوہ الماس اتنا پسند ہے کہ وہاں ایک ہفتہ گزارنے کے لیے میں اپنی جان تک دینے پر تیار ہوں۔"

میں ہنس پڑی۔ ٹھنڈی کافی کا ایک گھونٹ لے کر بولی۔ بغیر جان کا نقصان کیے تم وہاں کی فضاؤں کا لطف اٹھا سکتی ہو، تم مرے ساتھ چلو اور مری مہمان بن کر رہو۔"

زلفی خوش ہو کر بولی۔ "روحی تمہیں دعوت دے رہی ہیں۔ شانو جینے بھر کے لیے ہو آؤ۔"

میں بولی۔ "مجھے کل صبح کے جہاز سے واپس جانا ہے چلتی ہو تو ساتھ چلو۔"

شانو کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو گئی پھر بولی۔ "روحی، دو دن کے لیے تم اپنا سفر ملتوی نہیں کر سکتیں؟"

میں گھبرا کر بولی۔ "دو دن؟ بہت زیادہ ہیں شانو۔ تم کل ہی مرے ساتھ چلو۔"

زلفی مجھے تیز تیز نظروں سے گھورنے لگی "روحی۔ دو دن میں قیامت تو نہیں آجائے گی۔"

میں بولی "مجھے اپنے ناول کا آخری حصّہ مکمل کرنا ہے۔ زُلفی دو دن کے معنی یہ ہوں گے کہ سوچا ہوا سارا خاکہ دماغ سے نکل جائے گا۔"

"تو دماغ کے پٹ بند رکھونا ____" شنانو ہنس کر بولی "اگر تم دو دن ٹھیر جاؤ گی تو میں تمھارے ساتھ چلوں گی۔ مجھے ایک ضروری انتظام کرنا ہے۔"

میں بادلِ نخواستہ دو دن کے لیے ٹھیر گئی۔

جب میں جانے لگی تو زُلفی نے مجھے بے حد پیار کیا اور بولی "روحی میں تمہارا یہ احسان زندگی کے آخری لمحوں میں بھی یاد رکھوں گی۔ تم نہیں جانتیں کہ اس عیّار لڑکی کو یہاں سے دفع کر کے تم نے مجھ پر کتنا عظیم احسان کیا ہے۔ گویا مری راہ سے ایک چٹان ہٹ گئی۔"

"چٹان ____ میں ہنس پڑی "گویا تم اسے اپنی راہ سے ہٹا کر مری راہ میں حائل کرنا چاہتی ہو اور واقعی میں اس کے نیچے دب جاؤں گی۔ اس لیے کہ میں کوہ الماس محض اس غرض سے نہیں گئی کہ وہاں کے شور و شر میں لگی رہوں یا وہاں کی محفلوں کی شمع بنوں۔ میں تو اپنے ناول کا آخری باب مکمل کرنے گئی تھی۔ اب شنانو دن رات میری جان کھایا کرے گی کہ مجھے دعوتوں میں گھماؤ۔ محفلوں کی سیر کراؤ۔"

زلفی بولی "تم بہت بھولی ہو روحی۔ تم شنانو کو نہیں جانتیں، اسے

کسی سے متعارف کرانے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ اپنے لیے راہیں آپ نکال لیتی ہے۔ وہ بڑی خارج المزاج لڑکی ہے اور اگر فرض کرو اس نے تمھیں کسی قدر پریشان کیا بھی ــــ تو کیا ہوا میرے لیے تم اتنی تکلیف گوارا نہیں کر سکتیں؟ آخر دوست آڑے وقتوں میں کام آنے کے لیے ہوتا ہے۔ میں نے سوچا تو مجھے بھی اس کا کہنا کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوا کہ دوست آڑے وقتوں میں کام آنے کے لیے ہوتا ہے اور پھر میری اور زلفی کی دوستی تو بچپن کی تھی۔

جب تیسرے دن میں نشانو کو لیے ہوئے کوہ الماس پہنچی تو خوش گلو ایشائی پیر بانس کی سرسبز ٹہنیوں پر نغمہ سرا تھے اور شام کی ہواؤں میں سونف کے گچھوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر گار باورچی خانے میں چولہے کے آگے ایپرن باندھے کھڑا اپنے فنکار کیے ہوئے جنگلی مرغ کی ایک ٹانگ بھون رہا تھا۔

اس نے ہمیں دیکھ کر ایک قہقہہ بلند کیا۔ نسوار کی ڈبیا کھول کر زور سے سونگھی اور چمچہ آگے بڑھا کر کہا "تم دونوں اسے چکھ کر دیکھو۔ کیا لذیذ قورمہ پکایا ہے میں نے۔ زہرنا نش کو پکانے کے لیے کہتا تو وہ جلا کر راکھ کر دیتی۔"
اسی وقت اس کی نظر بجائے زُلفی کے نشانو پر پڑی اور اُس نے متعجب ہو کر کہا "ہائیں؟ زُلفی نہیں آئی؟"

اسی رات کا ذکر ہے۔ آسمان پر کہکشاں کی بساط بچھی ہوئی تھی بہار کے گرم و معطر جھونکے ارغنوں کا سا شور مچا رہے تھے۔ نشانو نے کھانا کھاتے ہی اپنے کسی دوست کو فون کیا۔ وہ دوست ذرا سی دیر میں آ کر اسے موسیقی

کی کسی محفل میں لے گیا۔

میں آئس کریم کے دو پیالے ہاتھ میں لے کر باغ کی سیڑھیوں پر جا بیٹھی ایک پیالہ ڈاکٹر گار کے ہاتھ میں تھما دیا۔ دوسرا خود کھاتے ہوئے شانو کے اس سفر کا مقصد ڈاکٹر گار کے ذہن نشین کرایا اور کہا "یہ مسئلہ آسانی سے حل ہوتا نظر آتا ہے۔ بڑی جانی سی لڑکی معلوم ہوتی۔ آتے ہی کوئی واقف نکال لیا۔ اب اس سے محبّت کی پینگیں بڑھنے لگیں۔ بہر حال بڑی بات یہ ہے کہ زلفی کو اس سے نجات مل گئی"۔

ڈاکٹر گار نے کہانی سن کر کہا۔ "بچاری زلفی۔ اچھا کیا کہ اس چٹان کو تم نے اس کی راہ سے ہٹا دیا۔"

میں بولی۔ "میں نے تو ہنگامی طور پر ہٹایا ہے۔ مستقلاً ہٹانا آپ کا کام ہے۔ اس کی شادی کرا دیجیے۔"

ڈاکٹر گار نے آئس کریم سے منہ بھر کر کہا "کوئی ایسا مشکل کام بھی نہیں، کوہ الماس — تم جانتی ہو۔ یہاں گرمیوں میں بیسیوں رشتے ہوتے رہتے ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا روحی بیٹی۔ بیگم نجمہ کا ایک مہمان ہے۔ کنوارا اور خوبصورت۔ اس کے اعزاز میں آج دوپہر بیگم نجم نے ظہرانہ کر رکھا تھا۔ تمہارا بھی بلاوا تھا، مگر تمہارا جہاز کھانے کے وقت کے بہت بعد میں پہنچا۔ ہاں تو وہ نوجوان دیکھنے میں تو ہنس مکھ اور ملنسار۔ خواتین اور لڑکیاں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔ مجھے یقین ہے وہ بہت جلد کوہ الماس کی محفلوں کا چراغ بن جائے گا۔"

"تو ڈاکٹر اس سے شانو کی ملاقات کرا دیجیے نا —" میں نے اپنی سیامی بلی کو آئس کریم کھلاتے ہوئے کہا۔ اور پھر بولی "اگر ہو سکے تو شادی ...."

پھر میں ذرا ہنس کر بولی "بچاّ یونہی ہنستی ہیں"
میں پوری کوشش کروں گا۔ اگر وہ نوجوان شریف اور معقول نکلا اور دونوں نے ایک دوسرے کو پسند بھی کیا تو میں بیگم نجم سے کہ کر ان کا رشتہ کرادوں گا"
"بیگم نجم کو ایک تو اس قسم کی باتوں سے انتہائی دلچسپی ہے۔ دوسرے وہ اس سلسلے میں ماہر فن کی حیثیت رکھتی ہیں" میں نے دستی سے بلّی کا منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

اس شب جب میں اپنی خوابگاہ میں گئی تو بے حد مطمئن تھی۔ کیوں نہ ہوتی ——میں نے دوستی کا فرض ادا کر دیا تھا۔ مسکرا مسکرا کر سوچنے لگی۔ زلفی کس قدر احسان مند ہو گی۔ میں نے جہنم سے نکال کر اسے فردوس بریں کی راہ پر ڈال دیا ہے ...... واقعی دوست ہو تو مجھ سا ہو۔ میں نے دیر تک اپنے نیلگوں بستر پر لیٹی مسکراتی رہی۔

دوسری صبح جب میری آنکھ کھلی تو دریچے سے بہار کے خنک جھونکے اندر آرہے اور مرے رخساروں کو چھو رہے تھے اور مرے بستر سے نیلگوں ریشمی چادر اڑی جا رہی تھی۔ قریب ہی شاہ بلوط کی شاخ پر ایک ابابیل بیٹھی نغمہ الاپ رہی تھی۔

میں نے صندل کے پانی سے جلد جلد غسل کیا اور تیار ہو کر نیچے ناشتے کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ میز پر ڈاکٹر گار اور شانو پہلے سے موجود تھے اور قیمے کے گرم گرم سموسے کھا رہے اور کافی پی رہے تھے۔

زونا ش حسب عادت بڑبڑاتی ہوئی ہاتھ میں فرنی ڈونگا لیے دروازے

میں کھڑی تھی۔ اس صبح اس نے ایک گہرے گلابی رنگ کی پوشاک پہن رکھی تھی جو اس کے سیاہ رنگ کو زیادہ نمایاں کر رہی اور اسے خوفناک بنا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی "سلام خاتون روحی۔ آج بڑی دیر سے اُٹھیں آپ۔ میں نے آپ کے لیے تازہ اناس کا رس نکال کر اس میں برف ڈال دی تھی۔ پگھل نہ گئی ہو —— توبہ توبہ اتنی دیر ؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں اکثر بوڑھی جینٹن کی جلی کٹی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ اس لیے چُپ چاپ جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی اور ناشتہ کرنے لگی۔

ڈاکٹر گار اور شانو بے حد خوش نظر آ رہے تھے اور باتیں کیے جا رہے تھے۔ میں نے اناس کا ایک گھونٹ لے کر کہا "بتاؤ شانو، رات کی محفل موسیقی کیسی رہی ؟ تم بہت دیر میں لوٹیں۔"

شانو نے ابھی جواب نہ دیا تھا کہ ڈاکٹر گار بول پڑا۔ "روحی عجب اتفاق ہے۔ رات کی محفل میں بیگم نجم کا وہ مہمان بھی شریک تھا جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔"

"ارے عجب اتفاق ہے۔" میں نے حیران اور خوش ہو کر کہا۔

اس پر شانو بولی "میری بھی اس سے ملاقات ہو چکی ہے رُوحی۔ بلا کا خوش مزاج ہے اور خاندانی آدمی ہے۔ آج اس نے مجھے اس وقت کافی پر مدعو کر رکھا ہے اور شام کو بیگم نجم کے ہاں برج پارٹی پر بھی وہ موجود ہو گا۔ تمہیں بھی چلنا ہو گا۔"

"مجھے تاش کے کھیل سے کوئی دلچسپی نہیں، شانو تم اور گار چلے جاؤ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا پھر بولی "ہو سکا تو فرصت پا کر بعد میں آجاؤں گی۔"

اس کے فوراً ہی بعد شانو اُٹھ کر تیار ہونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تو ڈاکٹر گار نے سگار سلگاتے ہوئے آہستہ سے کہا "بیٹی روحی۔ یہ بھی عجب لڑکی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیگم نجم کے مہمان سے بے تکلفی کے ایسے تعلقات بنا لیے ہیں گویا ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے ہیں۔"

میں ہنس پڑی۔ "تعلقات کی ترقی کی یہی رفتار رہی تو وہ دن دور نہیں کہ دو ہفتوں کے اندر اندر شادی بھی ہو جائے ——— کیوں ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر گار نسوار کی ڈبیا کھولتے ہوئے بولا۔ "اسی کو کہتے ہیں چٹ منگنی پٹ بیاہ۔"

اور یہی ہوا ——— ! بیگم نجم کے ہاں کبھی رقص و موسیقی کی محفلیں ہوتیں کبھی نصف شب کے ہنگامے منعقد ہوتے۔ میں چونکہ اپنی کتاب ختم کر کے دم لینا چاہتی تھی اس سبب ان محفلوں میں شاید ہی شریک ہوتی رہیں نے بیگم نجم کے مہمان کو اب تک نہ دیکھا تھا۔

ایک شام بیگم نجم نے ٹیلی فون کر کے مجھے تنبیہ کی "روحی۔ تم کوہ الماس تفریح و سکون کے لیے آئی ہو یا مصروف مکھی کی زندگی بسر کرنے کے لیے؟ تف ہے تم پر۔ لوگ سال بھر کی تکان دُور کرنے یہاں آتے ہیں اور تم نے سال بھر کی محنت یہیں کرنے کی قسم کھائی ہے۔ آج تمہیں ڈاکٹر گار اور شانو کے ساتھ مرے

ہاں کھانے پر شریک ہونا پڑے گا۔ ہاں ——! تاکید ہے۔" اور انھوں نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

چنانچہ ہم تینوں رات کے کھانے پر بیگم نجم کے ہاں پہنچے۔ میں بھی بے حد خوش تھی کیونکہ دنوں کی محنت کے بعد تفریح کا لطف آرہا تھا۔ بیگم نجم کی محفلوں کے ہنگامے کوہ الماس میں شہرت رکھتے تھے۔

اسی رات پہلی دفعہ مری ملاقات ان کے مہمان سے ہوئی اور واقعی وہ بہت دلکش نوجوان نکلا۔ مگر مجھے ایک بات کا احساس ہوا اور اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی جو ہمیں بے یقینی کا پیام دیتی ہے۔ یعنی یہ نہیں معلوم ہونے پاتا کہ اس قسم کے لوگوں کا کردار کیا ہے۔

نشانو نے مرا تعارف اس سے کرا دیا۔ "روحی، یہ ہیں بیگم نجم کے مہمان ونگ کمانڈر وفائی۔"

"وفائی؟ ——" مری ہنسی نکل گئی۔ پھر شگفتہ لہجے میں بولی۔ "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ کے نام میں پائیداری کی خوشبو آتی ہے۔ وفا کرنا آدمی کی بہت بڑی صفت ہے۔"

ونگ کمانڈر وفائی ہنس پڑے، بولے۔ "زندگی میں جہاں جہاں بھی وفا کرنے کے موقعے سر پر آپڑیں گے اُن سے دریغ نہ کروں گا۔"

اور واقعی وہ بہت باتونی ہے، دلچسپ اور خوش شکل شخص تھا۔

مجھے اور ڈاکٹر گارہ کو کچھ زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ مرحلہ خود بخود طے

ہو گیا جب ایک شام شانو نے مجھ پر اس راز کا انکشاف کیا اور کہا۔ "روحی پیاری، میں نے ونگ کمانڈر وفائی کی طبیعت اور مزاج کو اچھی طرح جانچ لیا ہے۔ تمھیں یہ سن کر متحیر ہونا چاہیے بلکہ خوش ہونا چاہیے کہ ہم اسی ہفتے شادی کر لینا چاہتے ہیں۔ میں نے تار دے کر اپنی خالہ سے اجازت منگوائی ہے۔"

شادی اس کی ہو رہی تھی اور خوش میں تھی۔ بار بار خیال آتا تھا، زُلفی کس قدر خوش ہو گی اپنی راہ سے اس چٹان کے ہٹ جانے سے۔

سوچ سوچ کر اسی دوپہر میں نے اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے زلفی کو ایک تار دیا اور لکھا "چٹان سرکنے لگی ہے، خوش ہو جاؤ۔"

دوسرے ہفتے کوہ الماس کے شاندار ہوٹل "اژدرک" میں شانو کی شادی ونگ کمانڈر وفائی سے ہو گئی۔ شادی میں کوہ الماس کے سبھی معیاری لوگ شریک تھے اور بڑے ہنگامے کی شادی تھی اور کیوں نہ ہوتی، دولہا دولہن کوہ الماس کی ہنگامہ خیز اعلیٰ محفلوں کے دو روشن چراغ تھے۔

اُدھر میں شادی کی دعوت کھا کر باہر نکلی اُدھر تار گھر جا کر دوسرا تار دیا: "چٹان ہمیشہ کے لیے ہٹ گئی ہے۔ تم فوراً پہنچو۔ روحی۔"

تار دے کر میں ایک فخر کا احساس لیے ہوئے گھر واپس آئی اور مسکراتے ہوئے زُلفی کے لیے اُوپر کی منزل میں ایک کمرہ ٹھیک کرنے لگی۔

دوسرے دن میں نے دولہا دولہن کے لیے کھانا تیار کر رکھا تھا اور

سارے زندہ دلانِ الماس کو مدعو کیا تھا اور اسی دن زُلفی پہنچنے والی تھی۔
میں تمام دن دعوت کے انتظام میں مصروف رہی مگر مسلسل مسکراتی رہی۔ سوچتی رہی، میں نے زلفی کی دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ کس قدر خوش ہو گی۔

میں نے ضیافت کا انتظام عرشۂ چمن پر کیا تھا، کیونکہ گرم بہاروں کا زمانہ تھا اور صحرائی پرندرات رات بھر باغ میں نغمہ سنج رہتے تھے۔ میں اور ڈاکٹر گار تیار ہو کر مہمانوں کی پیشوائی کے لیے باغ کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔ آٹھ بجے مہمان آنے شروع ہوئے۔ عشقیہ موسیقی کی تانیں اور تازہ پھولوں کی لپٹیں فضا میں رقصاں تھیں۔ کہیں قہقہے سنائی دے رہے تھے، کہیں لطیفے، ڈاکٹر گار اپنی شب طعامی کے سیاہ کوٹ کی کاج میں گہرے سُرخ رنگ کے گلاب کی ایک مُنّی سی دہکتی ہوئی کلی لگائے بڑے ٹھاٹھ سے انتظام میں مصروف تھا۔ میں بھی اپنے گلابی ریشم کے بھاری جوڑے میں کبھی نوکروں کو ہدایات دیتی ہوئی، کبھی مہمانوں سے ہنسی مذاق کرتی ہوئی اِدھر اُدھر گھوم پھر رہی تھی۔ دُولہا دولہن عروسی لباس میں ملبوس ہاتھوں میں سُرخ انگوروں کے رس کا جام تھامے مہمانوں کے درمیان محوِ گفتگو تھے۔

سارے مہمان آ چکے تھے، اب صرف زُلفی کا انتظار تھا۔ آج شاید جہاز دیر میں پہنچ رہا ہے۔ کئی مہمانوں نے قیاس آرائی کی۔

اتنے میں برساتی میں ایک کار آ کر رُکی۔ میں اپنے گلابی ریشم کے لباس کے دامن سنبھالتی ہوئی زلفی کی پیشوائی کو برساتی میں بھاگی۔

وہ بھی بنی ٹھنی بہار کی تیتری کی طرح کار سے اُتر پڑی اور اُتر تے ہی مجھ سے چمٹ گئی اور سرگوشی کی۔"مری جان روحی کیسے شکریہ ادا کروں تمہارا؟ تم نے مری راہِ حیات سے مصائب کی چٹان ہٹا دی!"

میں اُس کے گلے میں ہاتھ ڈالے مہمانوں میں لے آئی اور بولی "زلفی پیاری۔ سب سے پہلے تم دولہا دولھن سے ملو اور انھیں مبارک باد دو۔ دولھا یہ ہیں ونگ کمانڈر وفائی"۔(پھر زور سے ہنس کر بولی) جن کی گھٹی میں وفا پڑی ہے

میں نے پلٹ کر دیکھا تو مرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ زلفی دولھا کے چہرے کو شعلہ بار نظروں سے تک رہی تھی۔ پھر اُس نے چلّا کر کہا "ہائے روحی۔ یہ وہی ہے۔"

اب مجھے معلوم ہوا اور اب میں اس ستم انگیز حقیقت، سے آگاہ ہوئی کہ چٹان ہٹی نہیں تھی بلکہ ہمیشہ کے لیے حائل ہو گئی تھی ۔

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

○

نقوش:

خالدہ اصغر

سواری

سورج ڈوب رہا تھا اور مجھے شہر پہنچنے کی جلدی تھی۔ کچا راستہ عبور کر کے میں پُل پر ہو لیا۔ دور ۔۔۔ راوی کی مٹی میں سورج اتر رہا تھا۔ بس اب جلتے تانبے سا کنارا رہ گیا تھا۔ میں نے بے دھیانی میں اس کنارے کو دیکھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ مگر کچھ دور جا کے مجھے خیال سا ہوا کہ میں نے کچھ دیکھا اس لیے میں مڑا اور میں نے پُل کے جنگلے پر جھکے وہ تینوں شخص دیکھے۔ وہ تینوں سامنے دریا کی دلدل میں اترتے سورج کو بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے بھی سورج کی جانب دیکھا مگر وہ کچھ نہ پا کر پھر ان تینوں کے چہروں کی طرف نگاہ پھیری۔ ان تینوں کی شکلیں مختلف تھیں جیسے ہم سب کی ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر پھر بھی یوں لگتا تھا جیسے ایک ہی شخص تین بن کر کھڑا ہو۔ ان کے کپڑے اونچے طبقے کے دیہاتیوں کے سے تھے اور جوتوں پر گرد کی تہیں جمی تھیں جیسے وہ میلوں کا سفر کر کے یہاں تک پہنچے ہوں۔ اسی لمحے کی خاطر ۔۔۔ سو کھڑے راوی کی دلدل میں اترتے سورج کو دیکھنے۔ اور اب وہ گہرے انہماک سے، سڑک پر آتی جاتی بھاری، ہلکی سواریوں اور انسانوں سے بے خبر اس سرخ ہوتی دلدل پر نگاہیں جمائے

تھے۔ میں بھی پل بھر کو ان کے قریب رُک گیا۔

اب سورج چھپ چکا تھا اور زمین سے ملتے آسمان پر گہری سرخی پھیلی تھی۔ یک دم ان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف خاموش نگاہوں سے دیکھا اور پھر اُن کے سر جھک گئے۔ پھر خاموش ہی وہ شہر کی دوسری سمت مضافات کو لوٹ گئے۔ میں کچھ دیر کھڑا انھیں مضمحل قدموں سے لوٹتا دیکھتا رہا۔ پھر مجھے شہر میں جاگتی رات کی آوازوں نے چونکایا۔ اب پھیلتی رات کے نیلے دھوئیں میں بتیاں ٹمٹمانے لگی تھیں اور مجھے یاد آیا کہ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی ہے۔ چنانچہ میں تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

اگلے روز جب میں سوکھتے راوی کے پُل پر سے گزرا تو ابھی سورج ڈوبنے میں کچھ دیر تھی۔ سورج کو دیکھ کر مجھے ان تینوں کا خیال آگیا اور میں بغیر ارادہ کیے جنگلے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے خیال بھی نہ آیا کہ جلدی گھر پہنچنا ہے۔ منّا ڈیوڑھی میں کھڑا ریوڑیوں کا انتظار کر رہا ہوگا اور ذکیہ سینما کے لیے تیار ہو گی۔ پھر بھی میں لمحہ بھر کو وہاں رک گیا۔ غروب کا وقت قریب ہی تھا۔ اگلے دن مجھے رات بھر یہی خیال ستاتا رہا تھا کہ وہاں دریا کی دلدل اور سورج کے تانبے میں کیا تھا کہ وہ تینوں اس انہماک سے اسے دیکھتے تھے۔

اب روشنی مدھم پڑ رہی تھی اور سورج کا تانبا بجھی دمکتا تھال زمین کی طرف اتر رہا تھا۔ مگر عین غروب کے وقت دیہات کی سمت تین شخص آتے دکھائی دیے۔ ایک سے قد، ایک سی چال اور لباس۔ جب قریب پہنچے

تو وہی اگلے دن والے شخص تھے۔ وہ پھر چپ چاپ آکر جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے اور اسی انہماک سے ڈوبتے سورج کو دیکھنے لگے۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ تینوں کی آنکھیں کوئلے کی طرح دہکتی تھیں۔ اور ان کوئلے کی طرح دہکتی آنکھوں میں ایک سی اداس چپ بھری تھی۔ اب پھر مجھے حیرت ہوئی کہ مختلف خد و خال رکھنے کے باوجود یہ تینوں ایک سے کیوں لگتے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص خاصا معمر تھا اور اس کا چہرہ گھنی سفید ڈاڑھی میں چھپا تھا۔ دوسرے کا رنگ اپنے دونوں ساتھیوں کی نسبت صاف تھا اور ڈوبتے سورج کی سرخ روشنی میں کندن کی طرح دمکتا تھا۔ اس کے بال جھالر کی صورت گردن پر پڑے تھے اور ماتھے پر چوٹ کا نشان تھا۔ تیسرا پہلے دونوں کی نسبت سیاہ فام تھا اور بے حد چپٹی ناک رکھتا تھا۔ میں انھیں غور سے دیکھتا رہا اور اسی اثنا میں سورج ڈوب گیا۔ پھر ان تینوں نے پہلے کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا لیا اور پھر اپنے راستے پر لوٹ گئے۔

اس رات میرا جی کسی کام میں نہ لگا اور میں پچھتایا کہ آخر میں نے ان سے پوچھا کیوں نہ کہ وہ سوکھتے راوی کی دلدل میں اترتے سورج میں کیا ڈھونڈنے آئے ہیں۔ میں نے ذکیہ سے ان تینوں کا تذکرہ کیا مگر ذکیہ ہنس کر خاموش ہو رہی۔ "ہو نہ ہو کوئی دیہاتی شہر کی سیر کو آئے ہوں گے۔"

میں نے سوچا کہ ذکیہ غلط بھی نہیں کہتی۔ جب تک کوئی ان تینوں کو دیکھے نہیں ان کے اسرار کا احساس نہیں کر سکتا۔ اگلے روز تمام دن

مجھے شام کا انتظار رہا۔ غروب آفتاب کے وقت میں جنگلے پر کھڑا ان کی راہ دیکھنے لگا۔ عین روشنی کے ڈھلتے وہ تینوں اسی طرح ایک سی چال چلتے جنگلے پر آن رکے اور آتی جاتی سواریوں اور انسانوں کے شور سے بے خبر ڈوبتے سورج کو دیکھنے لگے۔ دیکھنے کے عمل میں وہ یوں محو ہوتے تھے کہ اس کے درمیان ان سے بات کرنا بالکل ناممکن لگتا تھا۔ چنانچہ میں سورج کے پوری طرح ڈھلنے کا انتظار کرتا رہا اور سوچا کہ جب یہ تینوں اپنے راستے پر مڑیں گے تب میں ان کا پیچھا کروں گا اور ان سے پوچھوں گا کہ تم کون ہو اور ڈوبتے سورج اور سوکھتے دریا کی دلدل اور شام کے لمحے میں کیا ڈھونڈتے ہو؟

جب سورج پورے کا پورا ڈوب گیا تو ان تینوں نے پھر گنگ اداسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیے۔ اور میں اس بات کا منتظر ہوا کہ اب یہ اپنی راہ لیں اور میں ان کے پیچھے ہو لوں۔ مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ واپس اپنی راہ پر لوٹنے کی بجائے وہ شہر کی سڑک پر ہو لیے ان کی جوتیوں پر گرد کی تہیں جمی تھیں اور ان کے قدم ساتھ ساتھ اٹھتے تھے۔

آخر میں ہمت کر کے ان سے مخاطب ہوا اور میں نے پوچھا:

"بھائیو! تم کس گاؤں سے آتے ہو؟"

چپٹی ناک والے نے گھوم کر مجھے دیکھا اور پھر وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

"وہاں پل پر کیا دیکھتے ہو؟" اب ان کے اسرار سے میرا جی بوجھل ہو رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے میری ٹانگوں میں، سارے جسم میں پگھلا سیسہ

اتر رہا ہے اور میں ابھی چکرا کے گرکر ڈھیر ہو جاؤں گا۔ وہ تینوں میرے اس سوال پر بھی نقش دیوار کی مانند خاموش رہے۔ اب کے میں نے چلا کر ان سے بات کی اور میری آواز بھرا گئی اور آنکھیں جلتے پانی سے بھیگ گئیں۔

"اس سورج کو کیوں دیکھتے ہو؟" میں نے اُن کے قدم کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کی کیونکہ اب وہ نہایت تیزی سے چلنے لگے تھے۔ وہ تینوں میرے اس سوال پر بھی خاموش رہے۔ اب شہر کی سڑک قریب تھی اور سواریوں کی ریل پیل تھی۔ مصروف رات کی آوازیں بہت قریب آگئی تھیں اور ہوا میں جانے اکتوبر کی خنکی تھی۔ کہیں سے چنبیلی کی مہک لہر بن کر آئی تھی اور ہم محصول چونگی کے قریب سے گزر رہے تھے کہ اچانک معمر شخص نے جس کے بال برف کی طرح سفید پڑ چکے تھے کہا:

"کیا تم نے نہیں دیکھا؟ کیا اس شہر کے کسی شخص نے دیکھا؟"

"کیا؟ کیا نہیں دیکھا؟"

"جب سورج ڈوبتا ہے اور ڈوب چکتا ہے!" معمر شخص نے چادر کی بکل ٹھیک کرتے ہوئے کہا:

"سورج ڈوبتا ہے اور ڈوب چکتا ہے! وہ تو ہم روز ہی دیکھتے ہیں۔ بلکہ نہیں دیکھتے کیونکہ سورج روز ہی ڈوبتا ہے۔" میں نے تیزی سے کہا کہ مبادا وہ شخص پھر خاموش ہو جائے۔

"ہم جانتے تھے کہ ایسا ہی ہوگا۔ اسی لیے ہم آئے ہیں۔ یہ پچھلی بستی بھی۔" معمر شخص نے مشرق کی طرف اشارہ کیا اور سر جھکا کے خاموش ہو گیا۔

"ہاں جہاں سے ہم آئے ہیں۔" چپٹی ناک والے نے کہا۔

"کہاں سے؟ مجھے صاف صاف بتاؤ۔"

اس پر درمیان کے شخص نے میری طرف مڑ کے دیکھا۔ اس کے ماتھے پر چوٹ کا نشان پہلے سے بھی گہرا نظر آ رہا تھا۔

"ہم نے بھی نہیں دیکھا تھا اور تم نے بھی نہیں دیکھا۔ کیونکہ سورج روز چڑھتا ڈوبتا ہے اس لیے ہم نہیں دیکھتے۔ اسی لیے جب ادھر (اس نے ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ کیا) سورج ڈوبنے پر سرخی لہو کی طرح گہری ہونے لگی تو ہمیں خبر تک نہ ہوئی اور پھر —" وہ اچانک خاموش ہو گیا جیسے اس کا گلا بندھ گیا ہو۔

یہ سرخی بستی بستی پھیلتی ہے۔ ایسی سرخی میں نے کبھی میں نے اپنی زندگی میں نہ دیکھی تھی۔ نہ ہی میرے بزرگوں نے اور نہ ہی ان کے بزرگوں نے کبھی اپنے بزرگوں سے کوئی ایسی بات سنی تھی۔ اس سے پہلے کا پتہ نہیں۔"

اس پر میں نے پلٹ کر پیچھے رہ جانے والے دریا پر پھیلتے آسمان کو دیکھا۔ اندھیرا خوب سا گہرا ہو چکا تھا اور سڑکوں کی زرد بتیاں ٹمٹماتی تھیں۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی صورتیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ سوائے ان کے سفید سفید کپڑوں یا پھر ان کے دھندلے چہروں کے جب وہ کسی بجلی کے کھمبے تلے گزرتے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ اس اندھیرے میں بھی آسمان کا وہ ٹکڑا آگ کی طرح دھکتا تھا۔

"ہاں واقعی — ہم نے نہیں دیکھا۔" میں نے حیرانی چھپانے کی کوشش

کی۔

"اب تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟" بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

"ہم یونہی شہر کو جا رہے ہیں۔ بعد میں آنے کا کیا فائدہ۔"

میرا جی چاہا ان لوگوں کے ساتھ رہوں۔ انھیں اپنے گھر لے چلوں۔ مگر وہ اچانک ہی دوسری سڑک پر مڑ گئے اور مجھے یاد آگیا کہ مجھے جلدی گھر پہنچنا تھا۔ منا ڈیوڑھی میں ریوڑیوں کے انتظار میں کھڑا ہوگا اور ذکیہ انتظار کرتے کرتے بیزار ہو چکی ہوگی۔

اس سے اگلے روز میں سوکھتے راوی پر رکا اور سورج کو ڈوبتے دیکھتا رہا۔ پورے کا پورا سورج چھپ گیا مگر ان تینوں کا آج کوئی پتا نہ تھا۔ پہلے میں بے چینی سے ان کا منتظر رہا۔ مگر پھر ڈوبتے سورج کی سرخی میں محو گیا۔ آسمان پر گویا لہو کی چادر تنی تھی۔ پھر اچانک اس لہو کی چادر کے سامنے تنہا کھڑے کھڑے مجھے خوف آنے لگا۔ اپنے پیچھے —— بالکل پیچھے —— شانوں کی ہڈیوں کے درمیان مجھے کسی کے وجود کا احساس ہوا۔ کوئی میرے پیچھے کھڑا تھا۔ میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا۔ کوئی بھی نہ تھا —— مگر غلط ہے —— میں نے پیچھے دیکھا ہی کب ہے؟ میں اپنے پیچھے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ نہیں دیکھ سکتا اور میرے پیچھے کوئی موجود ہے۔ میرے اندر یا شاید مجھ سے الگ۔

سواریاں اپنے راستے پر چلی جاتی تھیں۔ بتیاں جل چکی تھیں۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ اور پھیلتی رات میں آسمان کا وہ ٹکڑا لہو کی چادر بنا دمکتا

تھا اور اس کی آنچ دور دور کے اندھیروں تک پہنچتی تھی۔ خوف زدہ ہو کر میں گھر کی طرف بھاگا اور گھر پہنچتے ہی میں نے ذکیہ سے اس واقع کا تذکرہ کیا۔ وہ میرے وہم پر ہنس دی۔ مگر میں اسے چھت پر لے گیا۔ رات کی تاریکی میں بھی وہ سرخی چمک رہی تھی۔ ذکیہ کچھ خاموش سی ہو گئی، پھر بولی:

"کوئی آندھی آئی ہو گی۔"

اگلے روز میں دفتر میں فائل پر جھکا تھا کہ مجیب اللہ نے حفیظ احمد سے کہا:

"یار آج کل سورج چھپنے پر دیکھا ہے آسمان کیسا سرخ ہوتا ہے۔ اندھیرے میں بھی باقاعدہ سرخ رہتا ہے۔"

اس پر مجھے یوں لگا جیسے میں اکیلا اس چادر خون کے سامنے کھڑا ہوں اور مارے خوف کے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اور شام قریب آتی گئی میرے دل میں عجیب دھکڑ پکڑ ہونے لگی۔ میں سو کھتے راوی اور بیل اور آسمان اور سورج سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ ان کا خوف میرے اندر پھیل رہا تھا۔ خوف کے ساتھ ساتھ آسمان کے لہو اور زمین کی دلدل اور ان تینوں شخصوں کی کشش بھی مجھے کھینچ رہی تھی۔ میں نے سوچا میں اپنے ساتھیوں سے ان تینوں دیہاتیوں کا تذکرہ کروں کہ اس لہو رنگ شام کی آمد کے ساتھ ساتھ تین دیہاتی بھی، جو مختلف صورتوں کے باوصف ایک سے تھے، اس شہر میں اترے تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے مجھے یہ سرخی دکھائی تھی اور دکھا کر خود ایک سڑک پر گھوم گئے اور شہر

کی بھیڑ میں گم ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے وہ بھی بستی بستی اس لہو رنگ شام کے ساتھ ساتھ گھومتے ہیں۔ میں نے انھیں شہر میں بہت ڈھونڈا ہے مگر کہیں ان کا نام و نشان نہیں۔

مگر مجیب اللہ اور حفیظ احمد دونوں مجھ سے بات کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ عرصہ ہوا ان دونوں نے مجھ سے دس بیس روپے قرض لیے تھے جو نہیں لوٹائے تھے اور اب وہ مجھ سے پرخاش رکھتے تھے۔

چنانچہ میں خاموش رہا اور گھر لوٹتے ہوئے جب پل پر پہنچا تو میں نے اپنی رفتار تیز کر دی، اور ڈوبتے سورج کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور شہر کی سڑک کو بغور دیکھتا رہا۔ مگر پھر بھی وہ لہو رنگ شام میرے ساتھ ساتھ چلتی ——— آگے پیچھے پھیلتی ——— سانس لیتی جھکتی چلی آتی تھی۔ میرے سامنے پھیلتے شام کے پھیکے اندھیرے میں کجلائے آسمان پر سیاہ پرندوں کی ٹولیاں آٹھ کے ہندسے کی شکل میں اڑتی جاتی تھیں۔ ان کی طرح میں بھی اپنے ٹھکانے کو لوٹ رہا تھا ——— ٹھکانا کہ جو اب محفوظ نہ رہا تھا کیونکہ لہو رنگ شام اس کی کھڑکیوں، دروازوں، ٹھوس دیواروں میں سے بہ بہ کر اسے اپنے آپ سے بھر رہی تھی۔

اب میں رات گئے تک شہر میں گھومتا، ہر قسم کی دکان میں جھانکتا کہ شاید کہیں وہ گرد آلود جوتیوں اور سفید چادروں کی بُکلوں میں چھپے ہیاتی نظر آجائیں اور میں ان سے پوچھ پاؤں کہ یہ سرخی کہاں سے آتی ہے اور اس کے آنے کے بعد کیا آتا ہے، تم پہلی بستی کیوں چھوڑ آئے۔ اور اب

وہ کس حال میں ہے؟ مگر مصروف تیز رفتار کلبل کلبل کرتے شہر میں کہیں ان کا نام ونشان نہ تھا اور اہلِ شہر تجارت میں کمال منہمک تھے۔

مگر کچھ ہی دنوں میں شہر میں شام کے وقت میں نے کچھ آدمیوں کو مغرب پر پھیلتی سرخی کی طرف اشارہ کرتے دیکھا۔ معلوم نہیں یہ سرخی کی اطلاع چند ہی دن میں کیوں کر آج کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی میں نے تو سوائے ذکیہ کے اور کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ پھر سب نے اس چہ نچکاں آسمان کو کیوں کر دیکھ لیا، اس پر مجھے خیال آیا کہ وہ دیہاتی یقیناً شہر میں موجود ہیں۔

اب ہر جگہ اس سرخی کے چرچے تھے۔ چودھری صاحب میرے پرانے واقف کاروں میں سے ہیں اور مز نگ کے چونک میں کتابوں کی دکان کرتے ہیں۔ شام گئے ان کے یہاں دوست احباب کی صحبت رہا کرتی ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے میں نے وہاں جانا ترک کر رکھا تھا۔ کچھ دنوں سے مراد یہی کہ جب سے وہ تینوں شخص مجھے ملے تھے اور اب تینوں کے غائب ہو جانے پر ایک عجیب اضطراب مجھ پر حاوی ہو گیا تھا۔ کیا گھر اور کیا باہر — گھر میں میرا جی چاہتا باہر جاؤں اور باہر آکر سوچتا نہیں گھر زیادہ محفوظ تھا۔ پھر میں کچھ بھی فیصلہ نہ کر پاتا کہ مجھے کہاں ہونا چاہیے اور ایک بوجھل پن میرے جی پر آن پڑتا۔

اس شام میں یونہی، پرانے وقتوں کی طرح، چودھری صاحب کی دکان پر جا نکلا۔ کچھ پرانے کچھ نئے لوگ جمع تھے۔ مجھے دیکھتے ہی چودھری

صاحب بولے:

"کیوں بھائی، تمھارا کیا خیال ہے؟ کہتے ہیں یہ سب ایٹمی تجربات کا اثر ہے۔ سنا ہے اب دنیا کے سرد حصّے گرم اور گرم سرد ہو جائیں گے، رُتوں کا سلسلہ بھی بدل جائے گا!"

اس وقت میں نے پھر سوچا کہ ان تین دیہاتیوں کی واردات ان کو سناؤں، مگر اتنے ہجوم میں بات کرنے کو میرا جی نہ چاہا اور میں چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ کر اخبار دیکھنے ہی لگا تھا کہ اس شوم گھڑی کا نزول ہوا۔

اچانک ایک تیز، ناخوشگوار سی مہک کہیں سے آئی۔ ایسی مہک میں نے آج تک کبھی نہ سونگھی تھی۔ اس مہک کے آتے ہی میرا دل اندر ہی اندر ڈھینے لگا اور معلوم نہیں جسم کے کسی حصّے میں بڑا گہرا مگر میٹھا میٹھا سا درد اُٹھا۔ دراصل میں آخری وقت تک فیصلہ نہ کر پایا کہ وہ مہک تھی یا درد۔ اس کی ناخوشگواری سے گھبرا کر میں نے اخبار میز پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا سب نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

"کیا بات ہے، کہاں چل دیے؟" چودھری صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جا رہا ہوں۔ معلوم نہیں یہ کیسی مہک ہے۔" میں نے گہری گہری سانسیں لے کر کہا۔

"مہک ——— مہک کیسی؟" چودھری صاحب نے ہوا میں سونگھ کر کہا۔

اور میں ان سے بات کیے بغیر گھر کی طرف چل دیا۔ رستہ بھر اس عجیب و غریب ناخوشگوار دردناک دہشت بھری مہک کی لہریں آتی جاتی رہیں اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں چکرا کر گر جاؤں گا اور چکرا کر گرنے سے پہلے کے نیلے نیلے اندھیرے میری آنکھوں میں گھومتے رہے۔ جب میں گھر پہنچا تو ذکیہ مجھے دیکھ کر گھبرا گئی۔

"کیا بات ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے نا، چہرے پر کیسی زردی ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ مہک معلوم نہیں کیسی ہے۔" میں نے ماتھے کا پسینہ پونچھا حالانکہ وہ نومبر کا مہینہ تھا۔

ذکیہ نے ہوا میں سونگھ کر کہا: "یہ پڑوس میں جانے دن رات کیا معجون بنتے رہتے ہیں۔ حکیم صاحب کے یہاں اسی کی بو ہے اور پھر آج ہنڈیا بھی لگ گئی تھی۔"

"مگر یہ تو ہر جگہ ہے —— ہر سڑک پر —— تمام شہر میں۔"

"موسم جو بدلا ہے۔ سردی کے پھول پتوں کی مہک ہو گی۔"

ذکیہ نے بے دھیانی سے کہا اور سلائی پر ان کے خانے ڈالنے لگی۔ پھر میں نے ڈرتے ڈرتے ہوا میں سونگھا تو یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ مہک باقی ہے یا نہیں۔ شاید وہ ختم ہو چکی تھی۔ اس کے ختم ہونے پر مجھے بے حد خوشی ہوئی مگر پھر بھی اس کی یاد میرے اندر باقی تھی جیسے چوٹ کے بعد سوزش رہ جائے۔ اور اس خیال سے مجھے کپکپی آ گئی کہ شاید وہ مہک لوٹ آئے مگر دفتر کے کام کاج میں میں اس حادثے کو بھول گیا۔ آج میرے سامنے فائلوں

کا ڈھیر لگا تھا۔ مجیب اللہ اور حفیظ احمد بڑے زور شور سے کسی فلم پر بحث کر رہے تھے اور کاغذات کا مفہوم میرے ذہن سے پھسل پھسل جاتا تھا۔ تنگ آ کر میں نے گھنٹی کا بٹن دبایا اور چپراسی کو ہاف سیٹ چائے کا آرڈر دیا اور جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی مگر عین اسی وقت مجھے ایک شدید جھٹکا لگا جیسے میں کسی بے انتہا اونچان سے گر گیا ہوں۔ ایک تیز چکر کے ساتھ نیلے پیلے اندھیرے میرے گرد گھوم رہے تھے۔ میں نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور کچھ دیر بعد مجھے معلوم ہوا کہ دراصل وہ درد اور دہشت بھری مہک پھر لہر در لہر کہیں سے آ رہی ہے۔ میں نے دیوانہ وار کھڑکیاں بند کرنا شروع کیا۔ مجیب اللہ اور حفیظ احمد نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

"بھئی، دھوپ آنے دو۔ بند کیوں کرتے ہو؟" حفیظ احمد نے اپنے مخصوص بھنچے بھنچے لہجے میں کہا۔

"یہ مہک — تمہیں آ رہی کیا — کس قدر ناقابل برداشت ہے۔"

مجیب اللہ اور حفیظ احمد نے ہوا میں ناک اونچی کر کے سونگھا اور پھر حفیظ احمد نے قدرے تامل سے کہا:

"ہاں یار۔ یہ کیسی بو ہے۔ یا شاید خوشبو۔ اس سے تو دل خراب ہونے لگتا ہے۔"

اس روز میں نے شہر میں کچھ اور لوگوں کو بھی اس مہک کا تذکرہ کرتے سنا، جس کی لہریں کی لہریں آتی تھیں اور پھر ختم جاتی تھیں، پھر آتی تھیں اور ختم جاتی تھیں۔ مگر شام کو غروب آفتاب کے وقت ان میں تیزی اور شدت

آتی جاتی ۔ یہاں تک کہ چند ہفتوں میں اس مہک یا لو کا یہ عالم ہو گیا کہ اکثر مجھے سانس لینا دشوار ہو جاتا ۔ اب اس شہر کے دمکتے چہرے ان لہروں پر یک دم زرد پڑ جاتے تھے ۔ اکثر لوگوں کو گرانی اور خفقان کا آزار رہنے لگا اور ڈاکٹروں کا کاروبار خوب چمکا ۔ دانشوروں کا کہنا تھا کہ ایٹمی تجربات سے دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف اثرات ہو رہے ہیں ۔ یہ عجیب وغریب مہک بھی انہی تجربات کا اثر ہے اور اسی باعث لوگوں کے اعصاب کی حالت نازک ہو گئی ہے ۔ چنانچہ سب سے پہلے دکانوں سے اعصابی تھکن دور کرنے کی دوائیں ختم ہونا شروع ہوئیں ۔ یہ بھی نہ تھا کہ دوائیں کم مقدار میں آتی ہوں مگر اہل شہر میں اس دوا کی ذخیرہ اندوزی کا عجب جنون پھیلا تھا کہ چند ہی دن میں نیند کی گولیاں بھی گوہر نایاب ہو گئیں ۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے دونوں دواؤں کو بے سود پایا ۔ درد و دہشت بھری مہک کی وہ لہریں اپنی کاٹ میں تلوار سے زیادہ تیز تھیں اور آدمی کے اندر اتر جاتی تھیں ۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کے سامنے یہ تجویز پیش کر دوں کہ اس تلوار کی کاٹ کاٹتی مہک سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس سے مانوس ہو جائیے ، اسے اپنا شامہ جانیے ۔ دواؤں سے کوئی فرق نہ پڑے گا ۔ مگر ایک عجیب بے دلی کے ہاتھوں میں خاموش رہا گو کچھ عرصے بعد ہی خود بخود یہی طریق کار سب نے اختیار کیا ۔

اس مہک نے شہر میں دہشت کو عام کر دیا تھا ۔ گو کوئی بھی بظاہر دہشت کو تسلیم نہ کرتا تھا مگر سب ہر لمحے کسی ان جانے حادثے کے خوف سے سہمے تھے

اور یہ سہم کچھ بے جا بھی نہ تھا کہ چند ہی ہفتوں بعد آخر وہ حادثہ رونما ہوا۔

وہ وسط دسمبر کی ایک شام تھی۔ میں چودھری صاحب کی دکان سے اٹھ کر گھر کی جانب آ رہا تھا۔ ہر طرف سواریوں اور انسانوں کی ریل پیل تھی۔ دکانیں جگ مگ جگ مگ کرتی تھیں اور اہل شہر بظاہر زندگی کے جھمیلوں میں مصروف تھے۔ اس دہشت درد بھری مہک کی لہریں کبھی کبھی کاٹ کر گزر جاتیں۔ میرا سر چکرا جاتا۔ میں رک جاتا اور پھر لہر کے گزرنے کے بعد چلنے لگتا۔ اب تمام اہل شہر کا یہی دستور ہو گیا تھا گو وہ خود اس کا علم نہ رکھتے تھے۔ کوئی باہر سے آنے والا انھیں دیکھتا تو حیران ہوتا کہ آخر یہ چلتے چلتے، کام کرتے کرتے ان آدمیوں کو کیا ہوتا ہے کہ اچانک رک جاتے ہیں، آنکھیں بند کرتے ہیں، سانس روک لیتے ہیں اور پھر ایک گہری سانس لے کر مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہاں، اب یہی ہم سب کا معمول تھا۔ وسط دسمبر کی اس شام میں پل کے قریب تھا کہ اچانک میرے سر پر ایک برچھی لگی۔ چکرا کر میں نے بجلی کے کھمبے کا سہارا لیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھاما۔ مگر برچھی تو کہیں بھی نہ تھی، اور نہ ہی برچھی مارنے والا کوئی ہاتھ۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ دراصل یہ برچھی نہیں اسی مہک کی نہایت شدید ـــــ ناقابلِ برداشت حد تک شدید ـــــ لہر تھی۔ خوف نے مجھے منجمد کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس گویا مہک (معلوم نہیں وہ کیا تھی) کا سر چشمہ کہیں میرے قریب، بہت قریب پہنچ گیا ہو۔ میرے شانوں کی ہڈیوں کے درمیان۔ گردن کے قریب۔ میرے عین پیچھے۔ کہیں مجھ سے اتنا قریب کہ مجھ سے الگ بھی نہ ہو۔

مگر اچانک میری نظر سامنے آنے والی ایک عجیب و غریب سواری پر جا رکی۔ وہ ایک بہت بڑا گڈا تھا جسے دو سفید بیل کھینچ رہے تھے۔ بیلوں کی آنکھوں پر سیاہ کھوپے چڑھے تھے اور ناکوں میں موٹے موٹے رسّے۔ اور سفید جلد تلے ان کی پسلیاں اور کولہوں کی ہڈیاں سانس لیتی تھیں اور رسوں جڑے نتھنوں سے سانس کی گرم بھاپ ـــــ گڈے کے چاروں طرف لکڑی کا جنگلا سا بنا تھا۔ اور اس کے اندر سیاہ پردے تنے تھے۔ دراصل وہ پردے بھی نہ تھے۔ جیسے ہلتی لہریں کھاتی اندھیرے کی دیواریں۔ سامنے تھوڑی سی جگہ خالی تھی اور سیاہ پردے سے باہر دو گاڑی بان بیٹھے ہڈیوں بھرے اندھے بیلوں کو ہانکتے تھے۔ ان گاڑی بانوں کی شکلیں اندھیرے کی وجہ سے میں نہ دیکھ سکا اور پھر سیاہ کپڑوں پر انھوں نے ملگجی چادروں کی بکلیں بھی مار رکھی تھیں کہ ان کے آدھے آدھے چہرے چھپ گئے تھے۔ ان کے سر جھکے تھے جیسے لمبی مسافت کے بعد نیند کا غلبہ ہو۔ ان کی پشت پر وہ سیاہ پردہ (یا دیوار) ہولے ہولے ہلتا تھا۔ اور سیاہ پردے (یا دیوار) کے اندر اندھیرا بھرا تھا اور اس گھپ اندھیرے کے گرد سیاہ پردے تنے تھے اور ان پردوں میں سے درد دہشت بھری مہک کی وہ لہریں اٹھتی تھیں جن کی کاٹ تلوار سے بڑھ کر تیز تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی میرے قریب سے گزر گئی اور میں چکرا کر کچھے میں اتر کر قے کرنے لگا۔

مجھے معلوم نہیں اہلِ شہر نے اس شام اس گاڑی کو دیکھا یا نہیں، اور جو دیکھا تو ان پر کیا گزری۔ میں بمشکل گھر پہنچا اور چارپائی پر گر گیا۔ ذکیہ نے مجھ سے

بہت پوچھا مگر ایک گند دہشت نے میری زبان بند کر رکھی تھی۔

چند روز بعد اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی کہ شہر کی میونسپلٹی انتہائی غیر ذمہ دار ہوتی جا رہی ہے۔ کوڑے کرکٹ بھری گاڑیوں کو سرِ شام شہر کی اہم سڑکوں سے نہیں گزرنا چاہیے۔ اس سے فضا متعفن ہوتی ہے اور اہلِ شہر کبیدہ خاطر۔

میں نے دفتر سے ہفتے بھر کی چھٹی لی تھی اور ان سات دنوں میں شہر کی کیفیت خود نہ دیکھ سکا۔ مگر اخبار سے معلوم ہوتا تھا کہ ایک عجیب غریب گاڑی سیاہ پردوں میں، غالباً کوڑا کرکٹ بھرے، شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرتی ہے جس کے گاڑی بان خوابیدہ ہوتے ہیں۔ یہ گاڑی مضافات سے ہوتی شہر سے گزرتی ہے اور پھر میونسپلٹی سے مطالبے کہ اس قسم کی ناخوشگوار گاڑیوں کا شہر میں ورود بند کیا جائے یا ان کے لیے کم آباد رستہ مقرر کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔

ساتویں روز میں گھر سے نکلا۔ ان سات دنوں میں اہلِ شہر کس قدر بدل چکے تھے۔ چاروں سمت زرد زرد بے خواب چہرے جل بھر رہے تھے، جو بے فکر اور لاپروا نظر آنے کی کوشش میں بڑے زرد بھرے انداز میں مضحکہ خیز ہو گئے تھے۔ (اور مجھے یاد آیا کہ آج صبح آئینے میں میرا چہرہ بھی ایسا ہی تھا)

شہر میں اچانک تفریحی تقریبات بکثرت ہونے لگی تھیں اور اہلِ شہر جوق در جوق ان تقریبات میں جاتے تھے، بلکہ وقت سے بہت پہلے دروازوں پر منتظر رہتے تھے اور واپسی پر ان کے چہرے پہلے سے زیادہ زرد اور

مضحکہ خیز نظر آتے تھے۔

دفتر میں میں نے فائلوں کی طرف توجہ کرنے کی کوشش کی مگر بار بار میری آنکھوں کے سامنے وہ گاڑی آجاتی تھی۔ میونسپلٹی کے گڈے اس صورت کے تو نہ کبھی تھے۔ اس کے نیم خوابیدہ گاڑی بان، آنکھوں بند سے، ہڈیوں بھرے بیل اور سیاہ پردوں کے اندر بھرا اندھیرا اور اس کی درد دہشت بھری مہک جس نے اہلِ شہر کو متلی میں مبتلا کر دیا تھا اور ان کے چہروں کا رنگ نچوڑ لیا تھا اور ان کی آنکھوں کی چمک دھوڈالی تھی۔ وہ پردوں ڈھکا اندھیرا بار بار میرے سامنے آئے جاتا تھا۔ کسی چیز کی باس ایسی ہو سکتی تھی؟ تعفن اور خوشبو کا مرکب؟

اچانک ایک پاگل خواہش سے میرا گلا رک گیا۔ میں نے تصور میں دیکھا کہ میں اندھا دھند اس گاڑی کی جانب بھاگا جاتا ہوں اور بانہہ سے اس کا پردہ ہٹاتا ہوں۔ اندر دیکھتا ہوں ــــ اندر کیا ہے ــــ؟ اس تعفن اور خوشبو کی اصل دیکھنے کی خواہش نے پاگل پن کی طرح مجھے جکڑ لیا۔ اس لیے آج پھر غیر ارادی طور پر میرے پاؤں راوی کے پل پر دھیمے پڑ گئے۔ سورج ڈوبنے میں ابھی کچھ دیر تھی اور درد دہشت بھری مہک کی لہریں ہولے ہولے تیز ہو رہی تھیں۔ جنگلے کے ساتھ لگ کر ایک عجیب خوف نے مجھے گھیرا دریا کی دلدل بانہیں پسارے مجھے بلا رہی تھی۔ تہ دار ــــ نگل جانے والی دلدل ــــ اور مجھے خدشہ ہوا کہ مبادا میں اس میں کود جاؤں اور اس میں اترتے سورج کے ساتھ جذب ہو جاؤں اور ہمیشہ کے لیے اس چادر

خون میں دفن کر دیا جاؤں۔ مجھے یوں لگا کچھ میرے قریب آ رہا ہے یا میں خود کسی چیز کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ وہ حبس کا مجھے —— نہیں ہم سب کو —— ہم سے پہلوں اور ہم سے بعد کے آنے والوں کو انتظار ہے اور میرا جسم پتھرا رہا ہے مگر اس پل اور دلدل اور سورج سے نجات نہیں۔ وہ میرے اندر ہیں اور میرے ساتھ۔ میں نے بے بس ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا کہ اچانک میرا دل رک گیا۔

تین شبیہیں ایک سی چال میں چادروں کی بکل مارے چلی آتی تھیں۔ میں پتھرائی آنکھوں سے مضافات کی سمت انھیں دیکھتا رہا، یہاں تک کہ وہ لوگ قریب آن رکے۔ آج معمر شخص کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے اور اس کی سفید داڑھی ان سے تر تھی۔ باقی دونوں کی آنکھیں جھکی تھیں اور دانت بھنچے تھے اور چہروں پر موت کی زردی کھنڈی تھی۔

"تم اتنے روز کہاں غائب رہے۔ میں تمھیں ڈھونڈتا رہا۔ مجھے بتاؤ یہ شہر میں کیا ہو رہا ہے۔" میں نے لڑکھڑاتی زبان میں ٹوٹتے سانسوں کے درمیان کہا۔

"ہم انتظار کر رہے تھے۔ ہم اپنے آپ کو روک رہے تھے۔ ہم نے اپنے آپ کو باندھ رکھا تھا۔ یہ دیکھو۔"

معمر شخص اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اپنی باہیں میرے سامنے پھیلائیں اور اپنے شانے اور پشتیں جن پر رسوں کے نشان کندہ تھے۔

"ہم یہاں نہیں آنا چاہتے تھے۔" معمر شخص کی آواز ہچکیوں میں ڈوب

گئی۔

"مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ——" دوسرے کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ یک دم وہ پیٹ پکڑ کے دوہرا ہو گیا اور اس کے ساتھی بھی شدید کرب میں جھک گئے۔ اس دکھ دہشت بھری مہک کی شدید لہریں گزر رہی تھیں: ہمیں کاٹتی ہوئی، ہمارے اندر جذب ہوتی، ہمیں چوستی ہوئی۔

"وہ دیکھو!" معمر شخص نے اچانک دیہات کی طرف اشارہ کیا اور پھر تینوں کے چہرے موت کی زردی میں ستے گئے۔ میں نے دیکھا گرد اڑاتی راہ پر سیاہ گاڑی کا ہیولا ابھر رہا ہے۔ سفید بیل، جن کی آنکھوں پر سیاہ کھوپے چڑھے ہیں اور ناکوں میں موٹے رسّے اور سیاہ کپڑوں، ملگجی چادروں کی بکلوں میں چہرہ چھپائے نیم خوابیدہ گاڑی بان جو شاید اس کاٹتی چوستی دکھ دہشت بھری مہک کی ہمہ وقت قربت سے بے ہوش رہتے ہیں۔ اور ان کے پیچھے سیاہ پردے —— ایک لرزش مجھے سر سے پاؤں تک روند گئی۔ تینوں دیہاتیوں کی آنکھوں سے چمک رخصت ہو گئی جیسے وہ موت کے قریب ہوں۔ گاڑی آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی اور اس کی کاٹتی مہک ہمارا لہو چوس رہی تھی۔ گاڑی بالکل قریب آ گئی، یہاں تک کہ ہمارے برابر سے گزر گئی۔ گاڑی بانوں کے چہرے چادروں میں چھپے تھے اور سیاہ پردے (یا دیواریں) مدھم ہوا میں ہلنے کے باوجود نہ ہلتے تھے۔

اچانک وہ تینوں اس گاڑی کے پیچھے بھاگے اور ایک ساتھ انھوں نے پردہ اٹھا دیا۔ ان کے سر پردے میں چھپ گئے مگر پردہ اُٹھنے کے

باوجود نہ اٹھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ایک دہشت زدہ غیر انسانی چیخ کے ساتھ وہ تینوں پلٹے اور دیوانوں کی صورت دیہات کی طرف بھاگے۔

"تم نے کیا دیکھا؟ تم نے کیا دیکھا؟" میں ان کے پیچھے بھاگا مگر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ بھاگتے رہے۔

"بولو — بولو —" میں نے ان کی منت کی۔ مگر وہ بھاگتے رہے۔ یہاں تک کہ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ بھاگتا شہر سے کوسوں دور نکل آیا۔

"مجھے بتاؤ — مجھے بتاؤ —" بالآخر میں نے معمر شخص کی چادر پکڑ لی۔ اس نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھیں میری جانب پھیر دیں اور پھر اپنا منہ کھول دیا۔ اس کی زبان تالو کے ساتھ چپک چکی تھی۔

وہ تینوں گنگ ہو چکے تھے۔

میں چکرا کر گر گیا مگر وہ تینوں بھاگتے رہے اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کے پیچھے گرد اڑتی رہی، پھر وہ بھی بیٹھ گئی اور میں گھر لوٹ آیا۔

مہینوں میں نے ان تینوں کو ڈھونڈا ہے مگر کہیں ان کا نام نشان نہیں۔ اسی دن سے گاڑی نے اپنا راستہ بدل لیا ہے۔ اب وہ شہر سے نہیں گزرتی، پل سے ہو کر کچے میں اتر جاتی ہے اور مضافات کا رخ کرتی ہے۔ اہل شہر اس دکھ دہشت بھری مہک کے اس طرح عادی ہو چکے ہیں کہ اس کا احساس نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ وہ تلوار کی کاٹ کا تیز لہریں مر گئیں۔ بھولی بسری کہانی کی طرح — مگر میں اب بھی انھیں اپنے جسم میں اترتا جان پاتا ہوں اور کوئی دن رات میرے اندر لپکتا ہے:

اُب تمھاری باری ہے — اب تم دیکھو گے۔"
اور آج میں اس پل پر آن کھڑا ہوا ہوں، اس سواری کے انتظار میں۔

سویرا:

خدیجہ مستور

راستہ

گھٹیا چائے خانے کا ریڈیو فرمائشی پروگرام سنا رہا تھا۔ وہ بھی ایسے زور شور سے کہ لتا کی آواز کا جادو دُور دُور تک چھایا جا رہا تھا۔ جنوری کی اس انتہائی سرد رات میں اُس نے محسوس کیا کہ وہ واقعی بہت اُداس ہے۔ تنہا ہے اور اسے کوئی گلے سے نہیں لگاتا۔ اس نے دل ہی دل میں لتا کے گائے ہوئے بول دہرائے "مجھے گلے سے لگا لو۔ بہت اُداس ہوں میں"

اس نے بجھی بجھی نظروں سے چائے پینے والوں کی طرف دیکھا اور پھر اپنی چائے کی ایک پیالی کے دام ادا کر کے لمبے کی سیاہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

سامنے کے سینما ہاؤس سے آخری شو شروع ہونے کی گھنٹی کی آواز اسے بہت صاف سنائی دے رہی تھی۔ سڑک کے اُس پار کھڑے کھڑے اس نے ایک لمحے کو ذرا دلچسپی سے اس طرف دیکھا۔ وہ لوگ جو تیسرے درجے کے ٹکٹ نہ خرید سکے تھے، ان میں قیامت کی نفسا نفسی تھی اور جنھیں ٹکٹ مل گیا تھا وہ سینما ہال کے دروازے پر جیسے ہلا بول رہے تھے۔

اُس نے بڑی احتیاط سے پرانے مفلر کو کانوں پر لپیٹ لیا اور لنڈے بازار سے خریدے ہوئے اوور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ چھپا کر آہستہ آہستہ فٹ پاتھ

پر چلنے لگا۔

یہ راتوں کو بارہ بارہ بجے تک کی آوارہ گردی جیسے اس کا نصیب بن چکی تھی۔ ان راتوں میں چاہے کہر پڑ رہی ہو، چاہے چھاجوں بارش ہو رہی ہو، یا مارے گرمی کے سر سے پاؤں تک پسینہ بہہ رہا ہو، وہ یونہی بے مقصد ٹہلتا اور سوچا رہتا۔

اُن اَن گنت راتوں میں جب وہ ٹہل ٹہل کر تھک جاتا تو جانے کتنی بار اپنی ناکامیوں اور حسرتوں پر چپکے چپکے رویا۔ محرومیوں کے احساس نے اُسے تڑپایا۔ یہیں ان سڑکوں پر گھومتے ہوئے اس نے اپنے مستقبل کو سنوارنے کے منصوبے بنائے۔ انہی سنسان راتوں میں اس نے بچّوں کی طرح بند دکانوں کے شوکیسوں کو دیکھا۔ ٹنگے ہوئے خوبصورت کپڑوں کو اپنے جسم پر سجایا، ساریوں میں لپٹی ہوئی معصوم حسین مورتیوں کو اپنے سینے سے لگایا۔ مورتیوں کو دیکھ دیکھ کر سوچا کہ کیا زبان اور دماغ بے وفائی کی علامتیں ہیں۔ اور یہیں اس نے بڑے فلسفیانہ انداز سے اپنے حساب بہت بڑی بڑی باتیں سوچیں۔ دُنیا کے بے پناہ حُسن کا اندازہ لگایا۔ یہیں اس نے جنگ اور امن کے مسائل پر غور کیا اور انہی سڑکوں پر چاندنی سے بھرپور ایک رات میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو جائے گا۔ ایک دن تو وہ گھنٹوں یہ سوچ کر غصّے اور خطرے سے لرز رہا تھا کہ پڑوسی ملک اُس کے وطن کی سرحدوں پر فوجیں جمع کر رہا ہے۔ اسے اپنے پڑوسی ملک کی بدمذاقی پر افسوس ہوا تھا۔ کیا وہ مُلک ویرانہ ہے؟ وہاں لوگ نہیں بستے؟ وہاں حسن جنم نہیں لیتا؟ جس ملک میں عورت بندیا لگاتی ہو، اُس کے پاؤں میں گھنگھرو بجتا ہو، اور جہاں گنگا جمنا بہتی ہو، وہ جنگ کی باتیں کیسے کرتا ہے؟ اس نے عہد کیا

تھا کہ اگر اس کے ملک پر ذرا سی بھی آنچ آئی تو وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دے گا۔ مگر وہ اس مسحور کن فضا میں زہر نہ گھلنے دے گا۔ یہ سب سوچتے ہوئے اس کے لاغر جسم میں جانے کہاں کی طاقت آ گئی کہ وہ سینہ تان کر بڑی دیر تک لیفٹ رائٹ کے انداز میں چلتا رہا۔

وہ اپنے امکان بھر کبھی سرِ شام گھر نہیں گیا۔ تنہا، ویران دو کمروں کا گھر اسے کھانے کو دوڑتا۔ گھر کے راستے پر ہی اسے اپنی مرحومہ ماں یاد آنے لگتی۔ اس کی بیوہ ماں نے محنت مشقت کر کے اسے تعلیم دلائی تھی۔ وہ تعلیم حاصل کرتے ہوئے سوچا کرتا تھا کہ اپنی اس تھکی ہاری ماں کو ایک دن سونے کے تخت پر بٹھا دے گا، مگر جب وہ ایم اے کا امتحان دینے والا تھا تو اس کی ماں ایسی تھکیں کہ سونے کے تخت کا بھی انتظار نہ کیا اور ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر لیٹ کر ہمیشہ کے لیے سو گئیں۔

گھر کی تنہائیوں میں اسے نجمہ یاد آتی۔ اس نے اسے فیل ہوتے دیکھ کر محبّت اور منگنی دونوں سے منہ موڑ لیا اور شاندار مستقبل والے سے شادی رچا کر رخصت ہو گئی۔ پھر وہ ایم اے نہ کر سکا۔ نجمہ کی بے وفائی نے اس کے مستقبل پر ایسی لات ماری کہ نفرت کے باوجود اسے کلرکی قبول کرنی پڑی۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بے وفائی کا دُکھ دُنیا کے سارے دکھوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔ رات سوتے میں بھی نجمہ اس کے سینے پر دھم دھم کر کے اسے روندتی رہتی اور وہ مارے اذیت کے چین نہ سو پاتا۔ ان لمحوں میں اس نے کئی بار سوچا تھا کہ قانون میں قتل کی سزا پھانسی ہے مگر یہ بے وفائی کا جرم کسی قید بند میں نہیں آتا! یہ بھی مزے کی بات ہے کہ سر توڑنا تو جرم ہے مگر دل توڑنا جُرم

نہیں! اگر وہ وزیر قانون ہوتا تو ضرور ایسا قانون بناتا کہ دل توڑنے والوں کو بیچ چوراہے پھانسی دے دی جاتی۔ پھر وہ اپنی اس اوٹ پٹانگ سوچ بچار پر خود ہی بے بسی سے ہنسنے لگتا، اگر وہ وزیر قانون ہوتا تو پھر بے وفائی کا دکھ ہی کیوں سہنا۔

نجمہ کو بھولنے اور خود کو بہلانے کے لیے اس نے بڑی ہماہمی سے زندگی گزارنی چاہی۔ اس نے کتنی ہی بار عورت کو خریدا مگر اسے سچی خوشی نصیب نہ ہوئی۔ اس نے ہر بار سوچا کہ عورت کو خریدنے کے لیے چاہے سب کچھ خرچ کر دو مگر گھاٹے کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ اس کا گھر تو اور بھی ویران ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جلد ہی اس چکر سے نکل گیا مگر کسی کو اپنا بناتے اور محبت کرنے بھی ڈرتا۔ نجمہ نے اس کی زندگی سے اعتماد چھین لیا تھا۔

جنوری کی اس انتہائی سرد رات میں وہ ٹہلتے ٹہلتے تھک چکا تھا۔ آج اس کے سارے جذبات اس کے گلے آ لگے تھے۔ آج اس نے اپنی تنہائی اور اداسی پر دل ہی دل میں خوب ماتم کیا تھا اور اس طرح اس کے دل کا غبار چھٹ گیا تھا۔

اب وہ تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا اور گھر پہنچ کر جلدی سے سو جانا چاہتا تھا۔ مال روڈ کی بڑی اور چھوٹی دکانیں، دیر ہوئی، بند ہو چکی تھیں مگر بڑی دکانوں کے شوکیس اسی طرح بقعۂ نور بنے ہوئے تھے اور چوکیدار موٹی موٹی لاٹھیاں پکڑے کھانس کھانس کر ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ کہیں کہیں اِکّا دُکّا راہ گیر جاتا ہوا نظر آ جاتا۔ ہاں کاروں کے لیے نہ رات تھی، نہ سردی۔ جانے وہ کہاں سے آتیں اور زن سے غائب ہو جاتیں۔ کہر کی اس چادر کے اُس پار کاروں کی پچھلی بتیاں دُور تک جگنو کی طرح چمکتی رہتیں۔

اب کہر کچھ زیادہ ہی پڑنے لگی تھی۔ سڑکوں پر لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں کے بلبوں کی روشنی جیسے سردی میں ٹھٹھر کر اور بھی پیلی پڑ گئی تھی، وہ اپنے جسم کو گرم رکھنے کے لیے بڑی تیزی سے میکلوڈ روڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

فلموں کے آخری شو ختم ہو چکے تھے۔ تانگے، ٹیکسیاں، اور رکشائیں حرکت میں آچکی تھیں۔ کھوکھوں میں بیٹھے ہوئے پان بیڑی، سگریٹ بیچنے والے اونگھتے اونگھتے چونک پڑے تھے۔ اس نے ایک لمحے کو رک کر تانگوں اور ٹیکسیوں کی طرف بے تحاشا لپکتے ہوئے لوگوں کو دیکھا اور پھر چل پڑا۔

کئی تانگے کھچا کھچ سواریاں بھرے قطار کے ساتھ اس تیزی سے اس کے پاس سے گزرے کہ اسے اپنی مرحومہ ماں یاد آگئیں۔ اگر وہ زندہ ہوتیں اور وہ جا کر اپنے بال بال بچنے کا حال سناتا تو وہ ضرور صدقہ دیتیں۔

اب وہ سینما گھروں کو اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ تانگوں اور ٹیکسیوں کا دھاوا ابھی ختم ہو چلا تھا۔ اس نے اب اطمینان سے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ گھر اب تھوڑی دور رہ گیا تھا۔

"ہائے تم کو ابھی تک کوئی تانگہ نہیں ملا۔ انتظار کر کر کے تھک گئی۔" پیچھے سے آ کر کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، سیاہ نقاب سے ایک چاند کا ٹکڑا جھانک رہا تھا۔ وہ اس وقت بجلی کے کھمبے سے دور تھا۔ وہاں اندھیرا تھا مگر وہ چہرہ کسی روشنی کا محتاج نہ تھا۔ عورت نے بڑی اپنائیت اور محبت سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی طرف بڑھا دیا۔

تانگہ نہیں ملتا تو نہ سہی، ٹیکسی کر لو، گھر میں سب پریشان ہوں گے کہ

دیر کیوں ہو گئی، تم بھی اتنی دیر سے سوؤ گے تو صبح کام پر کس طرح جاؤ گے؟"

وہ مارے بوکھلاہٹ کے کچھ نہ کہہ سکا، مگر عورت کا بڑھا ہوا ہاتھ جانے کیسے اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ نرم ہاتھ مارے ٹھنڈ کے برف کا ٹکڑا ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ بھی سوچنے کی کوشش نہ کی۔ اسے تو اس وقت صرف ایک خیال تھا کہ کسی طرح اس ہاتھ کو اپنی حفاظت میں لے کر گرم کر دے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ عورت سر سے پاؤں تک کانپ رہی ہے۔ وہ اس کے لیے ایک محبت کرنے والے شوہر کی طرح بے چین ہو گیا۔ اسے اس وقت یہ خیال ہی نہ رہا کہ عورت اس کی کچھ بھی نہیں لگتی۔ اس کہر پڑتی اندھیری رات نے اسے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ شوہر کے دھوکے میں اسے اپنا سمجھ بیٹھی ہے۔

"تم کو سردی لگ رہی ہے، بس ابھی تانگہ یا ٹیکسی مل جائے گی۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا اور جب مڑ کر دیکھا تو اُن کے پیچھے ایک سپاہی کھڑا ان دونوں کو تک رہا تھا۔ "آپ کیسے کھڑے ہیں سنتری جی؟" اس نے ذرا غصے سے پوچھا۔ اسے فوراً خیال آیا کہ اس بیچاری عورت کو اکیلا دیکھ کر آ گئے ہوں گے۔

"میاں جی، اس زمانے میں عورت کو اکیلا چھوڑ کر ہلتے بھی نہیں، فلم دیکھنے کو غنڈے بھی آ جاتے ہیں اور ہر عورت کو آوارہ سمجھنے لگتے ہیں۔ کچھ دور تانگہ مل جائے گا۔" سپاہی اپنی لاٹھی گھماتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

"تم نے اس کا منہ ہی نہ توڑ دیا۔ یہ کون ہوتا ہے ہمیں نصیحتیں کرنے والا۔ میں نے تو لڑائی کے ڈر سے کہا نہیں۔ جیسے ہی تم تانگہ لینے گئے، یہ آ کر میرے پیچھے منڈلانے لگا۔ پھر میں تمہارے پیچھے بھاگی اور اب دیکھو کیا چپکے سے آ کر پیچھے کھڑا

ہو گیا" مارے غصے کے عورت کی آواز بھرّا رہی تھی۔
"چلو معاف کر دو، غلطی تو میری ہے، تم کو چھوڑ کر آنا ہی نہیں چاہیئے تھا"
اس کی آواز میں واقعی ندامت تھی۔
وہ دونوں آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ جب وہ اندھیرے سے گزر کر بجلی کے کھمبے کے پاس آیا تو اس نے شعوری طور پر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ کہیں وہ اسے پہچان نہ لے۔ یہ مسرت سے بھرپور لمحے کہیں اتنی جلدی ختم نہ ہو جائیں۔
اس نے کئی مرتبہ چور نظروں سے عورت کی طرف دیکھا۔ وہ کتنی خوبصورت تھی۔ اس کی ترستی ہوئی سیاہ زندگی پر اچانک چاند کا ایک ٹکڑا گر پڑا تھا۔ اس نے ایک لمحے کو رُک کر مفلر سے اس طرح اپنا چہرہ چھُپا لیا کہ صرف آنکھیں کھلی رہ جائیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان اڑتے ہوئے لمحوں کو پکڑنے کے لیے خود کو کسی طرح عورت کے شوہر کے روپ میں ڈھال لے۔ ایک عمر بیت جائے مگر وہ اسے نہ پہچان سکے۔ اسے یہ سب کچھ کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔

اس نے اپنا چہرہ گھما کر عورت کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی بڑی پیاری نظروں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی وہ گھبرا گیا، مگر وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر جیسے پھول کھل رہے تھے اور ہلکے ہلکے اندھیرے میں اس کی آنکھیں تیرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔
"تم تھکیں تو نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"میں تمھارے ساتھ چلتے ہوئے پہلے کبھی تھکی ہوں۔" عورت نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے اس ننھے منّے کنول کو اپنی مٹھی میں دبا لیا مگر جلد ہی اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہاتھ نہیں بجلی کا پاور ہاؤس ہے یہیں سے تو بجلی کی لہریں پھوٹتی ہیں۔ اسی ہاتھ کے دم سے تو یہ سارا شہر روشن ہے۔

اس نے ایک گھٹی گھٹی سی سانس بھری۔ اس کا کیسا جی چاہ رہا تھا کہ اس سناٹے میں عورت کو سینے سے لگا لے مگر اس نے اپنے اس جذبے پر فوراً ہی قابو پا لیا۔ وہ اتنی معصوم، محبت کرنے والی اور خوبصورت عورت کی غلط فہمی سے کوئی فائدہ نہ اُٹھائے گا۔ وہ ایسی لچر حرکت کبھی نہ کرے گا۔ اس نے پھر اس عورت کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی اور اس کے سخت مردانہ ہاتھ کو بڑی گرمجوشی سے دبانے لگی۔

اس لمحے کو اس کے ذہن میں بجلی کی طرح یہ خیال کوند گیا کہ کہیں یہ کوئی ایسی ویسی عورت تو نہیں۔ کہیں اسے بے وقوف تو نہیں بنا رہی، جانے اسے کہاں لے جائے، کیا عورت کبھی اپنے شوہر کو پہچاننے میں بھی غلطی کر سکتی ہے اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ وہ ذرا دیر کو چکرا کر رہ گیا۔ اب کے اس نے غور سے عورت کی طرف دیکھا۔ وہ کس اعتماد اور معصومیت سے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ پھر بھی اس کا دل صاف نہ ہوا، اس عورت ذات کا کیا اعتبار۔ اس نے خالص مردانہ انداز سے سوچا۔ آئے دن اخباروں میں کیسے کیسے واقعات آتے رہتے ہیں۔ کیا پتہ محض پولیس سے بچنے کے لیے اس نے سہارا

ڈھونڈا ہو۔

"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو آخر؟" عورت کا ہاتھ چھوڑ کر اس نے اچانک سوال کیا۔

"ایں!" وہ جیسے کچھ سوچتے سوچتے چونک پڑی — "میں چاہتی ہوں کہ اب تم کسی طرح بھی کوئی سواری کا انتظام کر لو۔ ننھا ضرور جاگ گیا ہوگا سلیم، وہ میرے لیے رو رہا ہوگا۔ ہائے وہ روتا ہوا بھی بڑا پیارا لگتا ہے۔ لگتا ہے نا؟ بالکل تمھاری طرح ہے۔ ایسی ہی اس کی عادتیں بھی ہوں گی۔" عورت نے پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اچھا تو سلیم ہے اس کا نام! سچ مچ اس غریب کو دھوکا ہوا ہے۔ مگر وہ اسے کیا کہے۔ کون سا نام دے۔ نجمہ؟ اس نام سے اس کے کلیجے میں ہوک سی اُٹھی۔ مگر یہ نجمہ کیسے ہو سکتی ہے۔ نجمہ تو پیدل چلنے اور مصیبتیں جھیلنے کے خیال سے ڈر کر اسے چھوڑ گئی۔ یہ تو اس کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے نہیں تھکتی۔ یہ نجمہ کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ اسے اپنا شوہر سمجھ کر کس پیار سے باتیں کر رہی ہے اس کا شوہر سواری کی تلاش میں شاید آگے نکل گیا ہوگا اور اب واپسی پر کتنا پریشان ہوگا۔ کس طرح اسے تلاش کر رہا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے دل پر چوٹ سی لگی کہ اگر اس کا شوہر راستے میں مل گیا تو وہ اسے چھین لے جائے گا۔ اُس نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بس آگے جا کر کوئی سواری مل جائے گی۔ شاید دوسرے سینما ہاؤس میں ابھی فلم نہ ختم ہوئی ہو۔"

"ہوں!" عورت نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا اور تیزی سے قدم اُٹھانے لگی۔ راستہ بڑی خاموشی سے کٹ رہا تھا۔

"میں تمھارے ساتھ چلتے ہوئے پہلے کبھی تھکی ہوں" عورت نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے اس ننھے منّے کنول کو اپنی مٹھی میں دبا لیا مگر جلد ہی اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہاتھ نہیں بجلی کا پاور ہاؤس ہے یہیں سے تو بجلی کی لہریں پھوٹتی ہیں۔ اسی ہاتھ کے دم سے تو یہ سارا شہر روشن ہے۔

اس نے ایک گھٹی گھٹی سی سانس بھری۔ اس کا کیسا جی چاہ رہا تھا کہ اس سناٹے میں عورت کو سینے سے لگا لے مگر اس نے اپنے اس جذبے پر فوراً ہی قابو پا لیا۔ وہ اتنی معصوم، محبّت کرنے والی اور خوبصورت عورت کی غلط فہمی سے کوئی فائدہ نہ اُٹھائے گا۔ وہ ایسی لچر حرکت کبھی نہ کرے گا۔ اس نے پھر اس عورت کی طرف دیکھا تو وہ مُسکرا دی اور اس کے سخت مردانہ ہاتھ کو بڑی گرمجوشی سے دبانے لگی۔

اس لمحے کو اس کے ذہن میں بجلی کی طرح یہ خیال کوندگیا کہ کہیں یہ کوئی ایسی ویسی عورت تو نہیں۔ کہیں اسے بے وقوف تو نہیں بنا رہی، جانے اسے کہاں لے جائے، کیا عورت کبھی اپنے شوہر کو پہچاننے میں بھی غلطی کر سکتی ہے اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ وہ ذرا دیر کو چکرا کر رہ گیا۔ اب کے اس نے غور سے عورت کی طرف دیکھا۔ وہ کس اعتماد اور معصومیت سے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ پھر بھی اس کا دل صاف نہ ہوا، اس عورت ذات کا کیا اعتبار۔ اس نے خالص مردانہ انداز سے سوچا۔ آئے دن اخباروں میں کیسے کیسے واقعات آتے رہتے ہیں۔ کیا پتہ محض پولیس سے بچنے کے لیے اس نے سہارا

ڈھونڈ رہا ہو۔

"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو آخر؟" عورت کا ہاتھ چھوڑ کر اس نے اچانک سوال کیا۔

"ایں!" وہ جیسے کچھ سوچتے سوچتے چونک پڑی — "میں چاہتی ہوں کہ اب تم کسی طرح بھی کوئی سواری کا انتظام کر لو۔ ننھا ضرور جاگ گیا ہو گا سلیم، وہ میرے لیے رو رہا ہو گا۔ ہائے وہ روتا ہوا بھی بڑا پیارا لگتا ہے۔ لگتا ہے نا؟ بالکل تمہاری طرح ہے۔ ایسی ہی اس کی عادتیں بھی ہوں گی۔" عورت نے پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اچھا تو سلیم ہے اس کا نام! سچ مچ اس غریب کو دھوکا ہوا ہے۔ مگر وہ اسے کیا کہے، کون سا نام دے۔ نجمہ؟ اس نام سے اس کے کلیجے میں ہوک سی اٹھی۔ مگر یہ نجمہ کیسے ہو سکتی ہے۔ نجمہ تو پیدل چلنے اور مصیبتیں جھیلنے کے خیال سے ڈر کر اسے چھوڑ گئی۔ یہ تو اس کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے نہیں تھکتی۔ یہ نجمہ کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ اسے اپنا شوہر سمجھ کر کس پیار سے باتیں کر رہی ہے اس کا شوہر سواری کی تلاش میں شاید آگے نکل گیا ہو گا اور اب واپسی پر کتنا پریشان ہو گا۔ کس طرح اسے تلاش کر رہا ہو گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے دل پر چوٹ سی لگی کہ اگر اس کا شوہر راستے میں مل گیا تو وہ اسے چھین لے جائے گا۔ اُس نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بس آگے جا کر کوئی سواری مل جائے گی۔ شاید دوسرے سینما ہاؤس میں ابھی فلم نہ ختم ہوئی ہو۔"

"ہوں!" عورت نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا اور تیزی سے قدم اُٹھانے لگی۔ راستہ بڑی خاموشی سے کٹ رہا تھا۔

"کتنی سردی ہو رہی ہے!" اس نے خاموشی سے اکتا کر کہا:
"ہوں!" عورت جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اُس نے صرف ایک بار اُس کا ہاتھ محبت سے دبایا اور پھر ڈھیلا چھوڑ دیا۔
اب اس شدت سے کہر پڑ رہی تھی کہ سامنے تھوڑے فاصلے پر بھی کچھ دکھائی نہ دیتا۔ اس کا کوٹ اور مفلر دونوں ہی نم ہو رہے تھے۔ مگر اسے ذرا بھی سردی نہ لگ رہی تھی۔ اسی کا تو جی چاہ رہا تھا کہ یہ کہر پڑتی رات کبھی نہ ختم ہو۔ قدرت نے یہ رات صرف اس کے لیے بنائی ہو۔
"تم کیا سوچ رہی ہو؟" اُس نے پوچھا۔
"کچھ نہیں، میں سوچ رہی ہوں کہ منّا رو رہا ہو گا مگر سلیم، آج کتنی مدت بعد تمہارے ساتھ باہر آنا نصیب ہوا ہے۔ اتنے بہت سے لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے تو تمہارے ساتھ نکلنے کا خیال بس ستا کر ہی رہ جاتا ہے۔ سب کی مرضی کا لحاظ کر کے جیسے دم گھٹ گیا۔" عورت نے ٹھنڈی سانس بھری۔
"ٹھیک کہتی ہو، میرا دم خود گھٹتا رہتا ہے۔" اس نے جلدی سے ہاں میں ہاں ملائی۔
"وہ دیکھو تانگہ" ——— عورت نے رک کر سامنے اشارہ کیا۔
اس نے تانگے والے کو آواز دی۔ وہ بے حد آہستہ آہستہ آ رہا تھا کوچوان کمبل میں لپٹا شاید اونگھ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ آواز دی تو تانگہ ان کے قریب آ کر رک گیا اور وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔
"کہاں چلنا ہے بابوجی؟" تانگے والے نے پوچھا۔

اس نے بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کہاں جانا ہے؟ کس گلی؟ کس محلّے؟ یہ چاند کا ٹکڑا کس گھر میں اُترے گا؟ اسے تو کچھ بھی پتہ نہ تھا۔

"کیا سوچنے لگے؟ تانگے والے کو جواب تو دو۔ رحمان پورے چلو بابا۔ یہ تمھاری ہر وقت کے سوچنے کی عادت نہیں جاتی۔" عورت ہولے سے ہنسی۔

"بجتی وہ ہیں سوچ رہا تھا کہ ننّھا اگر اُٹھ گیا تو ضرور رو رہا ہوگا ــــــ" وہ چپ ہوگیا۔

"ہاں! میرا بچہ رو رہا ہوگا۔ لعنت ہے ایسے فلم دیکھنے پر۔" عورت نے دھیرے سے جواب دیا۔

رات، سنّاٹا اور ریختہ سڑک پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سے محسوس ہو رہا تھا کہ عورت اب آہستہ آہستہ اس سے دُور ہوتی جا رہی ہے۔ ٹاپیں بھاگتے ہوئے لمحوں کے رُوپ میں اسے بُری طرح بے چین کر رہی تھیں۔

اس نے گھبرا کر عورت کی طرف دیکھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اب وہ مسلسل اسے دیکھتا رہے۔ وہ اس صُورت کا نقشہ اپنی آنکھوں میں کھینچ لینا چاہتا تھا۔

"کیا سوچ رہے تھے؟" عورت بڑے انداز سے گردن موڑے، کھوئی کھوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کچھ بھی نہیں!" اُس نے نظریں جھکا لیں۔ کیسی مجبوری تھی کہ وہ اس سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اپنے جذبات کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح تو وقت سے پہلے ہی پہچانا جاتا۔

"سلیم۔" عورت نے جیسے خواب میں اسے پکارا۔

"ہاں!" اس نے مفلر اچھی طرح لپیٹتے ہوئے جواب دیا۔

"اماں، بہنیں اور ہمارا نکھٹو آوارہ بھیّا، سب جاگ کر انتظار کر رہے ہوں گے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ہاں ان بیچاروں کو کیا پتہ کہ تانگہ نہیں مل رہا تھا اور ننّھا بھی ضرور اُٹھ گیا ہوگا۔ تم کو نہ پاکر رو رہا ہوگا۔" اس نے اس طرح ننّھے کا ذکر کیا کہ واقعی اس کا دل بڑی محبّت سے پھٹنے لگا۔ اسے تو اس وقت یہ احساس ہی نہ رہا تھا کہ وہ کسی کا باپ نہیں۔

"ہاں رو رہا ہوگا۔" عورت نے اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے گہری نیند سو گئی ہو۔ اس کے چہرے پر عجیب سی آسیبی کیفیت طاری تھی۔ اس کی گردن اب بھی اسی انداز سے اس کی جانب مُڑی ہوئی تھی۔

اب وہ اسے جی بھر کے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اسے یہ خطرہ نہ تھا کہ یوں دیکھنے پر وہ پہچان لے گی۔

مریل گھوڑا جیسے رینگ رہا تھا۔ تانگہ والے نے اُسے دو چار چابکیں رسید کیں اور پھر کمبل میں ہاتھ چھپا کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے عاجز آگیا ہو۔ سڑک پر بالکل سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ اب کوئی راہگیر نظر نہ آتا تھا۔ سردی اس غضب کی ہو رہی تھی جیسے آج ہو کے پھر کبھی نہ ہوگی مگر وہ سردی اور سنّاٹے سب سے بے نیاز ہو کر عورت کو تکے جا رہا تھا۔

"سلیم۔" عورت نے آنکھیں کھول دیں ــــــ "تم بتاؤ کہ اگر میرا بھائی اپنی ماں بہنوں کا بار نہیں اُٹھاتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ سب بھیّا کے مرتے ہیں تو مر

جائیں ہیں تمہاری کمائی کا ایک دھیلا بھی ان کو نہ دوں گی، اگر تمہارے پاس بہت دولت ہوتی تو شاید میری وجہ سے ان کو سنبھال لیتے مگر اتنا ہے ہی نہیں۔ پھر یہ بھی تو سوچو کہ کسی کو کیا پڑی ہے کہ اتنے بہت سے لوگوں کا بار اٹھاتا پھرے اتنے بہت سے بیمار اور بھوکے لوگ بھر گئے ہیں اس گھر میں۔ پتہ نہیں ہیں ان سب کے ساتھ کیسے رہتی ہوں۔ جی نہیں چاہتا کہ یہ سب مر جائیں۔ اپنوں کی محبت اندھی ہوتی ہے نا؟ اس نے اپنا چہرہ بازو میں چھپا لیا اور ایک ہلکی سی سسکی بھری۔

"سنو تو" اس نے بے چین ہو کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ عورت کے دکھوں کی پل صراط سے ساتھ ساتھ گزر رہا تھا اور جب وہ اس دھاردار راستے پر کٹ کر گرنے والا تھا تو عورت نے اپنا سر اوپر اٹھا لیا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی گود میں ڈال کر مسکرانے لگی۔ وہ کٹ مرنے کی اذیت سے نکل کر خود بھی ہنس پڑا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر اسے کتنی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

"دنیا میں اتنی بہت سی مجبوریاں کیوں ہوتی ہیں سلیم؟" وہ پھر رنجیدہ ہونے لگی۔

"بس ہوتی ہیں" اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر مارے ہمدردی کے دھیرے دھیرے سہلانے لگا "تم یہ سب مت سوچا کرو گی"۔

"سوچنا تو پڑتا ہے۔ اگر اللہ میاں نے انسان کو دماغ نہ دیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا"

"مگر اس وقت تو نہ سوچو" اس نے عورت کا سر اپنے بازو پر لٹکا لیا تو اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔

تانگہ اب مزنگ چونگی کے چوراہے سے گزر رہا تھا چوراہے کے ساتھ والی دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ ملازم لڑکے کوکاکولا کی خالی بوتلیں سمیٹ رہے تھے۔

"ارے کیا مزنگ چونگی آگئی۔" عورت نے جیسے چونک کر دکانوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

"ہاں!" اُس نے بڑے دُکھ سے جواب دیا اور پھر عورت کی طرف دیکھا جو سامنے کنہر میں جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اب تک اس کی گود میں پڑا تھا۔

مزنگ بھی اب پیچھے رہ گیا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اب ذرا دیر بعد رحمان پورہ آجائے گا۔ اس کی خوبصورت محبّت کرنے والی بیوی اس سے چھوٹ جائے گی۔ اس کا پیارا ننّھا جو بالکل اس کا سا ہے، اُسے کبھی ابّا نہ کہہ سکے گا۔ سب کچھ چھوٹ جائے گا۔ کاش وقت تھم جائے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ سائنس دان کوئی ایسی ایجاد بھی کرتے جس سے بھاگتے ہوئے لمحوں کو پکڑا جا سکتا۔

"یہ گھوڑا اتنی زور سے دوڑ رہا ہے، مجھے تو ڈر لگتا ہے۔" اس کی آواز میں خوف تھا۔

"ہاں آہستہ چلاؤ، کہیں تمھارا گھوڑا پھسل نہ جائے۔" اسے بھی اچانک احساس ہوا کہ گھوڑا تیز چل رہا ہے۔

"بابوجی، یہ تو اپنی زندگی میں کبھی تیز چلا ہی نہیں، چاہے کھال اتار لو اس کی اور آپ کہہ رہے ہیں کہ تیز چل رہا ہے۔" تانگہ والا جیسے ان کی سمجھ پر اندر سے ہنسا۔

تانگے والے کی ہنسی پر وہ شرمندہ ہو گیا۔ گھوڑا تو واقعی بے حد آہستہ چل رہا تھا۔ پھر بھی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یہ گھوڑا اور آہستہ چلے، بلکہ چل ہی نہ سکے۔ اس انتہائی سردی میں اس کے پاؤں شل ہو جائیں اور پھر ساری رات، ساری زندگی وہ عورت کا ہاتھ تھام کر سڑک کے کنارے بیٹھا رہے۔

"سلیم، میں سوچتی ہوں کہ ——" وہ چپ ہو گئی۔

"یہی نا کہ اب ننھے کو چھوڑ کر تفریح کرنے کبھی نہ نکلوں گی، بس ابھی گھر آیا جاتا ہے۔" اس نے بڑی بے بسی سے کہا۔

"جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسے کبھی نہ چھوڑوں۔" اس نے ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھری اور پھر قریب سرک کر اپنا سر اُس کے سینے پر ٹیک دیا —— "مجھے چھپا لو، گھر جانے کو جی نہیں چاہتا ——" وہ سرگوشی میں کہنے لگی۔ "وہاں تو درجن بھر جان کے دشمن سر پر دندناتے رہتے ہیں۔ تمہارے پاس بیٹھنے کو تو ایک منٹ بھی نہیں ملتا، مجھ سے تو تمہارے متعلق سوچا بھی نہیں جاتا ——" وہ اپنا سر اس کے سینے پر رگڑنے لگی۔

"اور مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم کو پا کر بھی کھو دیا۔" اُس نے دھیرے سے کہا۔ وہ اور بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کی زبان ساتھ نہ دے رہی تھی۔ وہ اس وقت جذبات کی شدّت سے بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ صرف ایک بار عورت کو اپنے سینے سے لگانے کی خواہش میں مرا جا رہا تھا مگر وہ صرف اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ اسے عورت میں ایسا تقدّس اور معصومیت نظر آ رہی تھی کہ وہ اپنی اس چھوٹی سی خواہش کو بھی پورا

کرنے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔

اب تانگہ رحمان پورے کی سڑک پر مڑ گیا تھا۔ دُور دُور لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں کے بلب، اسے پکے پھوڑوں کی طرح ٹپکتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے، اب سب کچھ چھن جانے کا احساس اُسے بُری طرح ستا رہا تھا۔ جانے کس گلی میں، کس گھر میں اس کی بیوی اور اس کا بیٹا اس سے جُدا ہو کر ہمیشہ کے لیے اُسے تڑپتا چھوڑ جائیں گے۔

اس نے سوچا کہ وہ تانگے سے اُترتے ہی عورت کو خود بتا دے گا کہ رات کی تاریکی نے اُسے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے وہ اس کا شوہر نہیں۔ کیا فائدہ کہ وہ خود ہی اُسے پہچان لے اور جانے کیا سمجھے۔ بے ایمان، ذلیل، مگر اُس نے ذلیل بن کی تو کوئی حرکت نہیں کی، وہ اسے بتا دے گا کہ وہ اس قدر پیاری ہے کہ اس نے صرف تصور میں اسے اپنا بنا لیا تھا اور سوچنا گناہ نہیں ہے۔ خواب دیکھنا کمینگی نہیں ہے۔

اسے اپنا ضمیر بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ اُس نے ہولے سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر سے اُٹھا لیا تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اب اس نے جینے سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور مارے کرب کے کسمسانے لگا۔

"کیا بات ہے سلیم؟" اُس نے بے تابی سے اس کے کوٹ کا کالر کھینچا۔

"کچھ بھی نہیں!" اُس نے کھوئے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کبھی وہ اس عورت کو بھول سکے گا!

"سلیم میرے پاس اور سرک جاؤ۔" اُس نے پھر اس کے شانے پر سر

رکھ دیا۔

"میں تمہارے پاس ہی تو ہوں۔" اس نے اس طرح اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، جیسے وہ دو سال کی بچّی ہو۔

تانگہ اب رحمان پورے کی ایک گلی میں مڑ گیا تھا۔ پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر کئی آوارہ کتّے سامنے آکر بھونکنے لگے تھے۔ گلی بالکل تاریک تھی اور یہاں کہر کی چادر اور بھی موٹی ہو گئی تھی۔

"ارے تم نے تو بتایا ہی نہیں، تانگہ آگے نکل جاتا۔" اس نے برقعے کے اوپری حصّے کو ٹھیک سے اوڑھ لیا۔ "بس یہاں روک لو۔ آگے گلی میں تمہارا تانگہ نہ جا سکے گا۔"

تانگہ رکتے ہی وہ اتر گئی۔ مگر وہ اپنی سیٹ پر جیسے جم کر رہ گیا تھا۔ اس کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ اسے گزرے ہوئے وقت کا یہ انجام بڑا ہی المناک معلوم ہو رہا تھا۔

"اترو نا۔" عورت نے کھڑے کھڑے اپنا ہاتھ بڑھایا تو وہ کٹھ پتلی کی طرح نیچے آ گیا اور تانگے والے کو کرایہ دینے کے لیے بٹوہ تلاش کرنے لگا۔

جب تانگے والا تانگہ موڑ کر چلا گیا تو اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا بھلا وہ اترا ہی کیوں تھا، اسے تو اسی تانگے سے واپس چلا جانا چاہیے تھا.

وہ بڑی مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامے اس طرح چل رہی تھی جیسے رینگ رہی ہو۔ گلی کے موڑ پر وہ کھڑا ہو گیا تو وہ بھی رک کر اس کا منہ تکنے لگی۔

"میں —— میں، میں کہنا چاہتا ہوں کہ ——" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"یہی ناکہ تم میرے شوہر نہیں ہو۔ ابھی کچھ دیر اور نہ کہتے تو اچھا ہوتا۔ کچھ وقت اور کٹ جاتا۔" وہ جیسے کنوئیں میں سے بولی۔ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"شاید تم کو میرے اس طرح چھپانے پر افسوس ہوا۔ مگر میں نے کوئی بے ایمانی نہیں کی، تم کو حفاظت سے یہاں تک پہنچا دیا ہے۔ بہرحال میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ بات یہ تھی کہ ---" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا۔ اُس نے عورت پر بھرپور نظر ڈالی۔ "منّے کو میری طرف سے پیار کرنا ---" اس کا کلیجہ کٹ رہا تھا۔

منّا، جو بالکل تمھارے جیسا تھا، جو راستے میں پیدا ہوا اور میرے اس گلی میں آنے کے بعد مر گیا۔" عورت سسک کر رو پڑی۔ "آپ کھڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو، بھاگ جاؤ ---" اس نے اپنا برقع کھسوٹ کر بغل میں دبا لیا "آپ اتنے بہت بھو کے تمھاری جان کو روئیں گے۔ میں خالی ہاتھ گھر جا رہی ہوں۔" اُس نے جلتی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے دوسری گلی میں مڑ گئی۔ مگر وہ دکھ اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے بوجھ تلے دبا اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ سناٹے میں عورت کے جوتوں کی ایڑیوں کی کھٹ کھٹ اور سسکیوں کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتے ہوتے نہ جانے کہاں کھو گئی۔ ایسے اسے اچانک اپنے لٹ جانے کا احساس ہوا اور وہ پاگلوں کی طرح گلی میں دوڑا۔ مگر اب وہاں خاموشی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ گھروں کے دروازے بند تھے۔ اور اُن کی کھڑکیوں سے اندھیرا چھن رہا تھا۔ کہیں روشنی کی ایک

کرن بھی نظر نہ آئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ وہاں کے ایک ایک دروازے کو پیٹ کر اس کا پتہ پوچھے۔ اس کی تلاش میں نگر نگر ڈھنڈورا پیٹے۔

اور جب وہ دکھوں کے بوجھ سے نڈھال ہو کر واپس ہو رہا تھا تو گلی کے ویران اندھیرے میں ایک ننھّی سی کفنائی ہوئی لاش تیر رہی تھی۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا سڑک پر آ گیا جہاں کنارے کھڑا ہوا تانگے والا بجھی ہوئی بتیوں میں تیل ڈال رہا تھا۔ وہ اُچک کر تانگے پر بیٹھ گیا۔

"اب کہاں چلنا ہے بابو!" تانگے والا ایک آنکھ میچ کر ہنسا۔

"میکلوڈ روڈ،" اُس نے دھیرے سے جواب دیا اور جب اپنے ٹھنڈے برف چہرے کو اُس نے دونوں ہاتھوں سے رگڑا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ رو رہا تھا۔

O

راجندر سنگھ بیدی

ـــ ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

(اعترافات)

پادری روزاریو نے گناہگار جاہن سے
کہا "تم تو اعترافِ گناہ کے لیے میرے
پاس آئے تھے، مگر تم نے ڈینگیں مارنا
شروع کر دیں ...."

مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ اپنے پڑھنے والوں کے سامنے ایک دن مجھے گناہگار کی صورت کھڑا ہونا پڑے گا اور اپنے وہ گناہ قبول کرنے پڑیں گے۔ جو کہ میں نے نہیں کیے۔ یا اگر کیے ہیں تو اس لیے کہ مجھے فن کی سند حاصل ہے جو ایک طرح سے راشٹرپتی کی معافی سے جو سنگین سے سنگین قتل میں بھی سرکاری گواہ کو میسّر ہوتی ہے......

باپ روزاریو! میں ایک سیدھا سادا، حالی اور قانون پرست شہری تھا۔ اپنے پڑھنے والوں سے پیار، ان سے راز کرتا تھا۔ انھیں چومتا چاٹتا تھا، حالانکہ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ سب کو سر آنکھوں پر بٹھاتا تھا اور اگر کہیں ان کو پیرِ تسمہ پا کی طرح سے اپنے اوپر سوار ہوتے دیکھتا تو جھٹک

بھی دنیا میں ایک طرح کا جمینز (JIMENEZ) تھا جو اپنا ہر دکھ سکھ اپنے پلاٹیرو (PLATERO) کو بتاتا ہے، جو ایک بڑا پیارا اور معصوم سا گدھا ہے اور جمینز کی بدولت اب تک کلاسیکی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ آپ اس گدھے کو نہیں جانتے، لیکن میں جانتا ہوں، کیونکہ اپنی خدمات کے عوض وہ جمینز کو نوبل پرائز بھی دلوا چکا ہے۔

گدھے کے ذکر کا برا مت مانیئے، فادر روزاریو! آپ تو جانتے ہیں، مغرب میں گدھے کو اتنا بُرا جانور نہیں سمجھا جاتا جتنا کہ ہم اسے اپنے ہاں سمجھتے ہیں۔ پھر آپ تو گوا کے رہنے والے ہیں اور اب ہندوستانی ہو گئے ہیں۔ آپ ہی بتایئے، گدھے کی بیوقوفی ایک اسطوری بات (MYTH) نہیں جو ہم اور آپ ہی نے مل کر بنائی ہے؟ گدھے میں کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ —— وہ بوجھ اٹھاتا ہے۔ ڈنڈا کھانے پر فقط رفتار کو تھوڑا تیز کر دیتا ہے۔ مگر شکایت کا حرف تک زبان پہ نہیں لاتا، جو ایک کامیاب زندگی کا راز ہے اور جس کی تلقین ہمارے روحانی پیشوا کب سے کرتے آئے ہیں اور ہمارے نیتا اب تک کرتے ہیں آپ کا خیال ہے، باپ روزاریو! کیا میری بوجھل تحریر پڑھ کر میرے قاری مجھے مارنے دوڑتے ہیں؟ بالکل نہیں۔ ایسا ہوتا تو میں روز صبح ان کو ماٹنگا میں پان والے کی دکان اور دن کو کسی فلم اسٹوڈیو میں مل جاتا اور شام کو کہیں اسپتال میں اپنی پسلیاں گنتا۔ وہ ایسا نہیں کرتے کیونکہ وہ مجھے سمجھ گئے ہیں اور میں ان کا راز پا گیا ہوں۔ قصّہ مختصر، الکفِس مجھے اور

مجھے انھیں بے وقوف سمجھنے کی پوری آزادی تھی، جو اب ان حالات میں نہیں ہے جبکہ میں ——— چاہتا ہوں ——— گناہِ اقبال ——— معاف کیجیے۔ ——— اقبالِ گناہ کے لیے آپ کے سامنے کھڑا ہوں اور میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں اور سر جیسے گو کے میں پڑا ہے۔ اگر میں بے باک طریقے سے اعترافِ گناہ کرتا ہوں تو آپ کو وہ میری ڈینگیں معلوم ہونے لگتی ہیں اور اگر دبی زبان سے مانتا ہوں تو حقیقت مونالیزا کی مبہم سی مسکراہٹ ہو کر رہ جاتی ہے ... عجیب مصیبت ہے نا؟

فادر روزاریو! اعترافِ گناہ کا مسئلہ میرے نزدیک بہت نازک ہے میں ایک ایماندار آدمی ہوں اس لیے جو کہوں گا سچ کہوں گا۔ چاہے خدا حاضر ناظر ہو یا نہ ہو۔ میرا ہاتھ مقدس کتاب پر ہو یا نہ ہو۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیجیے گا کہ میں خدا کو نہیں مانتا یا کسی مقدس کتاب پر ایمان نہیں لاتا۔ خدا پر ایمان نہ لانا تو اپنے آپ پر ایمان نہ لانے کے برابر ہے، فادر! کیونکہ ہمارا اپنا آپ" ہی خدا ہے اور کتاب بھی میری ہی طرح کے ایک انسان نے اپنے ارفع لمحوں میں لکھی ہے۔ میں ایسا ہی کافر ہوتا تو اس اعتراف کے سلسلے میں آپ، جو خدا کے نمائندے ہیں، کے پاس ہی کیوں آتا؟ آپ بے صبر ہو رہے ہیں؟ ——— یہ تو ڈینگ نہیں ہے۔ بہر کیف میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ گناہ پہلے ہوتا ہے اور اعتراف بعد میں۔ لیکن میں اپنا کیا کروں؟ میں ان گناہگاروں کی قبیل میں سے ہوں جو اعتراف پہلے کرتے ہیں اور جب کوئی ان کے اعتراف کو اہمیت نہ دے یا ان کی طرف دیکھتا نہ ہو تو

چپکے سے ایک طرف جا کر، کہانی لکھ مارتے ہیں۔

پہلے میں اپنی کہانی کے کرداروں اور اس کے تانے بانے کو اپنے دوستوں پر آزماتا ہوں۔ بسا اوقات روز ازلیو! مگر ساتھ ہی یہ صریح جھوٹ بول دیتا ہوں کہ میں اسے لکھ بھی چکا ہوں۔ اس جھوٹ کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی حرام الدہر اسے چرا نہیں پاتا اور دوسرے یہ کہ مجھے اپنی کہانی کے اثر کا پتا چل جاتا ہے۔ اگر وہ بہت ہی متاثر معلوم ہوں اور خوب ہی سر دھنیں تو میں اس کہانی کو سرے سے لکھتا ہی نہیں۔ ہاں، ایسی کہانی لکھنے کا فائدہ ہی کیا۔ فادر، جیسے چھوٹتے ہی ہر نتھو خیرا سمجھ جائے۔ اگر ان کے چہروں پہ ناسمجھی کے نقوش دیکھتا ہوں تو مجھے یقین آجاتا ہے کہ میاں، اب بات بنی۔ جب میں اسی وقت لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ کہانی ہوتی بھی بے حد کامیاب ہے، کیونکہ وہ میری اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ جو کہ میرے نزدیک فن کی معراج ہے۔ دیکھیے تو، دنیا بھر کا آرٹ، کیا ناول اور کیا مصوّری اور کیا تعمیر، سب کدھر جا رہے ہیں؟ اور ہم ابھی تک مطلب کے چکر میں پڑے ہیں۔ میں مطلب کی پروا ہی نہیں کرتا۔ اور اگر کرتا بھی ہوں تو بہت بعد میں۔ میں لوگوں کو کہانی کے بارے میں لے دے کرنے دیتا ہوں۔ ناسمجھی کے الزام سے ڈرتے ہوئے وہ خود ہی اس میں معنی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جب میں بے اختیار ان کی داد دیتا ہوں اور ان کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہہ اٹھتا ہوں ـــــ بالکل، میرا بھی یہی مطلب تھا۔ مگر افسوس، ذہانت کے اس ویران آباد ملک ہندوستان میں سمجھنے والے کتنے لوگ ہیں؟ ..... دراصل کہانی

ہر ایک کے لیے لکھی بھی نہیں جاتی۔ یارو، میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک آدمی بھی سمجھ گیا تو میری محنت ٹھکانے لگی ...... جیو ......

کیا میں پھر ڈینگیں مار رہا ہوں خاور؟

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں اعتراف پہلے کرتا ہوں اور گناہ بعد میں۔ اعتراف پہلے ہو یا گناہ لیکن ایک بات طے ہے کہ اعتراف و گناہ دونوں الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں اور بیکار ہی آپس میں الجھتے رہتے ہیں، میں انھیں علیحدہ علیحدہ لے جا کر سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن دونوں برابر اپنی ہٹ پر قائم رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے اپنی ہی کہانی یاد آتی ہے جس میں ایک آدمی کسی مرد عورت کے جھگڑے میں پڑ گیا۔ کیا مرد اور عورت کا جھگڑے کا کوئی حل ہے؟ باپ رے زار لیو! کبھی ہوا ہے یا ہوگا —— ایک مارنے والا اور دوسرا مار کھانے والا۔ ایک اذیت دینے والا دوسرا اذیت سہنے والا۔ اور دونوں اسی طرح سے خوش رہتے ہیں۔ ہم بیچ میں ماموں ہوتے ہیں؟ البتہ مرد و عورت کبھی کبھی ایک دوسرے کے ساتھ اپنا رول بدل بھی لیتے ہیں۔ کیونکہ ہر مرد میں ایک عورت چھپی ہوتی ہے اور ہر عورت میں —— کئی مرد۔ کم از کم بھرتری ہری تو اپنے شرنگار شتک میں کچھ ایسا ہی لکھتے ہیں بہر حال ان کے فضیحتے کے بارے میں ازل سے کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ اور ابد تک لکھی جائیں گی، جن میں جھگڑا، مار پیٹ، ایذا رسانی ایک ضمنی اور مقامی حیثیت رکھیں گے۔ اور ہم تہذیب کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اس کے خلاف آواز اٹھاتے رہیں گے۔ میں پوچھتا ہوں کیا آپ کی ساری رہبانیت، اور اپنے تجرد

کے فلسفے میں ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے، جس کی نفی میں ہم اپنے بدن کے بچھواڑے کو برفاب میں ڈبوتے، درختوں پہ الٹا لٹکتے اور اذیت دینے والے فاقے کرتے ہیں؟ بوکا شیو کی داستانوں میں کتنے مردوں اور کتنی عورتوں نے اعتراف گناہ کیا اور پھر اپنی پہلی ہی فرصت میں گناہ کی طرف لوٹ آئے، کیونکہ وہ سانپ کی کھال کی طرح سے ڈراؤنا ہے اور خوبصورت بھی۔ درمیان میں کوئی ایبٹ اور فرائڈ جو خود کو خدا اور کلیسا کا نمائندہ کہتا تھا، بیوقوف بن گیا۔ کیا وقت نہیں آیا، فادر کہ ایبٹ اور فرائڈ، ملّا اور قاضی، پنڈت اور پجاری لوگ بیوقوف بننا چھوڑ دیں؟ میری بات چھوڑیئے، میں اس وقت سچے دل سے اعتراف کر رہا ہوں۔ اور بہت سے لوگوں کی طرح کنفیشن کے کان کاٹ کر اسے فیشن کے طور پر استعمال نہیں کر رہا۔ ہاں، بعد میں کیا ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتا۔ یہ سوائے اس حسین ابہام کے جو ہمارا خدا ہے اور کون جان سکتا ہے؟..... تو میں کہہ رہا تھا کہ میری کہانی میں وہ آدمی مرد اور عورت کے جھگڑے میں پڑ گیا۔ جس طریقے سے میں اعتراف اور گناہ کو الگ الگ اور منفرد حیثیت دیتا ہوں اسی طرح اس نے دونوں کو الگ الگ سمجھنے کی کوشش کی۔ پہلے وہ مرد کو ایک طرف لے گیا اور بڑے جوکھم کے ساتھ اسے سمجھایا بجھایا اور اس کے خون آشام غصّے کو ٹھنڈا کیا... پھر وہ عورت کو الگ ایک طرف لے گیا مگر آج تک واپس ہی نہیں آیا....

ہیں، فادر روزاریو؟!!

میرے لکھنے لکھانے کی ابتدا چوری سے ہوئی، باپ روزاریو! آپ

گھبرایئے نہیں۔ ذرا صبر سے میری بات سنیئے۔ میں کہیں بھی اس چوری کے سلسلے میں اپنے آپ کو حق بجانب نہیں ٹھہراؤں گا۔ آپ کے اُٹھتے ہوئے ابرو اور چہرے کے سوالیہ نشان مجھے پریشان کر رہے ہیں اس لیے بعد کی بات پہلے ہی کیوں نہ کہہ دوں۔ تاکہ آپ کو اپنے وجود سے بھی تسلّی رہے۔ میں نے چوری کی اور پھر خود ہی اپنے منہ پر دو تین چپتیں بھی ماریں کیونکہ اس کام کے لیے اور کوئی پاس نہیں تھا جیسا کہ ہر کامیاب چوری میں وہ نہیں ہوتا۔ نہ معلوم کہاں چلا جاتا ہے؟ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کیونکہ کئی لوگوں میں صبر نہیں ہوتا —— اِدھر چوری ہوتی ہے اُدھر وہ چلّانا، شور مچانا شروع کر دیتے ہیں پہلے دُور بھاگتے ہیں اور جب دوسرے مدد کے لیے آجائیں تو پھر قریب آجاتے ہیں۔ اور پکڑ لیتے ہیں آپ چاہے کتنی بھی معافی مانگیں مگر وہ نہیں چھوڑتے۔ ان کی سرشت میں کتنا ظلم، کتنی ناانصافی ہے کہ چوری بھی آپ ہی کو کرنی پڑے اور معافی بھی آپ ہی مانگیں۔

قصّہ یوں ہوا تھا دراصل کہ ہمارے کالج کے ایک پروفیسر اکولا ایک کہیں سب جج ہو گئے۔ کامیابی کا دروازہ ان پر کسی پاگل کے قہقہے کی طرح سے کھل گیا۔ اب ان کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کریں۔ چنانچہ ہم لڑکوں کو جو کہ بکھرے ہوئے تھے، اکٹھا کیا اور ایک لیکچر دینا شروع کر دیا۔ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ باپ روز اریو، کہ کامیابی کے دروازے پر کھڑا آدمی اندر کیوں نہیں جاتا؟ باہر ہی لیکچر دینا کیوں شروع کر دیتا ہے؟ شاید اس لیے کہ اندر جانے ہی سے کامیابی کی اساس کا پتا چل جاتا ہے۔ پھر دوسرے لیکچر دیتے ہیں اور وہ غریب

کان بند کرنے کی کوشش میں منہ کھول کر سنتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر صاحب نے کہا۔ اس دنیا میں معمولی (MEDIOCRE) قسم کے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ تم چاہے چور بنو، لیکن اس پائے کے چور کہ دنیا بھر میں کوئی دوسرا تمھاری ہمسری نہ کر سکے ......

اب اس عمر میں ہمیں کیا معلوم، فادر روزاریو، ہمارے نزدیک تو چور کا ایک لفظ تھا جو کل روئے زمین پر گھوم پھر کر ہمارے کانوں میں چلا آتا تھا۔ ایک بچہ کیا جان پائے کہ پروفیسر کی زبان میں وہ ایک اصطلاحی لفظ تھا جس کا مطلب بہر صورت منتری بھی ہو سکتا ہے، انجنیئر ہو سکتا ہے، ڈاکٹر ہو سکتا ہے۔ ہم اس نئی تعلیم کو پروفیسر صاحب ہی سے شروع کرتے لیکن وہ تین ڈاون کلکتہ میل سے جا چکے تھے۔ ہمیں خاص بننے کا سبق دیتے ہی خود ہمیشہ کے لیے عام ہو گئے تھے۔ پھر ہم نو آموزوں کے سامنے کوئی ایسی زندہ مثال بھی تو نہ تھی۔ ہندوستان کے بھوپٹ اور امریکہ کے ال کپون جن کی زمانے بھر نے عزّت کی ہے۔ عرشۂ تاریخ پر بہت لیٹ آئے تھے۔

نوجوان ہونے کی وجہ سے مجھ میں بلا کا جوش تھا، فادر، جو کسی صبر کے ساتھ مصالحت نہیں کرتا۔ میں تو راتوں رات کسب کمال کرنا اور اپنا گھوڑا دہاں اوپر کہکشاں پر دوڑانا چاہتا تھا، لیکن میرے پاس باگ کے پیسے تھے اور نہ رکاب کے دام۔ غالباً اسی لیے میں نے اسے پو پیہ ہی چلنے دیا۔ میں نے چھوٹتے ہی چوری نہیں کی، باپ روزاریو! میں جانتا تھا نا کہ قید ہو جانا بُرا سا لگتا ہے۔ پروفیسر صاحب سے کہیں پہلے ماں باپ مجھے لمبے چوڑے لیکچر دے چکے

تھے اور پیٹ بھی چکے تھے۔ لیکن پروفیسر زیادہ پڑھا لکھا آدمی تھا، اس لیے اس کی بات دل کو لگتی تھی۔ چنانچہ دنیا کے ہر چور کی طرح، سرسری طور پر اپنے ضمیر کی تسلی کے لیے پہلے میں نے شرافت کے سب گر استعمال کیے۔ میری آواز اچھی تھی، اس لیے میں سنگیت سیکھنے کی غرض سے راوی روڈ، لاہور کے گاندھرو مہاودیالیہ کی سب سے آخری بٹالین میں بھرتی ہوگیا۔ لیکن میرا جذبہ تھا کہ سات سُروں کی قید میں نہ آنا تھا اور آٹھویں کی اجازت نہ تھی۔ میرا گانا نوٹیشن میں آکر گانا، گانا نہ پڑھا جاتا تھا۔ میں نے ایک دو نغمے مارے لیکن استاد بوٹے خاں مجھی ہٹھ والے اور امرتسر کے چوہدرام کی مجلسوں میں جاتے ہی پتا چل گیا کہ میرے سامنے تو برسوں کے ریاض کی دیوار کھڑی ہے اور آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ مجھے آہستہ آہستہ اور نوکِ زبان سے اسے ہموار کرنا ہوگا۔ چنانچہ میں یوں الگ ہوگیا جیسا کہ کیلے کے چھلکے پر سے پھسلا ہوا آدمی فوراً اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور پھر اپنی پگڑی سنبھالتا، منہ میں کچھ منمناتا ہوا، اس منظر سے ٹل جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ انٹی امپیریلسٹ "جنگ" کا زمانہ تھا جس میں ہمارے لیڈر ہمیں سُوت کے لوگوں سے لڑنے کا مشورہ دیتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ مار کھا کھا کر انگریز کو سوَر بنا دو۔ مار ہی کھانا ہوتی، فادر، تو میں شروع ہی سے پروفیسر کی بات پر عمل کیوں نہ کرتا، جب ہم پٹاخہ قسم کے لیڈر کی نوکری خالی تھی۔ کچھ لڑکوں کے ساتھ مل کر میں نے ایک کھنڈر میں بم بنانے کی کوشش کی۔ انگریز گورنر مونٹ مورنسی تو جوں کا توں سلامت رہا لیکن میرے ایک ساتھی کا ہاتھ اڑ گیا۔ وہ میرا ہاتھ بھی ہو سکتا تھا۔

باپ روزاریو جس سے بعد میں میں نے کہانیاں لکھیں اور اب اسے آپ کے ہاتھ پر رکھے ہوئے ان گناہوں کا اعتراف کر رہا ہوں۔

چوری کی بات میں لٹکا نہیں رہا، باپ روزاریو! میں کہانی لکھنے والا ہوں اس لیے اسے عین موقع پر، فنی انداز میں کہوں گا۔ یعنی اس وقت جبکہ آپ کا تجسّس پانی نہ مانگے۔ میں نے اور بھی بہت سے پاپڑ بیلے۔ پاپڑوں میں دال کے ساتھ کالی مرچ بھی پڑتی ہے۔ لیکن مجھے اب تک صرف آٹے دال ہی کا بھاؤ معلوم ہوا تھا۔ میں نے فنِّ مصوّری میں نکل جانے کی کوشش کی اور میں واقعی نکل بھی گیا۔ ہوا یہ کہ لینڈ اسکیپ بنانے کی بجائے میں انسانی پیکر پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ اور غلطی سے وہ بھی عورت کے پیکر پر۔ اسے بنانے میں میں خود ہی اس پر عاشق ہو گیا۔ اتنے مہنگے آرٹ پیپر کو ایک طرف چھوڑ کر میں زندگی میں اُسے ڈھونڈنے کے لیے چل نکلا جس کاغذ پر میں نے اسے بنایا تھا وہ تو اب تک گلا یا، کوٹا اور پھر سے کاغذ بنایا جا چکا ہے لیکن میں اب تک اُسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں نے بدن پر کے اس خط کی تحقیق شروع کر دی۔ جو عورت کو مرد سے ممیز کرتا ہے اور اس کے دماغ میں بے پناہ فتور پیدا کر دیتا ہے۔ دیکھیے نا ایک معمولی خم سے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ پھر عورت کے بدن میں کمر سے نیچے رانوں کی طرف جو خط جاتا ہے، وہاں ایک ہلکا سا بے بضاعت گڑھا پڑتا ہے، جسے انسانی جسم کے تشریحی علم والے صرف رگوں اور پٹھوں کا اتار چڑھاؤ سمجھتے ہیں۔ نا معلوم کیسے گویا نے اپنی مشہور پینٹنگ "ماجا دی نیور" میں اسے نظر انداز کر دیا؟ حالانکہ میں اس کے بارے میں کیا کچھ

لکھ سکتا ہوں۔ دراصل اس قسم کی باتیں ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایمرسن نے لکھا ہے کہ وہ سامنے کا کھیت جس کے پیچھے سورج غروب ہوتا ہے، مسٹر لاک کا ہے۔ لیکن نہیں وہ دراصل شاعر کی ملکیت ہے.......

بس شاعر ہو گیا۔ انگریزی کے ہیریک ہیٹر میں نظمیں لکھیں جو چھپیں بھی۔ لیکن چھپنے سے کیا ہوتا ہے؟ ہمارے کئی شاعر دوستوں کی نظمیں چھپتی رہتی ہیں، چاہے ان کا ایک بھی مصرعہ آپ یاد نہ رکھ سکیں۔ ایک نابالغ ذہن کا مالک تتبع، محض تتبع میں بعض وقت اچھی چیز لکھ مرتا ہے۔ انگریزی ادب کے گرے نے طفلی میں بڑا عمدہ نوحہ نہیں لکھا؟ پھر میں نے انگریزی میں لکھنا چھوڑ دیا۔ ہاں ہندوستان میں رہنا اور ہندوستانیوں سے بیر اچھا نہ معلوم ہوا۔ جب اردو کا رواج تھا اور اردو لکھنے والے اپنے آپ کو شاہی خاندان کا فرد سمجھتے تھے، جیسے اب ہندی والے سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی اُردو اور ہندی کو ایک ہی زبان کے دو روپ کہتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اردو میں شعر کہنے کی کوشش کی اور اس کے علمِ عروض —— معقولن نامعقولن —— سے ٹکرا گیا۔ تھوڑی دیر میں ہم دونوں بے ہوش پڑے تھے۔ یعنی کہ میں اور شعر۔ کہیں راستہ نہ پا کر میں چھوٹا سا سینٹ جینے ہو گیا۔

سینٹ جینے کو آپ نہیں جانتے، باپ روزاریو! وہ آپ کی طرح کا سینٹ نہیں۔ وہ چور، گرہ کٹ، فاسق و فاجر ہے۔ عورتیں تو ایک طرف اس نے لونڈوں میں بھی دلچسپی لی ہے جو کہ میں نے نہیں لی ہے۔ اس کے باوجود سارتر نے مقدس باپ پوپ کے فرائض خود ہی لے کر اسے معبود (DEITY)

کر دیا۔ ہر جگہ روک، ہر راستے کو سنگلاخ پاکر میرے بے پناہ جذبوں نے نکاس کے اور بھی بہت سے راستے ڈھونڈ لیے، جن کا تعلق کسی بھی تعمیری چیز سے نہ تھا۔ میں نے اندھیروں کی پناہ لی۔ اندھیرے کی بابت آپ نہیں جانتے فادر، پہلے خیرہ کر دینے والی روشنیوں کے بعد ایک لق و دق اندھیرا آتا ہے اور پھر ایک نرم سی، مسلسل اور مقدّس روشنی جس کا شروع ہے اور نہ آخر، اور جس کے پرتو سے پوری کائنات جیتی اور سانس لیتی ہے۔ لیکن اندھیرا؟ اندھیرے کا جادو کا ہیں آپ کو کیا بتاؤں، باپ روزاریو، کیونکہ وہ آپ کے تنگ و تاریک حجروں میں نہیں ہوتا۔ تاریکی کے باوجود وہاں تجلّی رہتی ہے لیکن اپنی تاریکی خالص تاریکی ہے۔ آپ کے ہاں کا اندھیرا اُجالے سے متبادل (MUTATE) ہوتا رہتا ہے لیکن اپنے ہاں اندھیرے کی کوئی جگہ لیتا ہے تو اندھیرا۔ جیسے ایک صفر کو لاکھوں صفروں سے ضرب دیجیے تو نتیجہ صفر ہی رہتا ہے۔ اس انتھاہ اندھیرے میں عقل نہیں وجدان کام آتا ہے۔ اس میں کروڑوں اربوں دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ جذبات اور ارمانوں کے چھوٹے چھوٹے پتنگے اور بڑے بڑے شہ پر اُڑتے ہیں۔ وہ آنکھوں سے نہیں، اپنی پرواز سے پیدا ہونے والی تھرتھراہٹ کی مدد سے اپنے سامنے روک پاکر لوٹ آتے ہیں لیکن ان کی پرواز کسی طرح سے کم نہیں ہوتی۔ ان کی بصیرت کے ہاتھ پر لاکھوں آنکھیں اُگ آتی ہیں، جن سے وہ راستہ ٹٹولتے اور پاتے ہیں۔ جس دن میں اندھیرے کی تلاش میں نکلا اس دن ہمارے ایک بہت بڑے روحانی پیشوا کا جنم دن تھا جس

کی پوری امت ایک طرف خوشیاں منا رہی تھی اور دوسری طرف معروفِ عبادت تھی۔ جب ایک طرف میرے پورے بدن پہ ڈر سے لرزہ چھا رہا تھا تو دوسری طرف ایک بڑی خوش آئند سنسنایٹ رگ و پے میں سما رہی تھی۔ چونکہ گناہ ثواب کا مقابل ہے، فادر، اس لیے انسانی جسم و ذہن گناہ سے اتنا ہی لطف اٹھاتے ہیں جتنی کہ ثواب کی لیے حرمتی ہو۔ آہ، مگر کتنی دیر کوئی اندھیرے میں رہ سکتا ہے؟ کتنی دیر اجالے میں رہ سکتا ہے؟......

کسی حکیم نے کہا ہے کہ وہ شخص جو اپنی منزل کو نہ پا سکے، اس آدمی سے زیادہ بے حیائی کی زندگی گذارتا ہے جس کی کوئی منزل ہی نہ ہو۔ پہ سچ ہے۔ ایک تخلیقی ذہن کا مالک جب تخلیق نہیں کر پاتا تو وہ ایک عام آدمی سے بھی زیادہ گھٹیا ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ اس انداز میں گرتا اور گرتا چلا جاتا ہے کہ اس کا ابھرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ تاوقتیکہ کہیں کوئی نغمہ نہ سنائی دے جائے۔ پھر وہ معصیت کی گود میں جانے کی بجائے اس کے پیروں پہ لوٹتا ہے جس سے معصیت بھی مولکش پا لیتی ہے..... یہ سب کچھ سلیقے سے ایک شعر نہ لکھ سکنے کی بدولت ہوا، فادر روزاریو! میں نے اتنے گناہ کیے کہ میں انھیں گن بھی نہیں سکتا۔ اس کے بعد میرے ضمیر نے مجھے شرمندہ کرنا شروع کر دیا۔ ضمیر اپنا غرور رکھتا تھا۔ اور بدن اپنا۔ ضمیر ایک حسین عورت کی طرح سے خود اعتماد ہوتا ہے اور اپنے آپ میں ذرا بھی تو کوئی دوسری خوبی پیدا کر لے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ اپنی ہی شرط پر محبت کا قائل ہوتا ہے۔ جو کہ اکثر مان لی جاتی ہے بلکہ ماننا ہی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے وہ

خوبصورت یاد آتی ہے، جس نے اپنے زعمِ حسن میں ایک فلم ڈائریکٹر کو، جس نے بے شمار شادیاں کی تھیں، شرمندہ کرنے کی کوشش کی اور کہا —— یاد ہے، میاں ایک بار تم نے مجھ سے شادی کی فرمائش کی تھی؟ ڈائرکٹر نے اسے اس سے آگے نہ بڑھنے دیا اور وہیں ٹوک کر کہا —— تب؟ .... میں نے کی تھی؟

جس رات میں نے چوری کی، اُس رات ہر چیز چوری ہو جانے کے لیے اُمڈی ہوئی تھی۔ شام کے وقت عام طور پر سورج آہستہ آہستہ غروب ہوتا ہے۔ اس کے غروب ہو جانے کے عرصہ بعد تک بھی ایک روشنی سی رہتی ہے جو دھیرے دھیرے اندھیرے کو جگہ دیتی ہے، لیکن اس دن عجیب ہی بات ہوئی۔ ایک لمحے نے زمان و مکان کی قید کو توڑ دیا۔ اور اکائی بن کر میرے سامنے ساکت ہو گیا۔ اس سے فوراً پہلے آسمان پر جون کی دوپہر کا سورج تھا اور فوراً بعد دسمبر کی اماوس۔ یہ کہ کوئی ہزار واٹ کے ہنڈے کو آن واحد میں گل کر دے۔ قدرت میں بھی ہوتا ہے۔ جب لاکھوں سر پٹخنے پر بھی مجھ سے ایک مصرعہ موزوں نہ ہوا تو میں نے ایک پرانا رسالہ اُٹھا کر اس میں سے احتیاطاً ایک گمنام شاعر کی غزل چرائی اور اپنے نام سے چھپنے کے لیے اخبار میں بھیج دی۔ اخبار والے تو آپ جانتے ہی ہیں، ہر اچھی چیز کو چھاپنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کے لیے کوئی پیسہ نہ مانگے۔ ہاں، کیونکہ ایڈیٹر اور اس کا پورا خاندان بھی ہر ہفتے اخبار کو اپنی طبع زاد چیزوں سے نہیں بھر سکتے۔ غزل چھپ کر آئی۔ اس پر میرا نام تھا جو چھپا ہوا تھا! میں اسے دن میں پچیس تیس بار پڑھتا تھا اور بازار کی طرف نکل جاتا تھا

تاکہ لوگ میری طرف دیکھیں جب تک نہیں اندر مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ غزل میری اپنی ہے، لیکن.......

ہمارے گھر میں ایک شاعر نما رشتے دار رہتے تھے۔ انھوں نے پہلے میری طرف دیکھا اور پھر میری غزل کی طرف اور کچھ یوں داد دی کہ اسی پرچے میں "دزدِ سخن" کے عنوان سے میرے خلاف ایک دو کالمی مضمون چھپا جس میں چوری کا ماخذ بھی درج تھا۔ اب میں بازار بھی نہ جا سکتا تھا......

چوری کی بھی ایک منطق ہوتی ہے، باپ رے زار ہوا چوری... چیر پھاڑ یہ میں دنیا بھر کی گھٹیا باتوں کے جواز میں فلسفے پیدا کر کے آپ کو بور نہ کروں گا۔ ہاں یہ تو ہر لکھنے والے کے دائیں ہاتھ کا کام ہے یا شاید بائیں کا۔ کیونکہ بہت کم ایسے کام ہیں جن کے لیے دونوں ہاتھ استعمال کرنے پڑیں۔ بہر حال، ایک بات طے ہے کہ ایک چوری دوسری چوری ضرور کرواتی ہے۔ جیسے ایک بدن کو چھپانے کے لیے دوسرا بدن ڈھونڈنا پڑتا ہے، ایک جھوٹ دوسرا جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن میری وہ دوسری چوری، پہلی چوری سے بہت مختلف تھی۔ میرے دل و دماغ کی، نوکھی منطق نے مجھے اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ اگر میں شعر نہیں لکھ سکتا، کیونکہ اس کی شکل میری شکل سے بھی زیادہ دافع شعر تھی۔ وہ پلاٹیرو تھا۔ ایسا پلاٹیرو جو معصوم بھی نہ لگ سکے۔ وہ اس الّو کی طرح تھا، خلا جو کاٹھ کا بھی نہیں بلکہ اصلی ہو اور جسے آپ عبادت کے لیے جاتے ہوئے آناً فاناً کہیں ببول پر بیٹھا ہوا دیکھ لیں اور جس سے آپ ڈر جائیں۔ مجھے کیسے پتا چلا کہ وہ بھی شعر چوری کرتے ہوں گے؟ تمہ ے آسان طریقے سے۔ جب

وہ اپنا شیو بناتے تھے تو ٹھوڑی پہ ہمیشہ کہیں نہ کہیں بالوں کا ایک ٹھنٹھ رہ جاتا تھا......

دزدِ سخن والی رات میں اور میرے چھوٹے بھائی نے ان کا سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے صرف اُن کی چوری کے ماخذات نکال لیے، حالانکہ اس میں پیسے بھی پڑے ہوئے تھے۔ ہندو سبھا کالج، امرتسر سے ایک رسالہ نکلتا تھا جس کا نام، شوالہ، تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ چوریاں یاریاں سب شوالوں ہی میں ہوتی ہیں۔

ان کی چوری پکڑ کر جیسے مجھے سکونِ قلب حاصل ہو گیا، جیسے میرے سب گناہ دُھل گئے۔ پہلی چوری اور بعد کی گرفتاری کا لمزہ ابھی تک بدن میں باقی تھا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ برا لکھوں گا، لیکن اپنا بُرا۔ کسی کا بُرا لکھنے سے کیا فائدہ؟

دیکھا باپ رونداریو؟ بعض وقت کتنی اچھی چیز کی ابتدا کتنی گندی چیز سے ہوتی ہے۔ خود انسان ہی کو دیکھیے، کیسے غلاظت میں لپٹا چلا آتا ہے اور پھر کیا سے کیا بن جاتا ہے؟ سوائے کلیسا اور دوسرے مذاہب کی دیومالاؤں کے چند کرداروں کے، سب اسی طرح سے آئے اور کیا کچھ نہ بن گئے۔ ان کرداروں کی بھی مجبر العقول پیدائش کو عقل اور عقلِ محض کی لونڈی سائنس باور کرے یا نہ کرے، لیکن میں تو کروں گا۔ بلکہ میں، جو کہانیاں لکھتا ہوں اور جس نے اپنے پچھلے جنموں میں اپنے وجود سے بے شمار دیومالائیں لکھی ہیں، انسان کو ایسے ایسے طریقوں سے پیدا کروں گا کہ خود میری دیومالائیں دانتوں

میں انگلی دبا کر میری طرف دیکھیں کیونکہ میرے نزدیک اس قسم کی عجیب الخلقت پیدائشوں میں بہت بڑا سچ ہے، جسے میں جھوٹ سچ کہتا ہوں اور جس بات کو میں جھوٹ سمجھتا ہوں، فادر روزاریو، اسے میں سچ جھوٹ کہتا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ کوئی چیز ثابت و سالم نہیں اور نہ اکائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ سوائے اس خدا یا سو سوا سو عناصر کے جو مرکب ہونے کے لیے تڑپتے ہیں۔ سونا ان میں سے ایک ہے، مگر اس کی حیثیت بھی اس وقت بنتی ہے، جب وہ میری معشوقہ کے گلے کی زینت ہو۔ اگر اکائی ہی سب کچھ ہوتی باپ روزاریو، تو پرماتما جو پرش ہے، مزے سے اکیلا رہتا۔ کیونکہ اس نے اپنے لیے پرکرتی پیدا کر لی؟ کیوں ہر چیز کو نامکمل رکھا اور مرکب ہو جانے پر مجبور کر دیا؟ کیا اس لیے کہ موت میں بکھر جانے کا فن سیکھے؟ واہ! کیا فن ہے؟ وہ جذبہ جو کر کو دیا، اس کا کچھ حصّہ مادہ کو بھی کیوں دے دیا؟ ——— میں بتاتا ہوں، کیوں؟ اس لیے کہ ہر چیز تکمیل کے لیے تڑپتی رہے اور اچھی اچھی کہانیاں پیدا ہوں، شعر کہے جائیں، تصویریں بنیں اور تانیں اٹھیں۔ اکائی کوئی چیز نہیں فادر! وہ صرف حساب کے کام آتی ہے اور اس سے پرے ہو کر بے معنی اور بے مزہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے روزمرّہ میں کوئی دھڑ سے کہہ ڈالتا ہے کہ تروجن کو پارو سے محبّت ہو گئی۔ ٹھیک ہے، ہو گئی۔ مگر تروجن نین یا تیسری آنکھ رکھنے کے باوجود کیوں پارو پہ قبضہ کرنا، اس سے شادی رچانا چاہتا ہے؟ کیوں اس پہ جھپٹنے کی کوشش کرتا ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ حسن کی تاب نہیں لا سکتا یا پارو خود ہی مقبوض و تاراج ہونا چاہتی ہے؟ چونکہ دونوں

ہی باتیں صحیح ہیں، اس لیے ہیں جو، ان کی محبّت کو آنے والی نسلوں اور اپنی کہانیوں کی خاطر تسلیم کرتا ہوں، نفرت محبّت کہوں گا، جو ترکیب میں نے ڈی ایچ لارنس سے لی ہے ۔ اسی طرح کسی اوباش کی ایک دوشیزہ سے محبت کو محبت نفرت، ان کے رشتے کو انبساط و درد کا رشتہ...... ایسے ہی بلند و پست، اندھیرا اجالا وغیرہ..... بہرکیف میں اپنی اس چوری کو اسی صورت میں سراہوں گا، فادر، اگر آپ میری کہانیوں کو اچھا سمجھتے ہوں تو، ورنہ منزل اور اس تک پہنچنے کے ذرائع وغیرہ کے فلسفے کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں ۔

افسوس! آپ نے تو میری ایک بھی کہانی نہیں پڑھی ۔ ایکا ایکی میری چار اچھی کہانیوں کے نام مت پوچھیے گا پلاٹیرو..... میرا مطلب ہے، فادر، کیوں کہ ایکا ایکی پوچھ لینے سے تو میں اپنا نام بھی بھول جاتا ہوں۔ میں نے اچھی کہانیاں لکھی ہیں جن میں سے ایک تو بائیبل کی سیمسن اور دلائیلہ سے لکھی ہے ۔ اچھا، میری کہانی نہیں پڑھی تو کرشن چندر کی "کنواری" پڑھی ہے، مجھے وہ بہت پسند ہے ۔ واقعی جنسی جذبہ انسان میں نہیں مرتا چاہے وہ کتنا ہی بوڑھا اور ریکار کیوں نہ ہو جائے ۔ جنسی جذبے کا براہ راست خالق سے تعلق ہے ۔ فادر، جو ایڑا اپنگلا اور سشمن ناڑیوں کی مدد سے نیچے بدن میں آتا ہے تو بچّے پیدا کرتا ہے اور آنکھوں کے بیچ تیسری آنکھ کے قریب آتا ہے تو افسانے ہیں ۔ تے بھی "کنواری" کی قبیل کی ایک کہانی "لمبی لڑکی" کے نام سے لکھی ہے، جس میں لڑکی اس قدر لمبی ہے کہ اسے اپنے قد کا لڑکا نہیں ملتا ۔ اسی کڑھن میں اس کی دادی مر بھی نہیں پاتی حالانکہ سامنے

اس کو اپنا لڑکا، لمبی لڑکی کا باپ دم توڑ دیتا ہے۔ آخر ناٹے قد کا ایک لڑکا اس لڑکی کو دیکھنے آتا ہے جسے اٹھنے، چلنے، پھرنے کی ممانعت ہے۔ کیونکہ ایسے میں اس کی لمبان کے کھل جانے کا اندیشہ ہے۔ آخر شادی ہو جاتی ہے اور پھیروں میں لڑکی کو دہری۔ تہری ہو کر چلنے کی ہدایت ہے۔ کیسی بے بسی ہے جس میں وہ لڑکی اس ہدایت پر عمل کرتی ہے مگر نہیں جانتی؟ شادی کے بعد دلہا دلہن دونوں دُور آسام چلے جاتے ہیں اور جب مہینوں کوئی خط نہیں آتا تو بڑھیا کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے میاں نے اُسے نکال دیا ہو گا۔ سال کے بعد ایکا ایکی وہ وارد ہو جاتے ہیں مگر اس وقت بھی بڑھیا دھپ سے ہاتھ لڑکی کے سر پر رکھتی ہے اور اسے نیچی ہو کر چلنے کے لیے کہتی ہے۔ اس کے دماغ میں یہ بات ہی نہیں بیٹھتی کہ اب تک لڑکے اور لڑکی نے ایک دوسرے کو دیکھ پرکھ لیا ہو گا۔ یہ کیسا ڈر تھا جس کا شروع اور آخر تو تھا لیکن بیچ کی منزلیں غائب تھیں؟ جب بڑھیا کو پتا چلتا ہے کہ لڑکی پیٹ سے ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی پوتی بس گئی ہے۔ اب وہ تسلّی سے مر سکتی ہے۔ لیکن مرنے سے چند ہی لمحے پہلے اس کے بوڑھے جھرّیوں سے پٹے چہرے پہ مسکراہٹ چلی آتی ہے اور وہ لڑکی سے پوچھتی ہے۔ "ہائے ری منی! تیرا دہ تجھ سے پیار کیسے کرتا ہو گا؟" ...... پھر ...... پھر داتا ورن میں دالو نتو پربل ہو اٹھتا ہے اور بڑھیا کے سر ہانے رکھی ہوئی گیتا کے پنّے ہوا میں اڑنے لگتے ہیں اور اپنی جگہ پر آکر رک جاتے ہیں جہاں شبد سماپت، لکھا ہوتا ہے ...

...... میں اس کہانی میں آپٹیکل اِلوژن کی بات نہیں کرتا جس میں لمبی

سے لمبی لڑکی لپیٹے میں چھوٹی ہو جاتی ہے بلکہ اس ترتیب اور ہم آہنگی کا فیضہ کہتا ہوں جو انسانی دماغ ہر بے ہنگم چیز میں پیدا کر لیتا ہے ۔ اس پر بھی کرشن چندر کی کہانی میری کہانی سے بہتر ہے ۔ ہاں فادر ! میں اپنے اس ہمعصر کی تعریف محض رقابت کے جذبے سے کر رہا ہوں ۔ لیکن اسے رقابت رفاقت کہتا ہوں ۔ وہ بھی ایسے ہی میرے ساتھ رفاقت رقابت کرتے آئے ہیں ۔

حیف کہ آپ نے کرشن چندر کی کوئی کہانی پڑھی ہے ، نہ عصمت کی اور نہ منٹو کی ۔ آپ تو ناچ رنگ ، سینما تماشے ، قصّے کہانیوں کو ایسی باتیں سمجھتے ہیں جو آپ کو ازلی حقیقت سے پرے لے جاتی ہیں ۔ آپ کی نظروں میں وہ سب پاپ ہے جو ہندو فلسفیوں کے نزدیک "پرے" اور "آپ" کا مرکّب ہے ۔ یعنی کہ وہ چیز جو آپ کو اپنے "آپ" سے پرے لے جائے ۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں ، فادر کہ میں نے ہمیشہ اس آپ سے پرے ہٹنا چاہا ، کیونکہ میرے نزدیک یہی انسانی حصول کی معراج ہے ۔ کیا آپ نے مصری رقّاصہ حلیمہ کے لچکیلے بدن کو رقص کو عالمگیر اثبات میں ہاں ہاں کرتے دیکھا ہے ؟ کم از کم روسی بیلے میں مارگٹ فونٹین اور ینیورئیف ہی کو دیکھ لیتے تو پتا چل جاتا کہ خالق کا اپنی تخلیق سے کیا رشتہ ہے ؟ روسی بیلے ڈانسر تو کثرتِ تعلیم کی وجہ سے اس بات کو نہیں جانتے ، لیکن آپ تو جانتے ہیں ؟ سونجا ہینی کو برف پہ اسکیٹ کرتے دیکھنے میں تو کوئی گناہ نہیں ؟ کیسے وہ برف پہ خط اور دائرے بناتی ، زندگی اور ماورا کے چکّر سمجھاتی ہے ؟ کچھ نہیں تو اس برف ہی کو چوم لیتے جسے آپ پسند

کرتے ہیں اور جو آپ کے جسم و ذہن کا حصہ ہو چکی ہے۔ آپ نے یہودی مینوہن کی وائلن نہیں سنی تو گیارہ ی شنکر اور ولایت حسین کی ستار سنی ہے وہ بھی تو روح ہی کی آوازیں ہیں۔ سبّو لکشمی "میرا" کے بھجن بھی تو گاتی ہے جس سے آپ اپنے مطلب کی بات سمجھ سکتے ہیں۔ اور میں اپنے مطلب کی۔ بالا سرسوتی بوڑھی ہو گئی ہے۔ خادر، یا گورو کرپ جوان ہو گیا ہے؟ حسین؛ آرا، بد مستی اور گائی ٹونڈے محل نہیں بنا سکے حالانکہ ہمارے مندر، مسجد، گرجے اور بلوں کی چمنیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ باپ روزاریو! آپ شاید نہیں جانتے کہ ہمارے دیس کی ستی ساوتری بھی وہی بات کہتی ہے جو امریکہ کی ریٹا ہیورتھ، جب وہ اپنے میاں آرسن ویلز سے طلاق لیتی ہے۔ فرانسیسی ایکٹرس بال مورو کی اداکاری دیکھی ہے۔ اور اس کے بعد اس کا بیان پڑھا ہے جس میں وہ کہتی ہے کہ فن کے اوج کو چھو لینے کے لیے میرے نزدیک اس ڈائریکٹر کے ساتھ سونا ضروری ہے، جس کے ساتھ میں کام کر رہی ہوں؟ نٹیک ناچ والے بھی آپ ہی کی طرح سے اس بدن کو جھٹک دینا چاہتے ہیں جو روح کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ جرمنی کی نئی بیماری "چومنے دو" (LET KISS) کی راہ بھی روح کے مرکز کو جاتی ہے لیکن بدن سے ہو کر۔ آپ اگر مانتے ہیں کہ حقیقت تک پہنچنے کے اور بھی بہت سے راستے ہیں تو پھر عیسائی کون ہے، مسلمان کون اور ہندو کون؟ پھر میری کہانی سے استغنا کیسی؟ تنہا آپ ہی نہیں، باپ روزاریو، جو کہانی کو مہمل بات سمجھتے ہیں۔ اور بھی بہت سے باپ ہیں۔ جب میں نے اپنی پہلی کہانی لکھی

تو میں اتنا ہی خوش تھا جتنا کہ اس دنیا کی تخلیق کے بعد خدا خوش ہوا ہوگا۔ کیا دنیا یہ ممکنات بھی جو میرے دماغ کے اللہ دینی چراغ نے میرے سامنے کھول دی تھی۔ باپ مر چکے تھے گھر میں غریبی کا دور دورہ تھا۔ بڑوں میں صرف میرے بڈھے تاؤجی رہ گئے تھے جو کسی طرح ہمارے نان نفقہ کے کفیل نہ ہو سکتے تھے۔ کیونکہ ان سے اپنی چھوٹی سی زمینداری بھی نہ چلتی تھی ایک دن میں نے ان سے کہا — آپ سب بھول جائیے تاؤجی! مجھے کہانیاں لکھنی آگئی ہیں اور میں ان سے بہت پیسے کماؤں گا۔ میرے تاؤ آپ سے بھی زیادہ بھولے تھے فادر روزاریو! وہ جیپ تپ، نیم پیچ سنجم" کے بہت قائل تھے ان کی آنکھوں میں آنسو چلے آئے اور انھوں نے مجھ سے پوچھا "کیا تم زندگی بھر جھوٹ ہی کی کمائی کھاؤ گے جاہن؟"

جب سے میں برابر جھوٹ بول رہا ہوں، فادر، لیکن اسے جھوٹ سچ کہتا ہوں۔ یہ ترکیب میں نے اپنی آسائش اور سہولت کے لیے نہیں بنائی بلکہ میں اس کا قائل ہوں۔ آپ کے خدا کی زبان بھی خالص سچ نہیں ہے وہ بھی کنایے میں بات کرتا ہے۔ اس نے کبھی سامنے آکر سچ کے طریقے سے نہیں کہا — میں ہوں — اس نے کسی قتل کے مقدمے میں گواہی نہیں دی۔ حالانکہ بعض حالات میں قتل صرف اسی نے دیکھا ہوتا ہے۔ وہ تو کہتا ہے — تم ہو، اس لیے میں ہوں۔ گواہ ڈھونڈنے کے لیے دوڑو، بھاگو اور اگر کوئی نہ ملے تو پیدا کرلو۔ آدمی سخت پریشان ہوتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ آج گواہ کو پیدا کرنا شروع کیا تو کتنی دیر میں وہ پلے گا اور پل کر جوان ہوگا؟ وہ کہتا ہے، میری مملکت میں انگلیوں کی لکیریں مسکت گواہی دیتی ہیں، اینٹ پتھر بھی بولتے ہیں۔ ان کا بیان نہ لے سکو تو ایسے ہی کان

کھول کر بکھیر دو۔ کیونکہ کہیں نہ کہیں قاتل کی آستین کا لہو پکار رہا ہوگا۔ اگر وکیلوں کی رشوہ دوانیوں کی وجہ سے قاتل بری ہو جائے تو بھی وہ کچھ نہیں کہتا۔ ضرور پچھلی زندگی میں مقتول نے قاتل کو قتل کیا ہوگا۔ اس لیے اس زندگی میں حساب بے باق ہو گیا۔ وہ ہمیں کبھی ایک خوبصورت ساخرگوش ہاتھ میں تھما دیتا ہے اور کبھی بدصورت ساخار پشت۔ یہ اس کی کہانیاں اور پہیلیاں ہیں جو ہماری سمجھ کو آزماتی اور اسے صیقل کرتی ہیں پنجابی شاعر گیبربا کے مطابق اس نے گلاب کو بیسیوں زبانیں دی ہیں۔ لیکن وہ چپ ہے۔ اگر بات کرتا ہے تو اشارے کی زبان میں۔ خدا کی اپنی زبان بھی تلمیح (ALLUSION) کی ہے۔ اور وجودِ التباس (ILLUSION) کا وہ خود مایا کی معرفت باتیں کرتا ہے۔ اور کبھی ٹھیٹ سچ نہیں بولتا۔ گلیلیو، منصور، سقراط، عیسیٰ اور گاندھی اسی لیے مارے گئے کہ انھوں نے خالص سچ بولا۔ اور جھوٹ پر سچ کی عظمت کو نظرانداز کر گئے۔ انھوں نے اپنے سامنے لوگوں کو اس سلسلے میں شہادت پاتے ہوئے دیکھا مگر یہ بھول گئے کہ انسان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن سامنے کا سچ نہیں۔

آپ کھرے کھرے سچ میں یقین رکھتے ہیں، باپ رو زار یو! تو لیجیے میں آپ کو کچھ سچی باتیں اپنی کہانیوں کے سلسلے میں بتاتا ہوں وہ بالکل سچی ہیں۔ دیسی گھی کی طرح خالص اور گاڑھی گاڑھی۔

میں نے اپنی کہانی "ببل" میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ مرد اور عورت کے بیچ خوش وقتی برحق ہے، لیکن انسانی معاشرے کا کوئی بین

نقشہ سوائے اس بات کے نہیں بنتا کہ مرد اور عورت شادی کریں اور اس کے بعد بچّوں کی ذمہ داری قبول لیں۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے جنسی فعل میں تقدیس پیدا ہو سکتی ہے۔ جسے دنیا کے ننانوے فیصد لوگ گندہ اور نجس سمجھتے ہیں۔ اور اسے دردناک بلکہ شرمناک مجبوری گردانتے ہیں......

درباری لال ایک بچّے ببّل کو اس کی بھکارن ماں مصری سے کرایے پہ لے کر ہوٹل میں لے جاتا ہے تو سب اسے خوش آمدید کہتے ہیں۔ حالانکہ اس سے ایک ہی روز پہلے کسی دوسرے ہوٹل والے نے اسے لچّا لفنگا کہہ کر بھگا دیا تھا۔ وہاں جب وہ سینا کے ساتھ ہم بستری کرنے لگتا ہے تو ببّل رونے لگتا ہے۔ درباری اسے مارنے کے لیے دوڑتا ہے، لیکن نیم عریاں سینا دوڑ کر بچّے کو پکڑ لیتی ہے۔ اور اسے اپنی چھاتی سے لگا لیتی ہے۔ وہ درباری کو دنیا کا اسفل ترین آدمی سمجھتی ہے جس نے اس کام کے لیے ایک معصوم بچّے کو استعمال کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ وہ ایک طرف کھڑی ہے بچّے کے ساتھ، جو عورت —— ماں کا غیر منفک حصّہ ہے اور ایسی نظروں سے درباری کی طرف دیکھتی ہے کہ اس پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔ وہ اسی منفعل حالت میں سینا سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ پہلے شادی کرے گا......

...... جس پیچ سے میں نے کہانی کا پلاٹ لیا ہے، باپ روز ادیو! اس میں میرے ہیرو نے وہسکی پی کر اور پانچ روپے والا پان کھا کر، سینا کی اس حد تک آبرو ریزی کی تھی کہ وہ نیم مردہ حالت میں ہسپتال لے جائی گئی اور حجاب سے بچّے کے پیٹ میں سے افیون اور اس کا اثر دور کیا گیا....

اور سچ کہوں؟ "ٹرمینس سے پرے" ہیں موہن جام وکٹوریہ ٹرمینس کے اسٹیشن پر اپنی بیوی کو پہاڑ پہ جانے کے لیے رخصت کرتا ہے گاڑی چلتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی واقف کار اچلا نے اسی گاڑی میں اپنے شوہر کو دلی کے لیے رخصت کیا ہے۔ موہن جام اچلا کو اپنی کار میں لفٹ دیتا ہے۔ اور اس طریقے سے آگ اور تیل کا گھٹیا سا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ ایک دوسرے کے بہت ہی قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن معاشرے کے تضادات ایک طرف گناہ کے محرک ہوتے ہیں تو دوسری طرف سدِّباب بھی۔ اچلا موہن جام کو زیادہ آگے بڑھنے سے روک دیتی ہے اور کہتی ہے --- کیا مرد اور عورت کے درمیان اور کوئی رشتہ نہیں بنتا؟ کیا وہ بہن بھائی نہیں ہو سکتے؟ ...... موہن جام برافروختہ ہو کر اسے بہن کہ دیتا ہے لیکن

ادھر موہن جام کی بیوی سومترا لوٹ آتی ہے اور ادھر اچلا کا شوہر رام گڈکری۔ رکھشا بندھن کے دن موہن جام تین ساڑھے تین سو کی ساڑھی اور سو روپیہ نقد اچلا کی نذر کرتا ہے۔ حالانکہ اس شہر میں اپنی سگی بہن کو اس نے صرف دس روپے دیئے تھے۔ اچلا اس دن صبح ہی سے سجی بنی رہی تھی اور اس نے جو رکھشا موہن جام کے لیے بنائی تھی، اس میں کلابتوں کے علاوہ سچے موتی ٹانکے تھے۔ موہن جام رکھشا بندھوا کر، ایک سرد آہ بھرتے ہوئے چلا جاتا ہے۔ جبھی اچلا کے اعصاب

جواب دے جاتے ہیں اور وہ اپنے میاں رام گدکری سے لپٹ جاتی ہے۔ اور اسے کہتی ہے" مجھ سے پیار کرو، اور، اور.....'' اب حقیقت یہ ہے کہ موہن جام اور اچلا نے باہمی سازش سے علی الترتیب اپنی بیوی اور اپنے میاں کو بھجوا دیا تھا۔ اب اچلا کے ہاں ایک بچہ ہے جسے اچلا کا شوہر رام گدکری اپنا سمجھتا ہے اور روز اس سے کھیلتے ہوئے کہتا ہے میرا پتو، میرا منو......

یہ نہیں کہ دنیا میں ہر جگہ غلاظت ہی غلاظت اور بدکاری ہی بدکاری ہے۔ نیکی کا سچ یہ ہے کہ میرے افسانے "اپنے دکھ مجھے دیدو" کی اندو اپنی حقیقی زندگی میں اتنی "بلند کردار" بن چکی ہے کہ اسے اپنے سوا اور کوئی آدمی اچھا ہی نظر نہیں آتا۔ سب گندے اور غلاظت سے اٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے لڑکے، اس کی لڑکیاں، حتیٰ کہ اس کا شوہر بھی اس کے پاس نہیں پھٹکتے۔ سب اپنی پہلی فرصت میں اس سے کہیں دور بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ وہ اکیلی بیٹھی پوجا پاٹھ کیا کرتی ہے۔ اور کبھی کبھی آنے جانے والوں کو اس کی وحشت ناک ہنسی سنائی دیتی ہے۔

سچ سننے کی تاب کس میں ہے، باپ رہ زار لو! نہیں میں سچ نہ بولوں گا یا ایسا سچ بولوں گا جو آپ کے سچ سے ارفع ہو۔ یعنی اس میں جھوٹ کی حسین سی آمیزش ہو۔ ایسا نہ کروں گا تو معاشرے میں طوائف الملوکی پھیل جائے گی۔ لوگ مجھے مار دیں گے اور میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے زندگی سے بڑی کمینہ سی محبت ہے۔ میں شہادت کو پسند کرتا ہوں بشرطیکہ کسی

دوسرے کی ہو۔ میں اپنی پیٹھ پر صلیب اٹھاتا ہوں۔ لیکن اس امید میں کہ ایک دن اسے جھٹک دوں گا۔ پہلے میں بہت بے ضرر قسم کی کہانیاں لکھا کرتا تھا، فادر، جن کا تعلق سطح، محض سطح سے تھا۔ اب جبکہ میں نے انسان کے تحت الشعور میں جانے کی کوشش کی ہے تو پہلے ہی نقادوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ تم جنس لکھنے لگے ہو۔ میں جنس پر لکھتا بھی ہوں، باپ روزاریو! تو ایک ذمے داری کے احساس کے ساتھ۔ ایسے ہی ارتعاش پیدا کرنے یا مرتعش ہونے کے لیے نہیں۔ یوں مجھے اپنے گناہ جو پوری طرح سے گناہ نہیں بن پاتے، بے حد عزیز ہیں۔ دراصل میں آپ کے پاس اتنا اعتراف گناہ کے لیے نہیں آیا، جتنا یہ بات کہنے کے لیے آیا ہوں کہ میں اور گناہ کروں گا تاکہ آپ کی نوکری بنی رہے۔ میں مجبور ہوں، باپ روزاریو! جب گناہ کی گھڑی آتی ہے تو میرے جسم و ذہن بلکہ کام و دہن اسی طرح سے کانپنے لگتے ہیں، جیسے آپ حسنِ ازل سے دوچار ہو کر۔ میں بھی اپنے میدانِ عمل میں ایک طرح کا پادری ہو گیا ہوں۔ قاتل خود مقدمے کی سماعت کے لیے میرے پاس آتے ہیں۔ میرے لکھنے کے کمرے میں جو ایک پلانٹ ہے، اس نے روٹھ کر مجھ سے کہا ـــــ دو دن ہو گئے، تم نے مجھے پانی ہی نہیں ڈالا۔ میں کیا جواب دیتا۔ میں نے شرارت سے کہا۔ کے روز ہو گئے، تم نے مجھے گھاس ہی نہیں ڈالی۔ وہ ہنس پڑا اور میں بھی لد دیا۔ اس کے بعد میں نے اس کے پتوں کو چوما، ہاتھ سے اپنے بدن کی حرارت دی جو کثرتِ گناہ سے ہمیشہ جلتے رہتے ہیں اس نے مجھے اپنے بدن کی

بہری ٹھنڈک دی۔ میرے گھر کے سامنے ایک ڈسٹ بن ہے جہاں محلے کے لوگ کوڑا کرکٹ پھینکتے ہیں۔ اس میں ڈبل روٹی کا ایک سلائس پڑا تھا۔ میں کہیں ادھر سے گذر رہا تھا کہ کوڑے کے ڈھیر میں سے سر اٹھا کر اس نے مجھ سے کہا۔ دیکھو، دیکھو جاہن مجھے کہاں پھینک گئے ہیں؟ یہ میری جگہ نہیں ہے۔ جبکہ اسی سڑک کے موڑ پر، پان والے کی دکان کے پاس کئی بھوکے گھوم رہے ہیں۔ ابھی ابھی میرے پروڈیوسر نے کہا ہے کہ پکچر آگے نہیں چلے گی کیونکہ ہماری ہیروئن حاملہ ہو گئی ہے۔ اب ہم اور ہمارا پورا یونٹ اگلے چھ آٹھ مہینے تک بیکار رہیں گے۔ اور ہیروئن کی صحت کے لیے دعائیں کرنے پر مجبور۔ یا ایک دوسرے کے سامنے سر پھٹول کریں گے جو کہ ہر آدمی بیکاری میں کرتا ہے!

سامنے ڈان باسکو اسکول کا گرجا دیکھ رہے ہیں نا؟ اس میں بجنے والے گھنٹے کی آواز بے حد خوبصورت ہے۔ میں مندر اور مسجد وغیرہ میں تو نہیں جاتا لیکن گھنٹوں کی آواز اور اذان مجھے بہت پیاری لگتی ہیں۔ میں ان کی بازگشت کا پیچھا کرتا ہوا اتنی دور نکل جاتا ہوں کہ آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں انہی کی طرح لطیف سے لطیف تر ہوتا جا رہا ہوں۔ روح کا تو وزن نہیں ہوتا، میرا بدن بھی بے وزن ہو جاتا ہے اور میں پوری کائنات پہ پھیل جاتا ہوں۔ جب میری شکل جاہن کی نہیں رہتی۔ میں وہ پرماتما بن جاتا ہوں جو "اروپ" اور "نرا کار" ہے مجھے خدا کی اس بے صفتی سے بے حد محبت ہے کیونکہ اس کی اسی صفت سے ہم جو کہانیاں لکھتے اور تصویریں

سناتے ہیں، اپنے لیے گنجائش پاتے ہیں جیسے ہم بھی اپنے طریقے سے چھوٹے چھوٹے خداؤں جب میں اپنے دل کی خوبصورت گھلاوٹ میں ٹیگور کی نظم پڑھتا ہوں۔

اے اُروپ! میں بھی تو روپ ہین ہوں۔
تیرے روپ کی جوتی، میرے آکار کی سیاہی کو روپ مان اور اجاگر کر دیتی ہے۔
تیرے روپ کی جوتی —— میرا جیون آدھار ہے،
اس کے بنا میرے وجود کا رنگ، اور میرے آکار کے تیز مجذبی میں گم ہو جاتے ہیں ......

فادر روزاریو! میں اپنی اس آگہی سے کبھی خود ہی متوحش ہو اٹھتا ہوں۔ آپ اندازہ کیجیے۔ وہ آدمی کیسے زندہ رہ سکتا ہے جسے اپنی روح کے اندھیرے میں ایک ساتھ لاکھوں، کروڑوں آوازیں سنائی دیں؟ جو اس قدر لطیف ہو جائے کہ خود کو بھی ڈھونڈنے پر نہ پا سکے۔ جب آگہی آتی ہے تو آپ اپنی ذات میں ہزاروں معجزے ہوتے دیکھتے ہیں۔ دنیا کی ہر کثیف و لطیف چیز کا رشتہ سمجھ لیتے ہیں اور جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو ایک بے بضاعت سی چیونٹی بھی استعارہ بدوش آپ کے سامنے چلی آتی ہے۔

کیا کہا، پاپ روزاریو؟ آپ کلیسا چھوڑ رہے ہیں؟ نہیں فادر، خدا کے لیے ایسا مت کیجیے۔ میری طرح اکیلے جینا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ آپ اور آپ کی قبیل کے اور لوگ جی ہی نہیں سکتے۔ جب تک وہ کسی مذہب، فرقے یا گروہ سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ میں نے جو بھی جھوٹ سچ بولا ہے۔ وہ کسی کے کام نہیں۔ آپ نے کلیسا چھوڑ دیا تو آپ مر جائیں گے اور وہ بھی پاگل

ہو کر......

مجھے اجازت دیجیے فادر!...... وہ آدمی جو ایک مرد اور عورت کے جھگڑے میں پڑ گیا تھا اور عورت کو الگ لے جانے کے بعد آج تک لوٹا ہی نہ تھا، ایکا ایکی کہیں سے پھر آیا ہے۔ میں جا کر ذرا اس سے پوچھوں تو کہ آخر بات کیا ہوئی؟

○

فنون

شیودت کمار دیما

دل دریا

میں کھڑا کھڑا تھک گیا ہوں۔

لوٹ کر دھرم شالہ جانے کو بھی من نہیں چاہ رہا۔ ایک عجیب سا دکھ، عجیب سی اداسی سارے وجود پر چھا گئی ہے۔ ایسا گہرا اور لمحہ بہ لمحہ پھیلتا ہوا دکھ جو کچھ کرنے نہیں دیتا، شاید یہی وہ دُکھ تھا جس نے گوتم کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دریا پر رات اتر آئی ہے اور گھاٹ کی روشنیاں مند مند بہتے پانی پر جھلملا رہی ہیں۔ مندروں میں شام کی آرتی کے بعد خاموشی چھا گئی ہے۔ ایسی خاموشی جو مقدس بھی ہے اور پُراسرار بھی۔ بالکل خدا کے وجود کی طرح۔ دریا کے پار سادھوؤں کی ایک ٹولی الاؤ جلائے بیٹھی ہے۔ فضا میں کبیر کے دوہے کی سی نرم گمبھیرتا اور اداسی ہے اور میں گنگا کو دیکھ دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ سادھو ہو جاؤں کہ یہی مکتی کی راہ ہے۔

میں بیٹھ گیا ہوں۔ ہر کی پوڑی ٹھنڈی ہے اور یہی بے جان سی ٹھنڈک فضا میں بھی ہے۔ بالکل ہمارے گھر کی طرح۔ گھاٹ سنسان ہے۔ مجھے غور سے دیکھنے والا جٹا دھاری سادھو کھڑاویں بجاتا پُل پار کر چکا ہے اور وہ گھی کے چراغ جو میں نے پاروتی کی آتما کی راہ میں روشنی کرنے کے لیے ان پوتر لہروں پر بہائے

تھکے ڈھلتے ہوئے دور چلے گئے ہیں۔ اُدھر جہاں سمندر ہے۔ وسیع و عمیق۔ اور وہ ذرا فاصلے پر جلتی ہوئی زرد بتّی بالکل اکیلی اکیلی سی لگ رہی ہے اور یوں چپ چاپ اداسی سے سب کچھ دیکھ رہی ہے جیسے پاروتی اپنی کھڑکی کی سلاخیں تھامے کھڑی بچّوں کو کھیلتے دیکھا کرتی تھی۔

پاروتی ہماری کوئی نہیں تھی۔ پڑوسن بھی نہیں۔ کبھی وہ ہمارے مکان کے ایک حصّے میں کرایے دار تھی اور اپنی بیوہ پھوپھی کے ساتھ رہتی تھی لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں پیدا نہیں ہوا تھا کہ پتاجی کی شادی نہیں ہوئی تھی اور ماں اس گھر میں نہیں آئی تھی (یہ سب باتیں مجھے گاہے بگاہے دیدی سے معلوم ہوتی رہی ہیں، جس نے یہ سب کچھ ماں اور دادی سے سنا تھا۔) پاروتی کے ماں باپ نہیں رہے تھے اور اس کی پرورش اُس کی بیوہ پھوپھی نے کی تھی۔ دادی نے ایک صبح اُن کا سامان اٹھوا کر گلی میں رکھوا دیا کہ اُسے جگہ کی ضرورت تھی۔ پتاجی کی شادی ہو تھی۔ ماں کو دادی اس کی پیدائش سے پہلے ہی پیار کرنے لگی تھی، یعنی جب وہ ہماری نانی کے پیٹ میں ہی تھی تو دادی نے اُسے اپنی بہو بنا لیا تھا۔ اس طرح وہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس گھر میں تھی۔ دادی پٹواری کی بیٹی اور تھانیدار کی بیوی تھی اس لیے ہمیشہ حکومت کرتی رہی کہتے ہیں کہ اس کے آگے چڑیا بھی پر نہیں مارتی تھی۔ (یہ کیسے ہو سکتا ہے؟) دادی میری پیدائش سے پہلے ہی آسمانوں میں چلی گئی، جہاں جنت میں خدا اور جہنم میں شیطان کی حکومت ہے۔ نہ جانے وہ وہاں کیا کرتی ہوگی۔ شاید چڑیوں کو اڑتے دیکھتی ہو۔ پاروتی اور اس کی پھوپھی ہمارے مکان

سے نکل کر اس مکان میں رہنے لگیں جس میں آخر تک پاروتی رہی۔ اُس کی پھوپھی غریب تھی اور بوڑھی بھی۔ اس نے بہتیرا چاہا کہ پاروتی کی شادی ہو جائے، لیکن پاروتی ہمیشہ انکار کرتی رہی اور جب پھوپھی بھی مر گئی تو یہ کہنے والا بھی کوئی نہ رہا۔

پاروتی میری کوئی نہیں تھی پھر بھی اپنی، بہت زیادہ اپنی لگتی۔ ایسی جو دل میں، سوچ میں اپنی ہوتی ہے اور سوچوں میں بستی ہے اور ہم ہر جگہ، ہر لمحہ اسے اپنے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ وہ کھڑکی اُس کھیلے میں کھلتی تھی جہاں گلی کے بچے کنچے کھیلا کرتے تھے اور شور مچاتے تھے اور آپس میں لڑتے تھے پھر فوراً من جاتے تھے کہ سکول کی طویل قید اور گھر کی پابندیوں کے بعد یہ اچھا لگتا تھا۔ میں بھی سکول سے آ کر سیدھا وہیں جاتا۔ نہ جانے کیوں پاروتی کے مکان کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہونا مجھ کو بھاتا تھا۔ شاید اس لیے کہ دیوار کے پیچھے اس مشین کی آواز ہوتی تھی جس پر پاروتی محلے والوں کے کپڑے سیا کرتی تھی۔ جب وہ کھڑکی میں آتی تو ہم سمجھ جاتے کہ اُسے سوئی، بٹن یا دھاگے کی گولی کی ضرورت ہے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور مجھے ڈر لگتا کہ کہیں وہ مجھ سے نہ کہہ دے۔ کیا میں انکار کر سکوں گا کہ میں چاہتا بھی تو تھا کہ وہ اپنے سب کام مجھ سے کروائے۔ اُس کی شخصیت میں اس قدر کشش تھی، اس کی آواز اتنی میٹھی، اتنی پیاری تھی۔ اور کیا میری ٹانگیں مجھے گلی کے باہر اس دکان تک لے جائیں گی، جہاں یہ سب کچھ ملتا تھا، کہ ماں کی سخت ہدایت تھی کہ اس سے بات نہ کرو۔ لیکن وہ مجھ سے نہیں کہتی تھی۔ اس کی نظریں

ایک پل کے لیے میرے چہرے پر ٹھہرتیں، وہ مسکراتی جیسے میرے خیالات پڑھ رہی ہو۔ بڑے ہونے کے کتنے فائدے ہیں؟ وہ کسی اور کو بلا کر چیز منگا لیتی۔ میرا دل اُس کوئلے کی طرح بُجھ جاتا جس پر پانی ڈال دیا گیا ہو اور پھر میں سارے کنچے ہار جاتا کہ ہارنا ہی اچھا لگتا۔

"پاروتی مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی" میں ڈیڈی کو بتاتا۔

"شی! ماں سن لے گی۔"

"ماں ہمیں اس سے بات کرنے سے کیوں منع کرتی ہے؟"

"وہ ہماری دشمن ہے۔"

ماں کہتی تھی پاروتی اچھی عورت نہیں ورنہ کوئی اس سے شادی نہ کر لیتا۔ اور یہ کہ وہ جادو ٹونا کرتی ہے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ جادو کرنے والیاں آدمی کو بھیڑ یا کتا بنا کر قید کر لیتی ہیں اور وہ کبھی آزاد نہیں ہوتا۔ میں کنچے کھیلتا ہوا اُسے غور سے دیکھتا تو وہ مجھے جادوگرنی بالکل نہ لگتی۔ اس کا چہرہ گول اور خوبصورت تھا اور آنکھیں بڑی بڑی اور کالی۔ وہ بال ہمیشہ کھلے رکھتی تھی جس سے کبھی کبھی مجھے ڈر سا آنے لگتا۔ میں جب اسے دیکھتا تو مجھے ماں کے پوجا کے کمرے میں رکھی چاندی کی لکشمی یاد آنے لگتی۔ اور لکشمی کی تو ماں پوجا کرتی تھی، پھول چڑھاتی تھی اور آرتی اتارتی تھی لیکن پاروتی کو گالیاں دیتی تھی اور کوستی تھی۔ میں پتاجی سے پوچھتا تو وہ یوں میری طرف دیکھتے جیسے میرے آرپار دیکھ رہے ہوں۔ مجھے ان کا اس طرح دیکھنا ہمیشہ عجیب سا لگا ہے اور اس سے خوف بھی آیا ہے کہ ہم خود کو ان نظروں کے سامنے محفوظ محسوس نہیں کرتے اور کوئی راز، راز نہیں رہتا۔ اور جب ہمارا راز، راز

نہ وہ سکے تو زندگی کیا ہوئی، ہمارے وجود کے معنی کیا؛ دیسے شخصیت میں تھوڑا سا اسرار ضرور ہونا چاہیے کہ اس طرح آدمی (IMPORTANT) بنا رہتا ہے وہ مجھے جب اس طرح دیکھتے تو میں عجیب سی بےچینی محسوس کرنے لگتا اور مجھے خود پر غصہ آنے لگتا کہ میں انھیں اس طرح نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں صرف اُن کا چہرہ، ناک، کان، ہاتھ پاؤں دیکھ سکتا تھا کہ ماں نے بہت بچپن میں بتایا تھا کہ یہی تمھارا باپ ہے۔ (سب مائیں شاید یہی بتاتی ہیں معصوم بچّوں کو دھوکا دیتی ہیں۔) لیکن دراصل وہ باپ نہیں ہوتا جسے ہم دیکھتے ہیں۔ باپ تو اُس کے اندر، بہت گہرائی میں کہیں چھپا ہوتا ہے، جسے ہم میں سے بہت کبھی نہیں دیکھ پاتے اور سمجھ لیتے ہیں کہ یہی سچائی ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں۔

"پاروتی جادوگرنی ہے؟" میں پوچھتا۔

"جادو کوئی چیز نہیں۔"

"تو پھر ماں کیوں کہتی ہے؟"

"آدمی کو وہی بات ماننی چاہیے جس کا اسے یقین ہو۔"

"اسے بھی کسی کام کا نہ چھوڑنا۔" ماں، ایسے موقعوں پر، نہ جانے کہاں سے آٹپکتی جب پتاجی کی باتیں اچھی لگنے لگتیں اور دل ان کے پاس بیٹھنا چاہتا تو وہ چلی آتی۔

"چل، پڑھ جا کر۔"

پتاجی خاموش ہو جاتے۔ اُس کے بعد ایسا محسوس ہوتا کہ وہ وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں ہیں۔ میں اُٹھ کر آجاتا۔ ماں لعنتیں بھی بولتی رہتی۔ لیکن

پتاجی کی آواز سنائی نہ دیتی۔ وہ ماں کی باتوں میں کبھی دخل نہیں دیتے تھے۔
جو وہ کہتی خاموشی سے مان لیتے اور گھر میں بے تعلق سے رہتے۔ تب بھی
ماں اُن سے ناراض رہتی۔ پتاجی سے بات کرتے ہوئے اس کی آنکھیں لوہے
کی گولیوں کی طرح سرد رہتیں، پیشانی پر بل ہوتے اور لہجے میں تلخی ہوتی۔
اس کی آواز دیر تک سنائی دیتی رہتی، کچن میں، آنگن میں، کمرے میں، اور ہم
سب بہن بھائی سہمے سے کونوں میں دبکے رہتے اور پتاجی کے حقّے کی گڑگڑ
اور بھی تیز ہو جاتی اور دھواں جلدی جلدی اُن کے مُنہ سے نکلنے لگتا اور
وہ سر جھکائے اپنی مخصوص آرام کرسی پر خاموش بیٹھے رہتے ہیں سوچتا وہ
گوگی یا دالی کے ڈیڈی کی طرح کڑکتے، گرجتے کیوں نہیں؛ کبھی کبھی ماں کو ڈانٹ
کیوں نہیں دیا کرتے؟

میں ماں کی اُن لوہے کی گولیوں جیسی سرد نظروں سے بچنے کے لیے
پوجا کے کمرے میں چلا جاتا جہاں چاندی کی لکشمی پھولوں میں ڈھکی ہوتی اور
کمرے میں صندل اور لوبان کی خوشبو ہوتی۔ ماں دیر دیر تک مورتی کے
آگے جھکی رہتی۔ پتاجی اس کے کمرے میں کبھی نہیں گئے تھے، حالانکہ وہ ہمیشہ
دھرم اور آتما اور پرماتما کی باتیں کرتے، ان کی باتیں دلچسپ تو لگتی تھیں
لیکن تب سمجھ نہیں آیا کرتی تھیں۔ مورتی کے سامنے کھڑا میں سوچا کرتا ماں
جب دھرم کرم کو مانتی ہے، پوجا پاٹھ کرتی ہے تو پتاجی سے لڑتی کیوں ہے
اور وہ اتنی چڑچڑی کیوں ہو گئی ہے اور ہمیں پیار کیوں نہیں کرتی کبھی ہمارا
منہ کیوں نہیں چومتی، چھاتی سے کیوں نہیں لگاتی۔ دودھ بھی پینے کو دیتی

ہے تو ڈانٹ کر، کھانا کھلاتی ہے تو گھور کر۔ ڈالی کی ماں کتنے پیار، کتنی نرمی
اور محبّت سے بات کرتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے اس کے بالوں میں ربن ٹانکتی
ہے اور اسے دروازے تک چھوڑنے آتی ہے اور مسکرا کر ٹاٹا کہتی ہے
ماں نے کبھی ہمارا ہاتھ منہ نہیں دھلایا۔ مجھے یاد ہے وہ کبھی ہمیں رات کو
دیکھنے نہیں آئی، ہم پر رضائیاں نہیں ڈالیں اور ہمیں کہانیاں نہیں سنائیں۔
وہ لوری گا سکتی ہے کہ نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ وہ جھڑک سکتی ہے، گالیاں
دے سکتی ہے، 'مر جا کر' میری جان کیوں کھا رہے ہو، اپنے باپ سے کہو
جا کر، یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس کے باوجود وہ ہماری ماں ہے کہ اس
نے ہمیں جنم دیا ہے۔

اس شام بھی، جب وہ پتاجی کے کمرے سے بڑبڑاتی نکلی تھی اور اس
کی پیشانی پر بل تھے اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے، میں چپکے سے پوجا کے کمرے
میں چلا گیا تھا اور وہاں ایک کونے میں دبکا اس چوہیا کو دیکھ رہا تھا، جو
چوکی کے پیچھے سے نکلی۔ دو گول گول سی آنکھوں سے خوفزدہ سی ادھر اُدھر
دیکھتی اور بتاشوں پر جھپٹتی اور تھوڑا سا کتر کر بھاگ جاتی۔ چیونٹیوں کی
ایک قطار بتاشوں سے دیوار تک چل رہی تھی۔ کبھی کبھی دو چیونٹیاں ایک
دوسری کے سامنے آ جاتیں تو ایک ثانیے کے لیے رکتیں، شاید آپس میں
باتیں کرتی ہوں: ہیلو، کیا حال ہے؟ کدھر چلیں؟ اور پھر اپنی اپنی راہ
پر بڑھ جاتیں۔ مجھے اس کونے میں بڑا سکون ملتا۔ گھر کی بجھی بجھی، سرد، بوجھل
اور موت سی خاموش اور زرد فضا سے وہ کونا کہیں اچھا تھا۔ میں دیوار

سے لگا بیٹھا چھپا اور چیونٹیوں کا تماشا دیکھ رہا تھا کہ ماں آ گئی۔ آتے ہی اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ جب وہ پلٹی تو مجھے دیکھ سکی۔ لپک کر اس نے مجھے بازو سے اٹھا لیا اور گھسیٹتی ہوئی باہر لے آئی۔

"بتاشے چرانے گیا تھا؟"

بہت پہلے کبھی میں نے یہ حرکت کی تھی اور ماں سے چانٹا کھا کر اور یہ سن کر کہ یہ پاپ ہے پھر کبھی ایسا نہیں کیا تھا، لیکن ماں ـــــ وہ ہمیشہ یہی شک کرتی ہے۔ اسے اپنے سوا کسی پر اعتبار نہیں اور وہ بات کہنے سے پیشتر کبھی نہیں سوچتی اور پھر کبھی پشیمان بھی نہیں ہوتی۔ چوری کا الزام لگا کر وہ مجھے گھور رہی تھی، میں سوچ رہا تھا کہ جواب دینا فضول ہے، وہ اعتبار تو کرے گی نہیں۔ میں خاموش رہا۔

"تم سب نرک میں جاؤ گے۔ سب کے سب پاپی ہو۔"

اس پل پتا جی چھڑی سنبھالے کمرے سے نکلے تھے۔ وہ ماں کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے رُکے۔

"جانے سیر کا حرج ہوگا۔" ماں کے لہجے میں زہر تھا۔ کبھی سوچا ہے کہ کوئی گھر بھی ہے۔ بچے چوری کرنا سیکھ رہے ہیں۔"

"میں نے کچھ نہیں چرایا۔" میں نے پتا جی سے کہا۔

"فیصلہ دینے والا بھگوان ہے، ہم نہیں، کہ وہ جانی جان ہے۔"

"اونہہ۔" ماں نے ہونٹ بچکا کر نفرت اور غصے کا اظہار کیا۔ "دیکھ لینا وہ درد شا ہوگی سب کی یاد کرو گے۔ سات جنم دُکھ بھوگو گے۔" اور پھر مجھ

سے "تمہارے پڑھ جاکر- کیوں سب میری جان کے دشمن ہو رہے ہو!"

اس لمحہ میں نے ماں کے لیے سخت نفرت محسوس کی کچھ دیر ماں بڑبڑاتی رہی پھر گھر پر خاموشی طاری ہو گئی - میں کتاب لے کر دیدی کے پاس جا بیٹھا- وہ ٹمننگ کر رہی تھی- میرا جی پڑھائی میں نہیں تھا- میں سوچ رہا تھا کہ پتاجی کہاں گئے ہوں گے، ان کا کوئی دوست نہیں تھا، فلم کا شوق انہیں تھا، کوئی ہابی تھی نہیں پھر وہ آخر کرتے کیا ہیں- رات کو دیر سے لوٹتے ہیں- تب ماں جاکر دروازہ کھولتی ہے اور وہی سالوں پرانا جملہ سنائی دیتا ہے: "ہو گئی سیر ختم-" اور وہ پتاجی کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آجاتی ہے- اس وقت سب سو گئے ہوتے ہیں- میں جاگتا رہتا ہوں- کسی مرتبہ میں نے سوچا ہے کہ جاکر دروازہ کھولوں لیکن ہمت نہیں ہوتی-

اس شام بھی میں کنچے جیبوں میں بھر اس کھولے میں گیا تھا- کنچوں سے زیادہ مجھے پاروتی میں دلچسپی تھی- میں جاننا چاہتا تھا کہ ماں ہر وقت اسے برا کیوں کہتی رہتی ہے اور وہ کیسے جادو کرتی ہے- کھیلتے کھیلتے میرے پاؤں میں کانچ کا ٹکڑا چبھ گیا اور خون بہنے لگا- میں ماں کے ڈر سے رو بھی نہ سکا کہ وہ ایسے موقعوں پر ہاتھ سے بات کرتی تھی- تمام بچے میرے گرد جمع ہو گئے تھے- شاید کسی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ خون کو کیسے روکا جائے- اسی وقت کھڑکی میں پاروتی دکھائی دی-

"کیا ہوا؟" وہ پوچھ رہی تھی-

"بیو کو چوٹ لگی ہے، بہت خون نکلا ہے-"

چند سیکنڈ بعد وہ میرا پاؤں پکڑے بیٹھی تھی۔ پھر وہ مجھے سہارا دے کر اپنے مکان میں لے گئی۔ اس نے روئی سپرٹ میں تر کر کے میرا زخم صاف کیا سپرٹ نے زخم میں مرچیں سی لگا دیں تو وہ جھک کر پھونک مارنے لگی۔

"مرد ہو کر اتنی سی چوٹ سے گھبراتا ہے۔" وہ ہنسی۔ "چل کھڑا ہو جا، کچھ نہیں ہوا، ایسی چوٹیں تو روز لگتی ہیں۔"

یہ لہجہ، یہ ہمدردی، یہ اپنا پن میرے لیے بالکل نیا تھا۔ ماں ہوتی تو چانٹا مار کر پوچھتی: "آنکھیں بند تھیں؟ میرے لیے کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کر دیا کرو۔" اور پھر وہ دیدی سے کہتی: "اری پٹی باندھ دے اس کے" میں حیرت اور شوق سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اب وہ جادو کرے گی اور میں مینا بن جاؤں گا۔ دل کی گہرائیوں میں کہیں خوف رینگ رہا تھا: "اس سانپ کی طرح جو نہ ہوتے ہوئے بھی اندھیرے میں محسوس ہوتا رہتا ہے۔

"کیا دیکھ رہا ہے رے؟" وہ مسکرائی۔

"تم جادو سے مجھے بٹیر بنا دو گی۔" میں نے ایک دم کہہ دیا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "اچھا! کس نے کہا تجھ سے؟"

میں چپ رہا۔ اور ایک دم مجھے ماں سے نفرت کا احساس ہوا اور نہ جانے کیوں میں نے سوچا کہ ماں سے بدلہ لینے کا یہ بہترین موقع ہے میں نے دبے لہجے میں کہا:

"ماں کہتی ہے۔"

پاروتی ایک دم سنجیدہ ہو گئی، پھر ہنسنے لگی۔ میرا خیال تھا وہ ماں سے

نفرت کا اظہار کرے گی، اُسے گالیاں دے گی اور اس طرح میرے جذبۂ انتقام کی تسکین ہو سکے گی۔ لیکن میرے اس جذبے پر اس نے ہنس کر اوس ڈال دی۔ میں نے پوچھا:

"جادو کیسے کرتے ہیں؟"

"جادو کوئی چیز نہیں" وہ زخم پر پٹی باندھتے ہوئے بولی: "آدمی کو جادو سے نہیں محبت اور پیار سے جیتا جاتا ہے، اور جو محبت کر سکتے ہیں بھگوان ان سے خوش ہوتا ہے۔"

"پتاجی بھی یہی کہتے ہیں۔"

پاروتی نے میری طرف دیکھا اور سپرٹ کی شیشی اُٹھا کر الماری میں رکھنے چلی گئی۔ اس وقت باہر ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔ شاید کسی نے ماں کو خبر کر دی تھی۔ میں سہم گیا۔ پاروتی میرے قریب آئی، میرے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار سے بولی:

"تمہاری ماتاجی ہیں؟"

میں نے خوف زدہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس پل تو میں نے سوچا کہ پاروتی مجھے جادو سے ٹھیر بنا ہی دے اور ماں دیکھ کر چلی جائے۔

"جو ڈرتے ہیں وہ ہمیشہ دکھی رہتے ہیں۔ تم نے کوئی پاپ نہیں کیا" وہ بولی "آؤ" اور میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی۔

ماں نے مجھے گھور کر دیکھا اور یوں میرا ہاتھ جھپٹ لیا جیسے میں اڑا جا رہا تھا۔

"اسے کانچ چبھ گیا ہے، میں نے زخم دھو دیا ہے، گھر جاکر ٹنکچر لگا دیجیے گا، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

"پتا ہے۔" ماں نے تلخی سے کہا اور مجھے گھسیٹتی ہوئی گھر لے گئی۔ اُدپر پہنچ کر اس نے مجھے پتاجی کے سامنے کھڑا کر دیا اور غصّے سے بولی:

"دیکھیے اپنے لاڈلے کے کرتوت۔ پوچھو اس سے کہاں گیا تھا۔"

پتاجی نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"میری تو اس گھر میں کوئی سنتا ہی نہیں، جو میں کہتی ہوں وہی نہیں ہوتا۔" پھر وہ جھنجھوڑ کر بولی: "بول، کہاں گیا تھا؟"

"کھیلنے۔"

"کھیلنے کے بچے میں پوچھتی ہوں تو اس کلموہی کے گھر کیا کرنے گیا تھا۔"

"وہ آپ ہی لے گئی تھی۔" میں نے ڈر کے مارے کہہ دیا۔

"دیکھ لیا۔" ماں نے پتاجی کی طرف دیکھا "میں کہے دیتی ہوں اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ لے گئی تھی رانڈ مرہم پٹی کرنے۔ ماں سے سگی پیچھے کٹنی کنجری کوئی جادو ٹونہ کرے گی میرے بچے پر۔ اپنا کوئی آگے پیچھے ہے نہیں، دوسروں کے دیکھ نہیں سکتی۔ میری تو جنم جنم کی بیرن ہے۔ نہ جانے میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے ہے بھگوان، مرتی بھی نہیں، ہٹی کٹی کھبر رہی ہے، اسے آئے کسی کی آئی۔"

پتاجی سر لٹکائے خاموش بیٹھے رہے۔ ان کا ہاتھ کرسی کے بازو پر رکھا کپکپا رہا تھا، ٹانگیں لرز رہی تھیں اور نچلا ہونٹ انھوں نے زور سے دانتوں

تلے دبا لیا تھا۔ ماں کا غصہ ایک دم اور بھی تیز ہو گیا۔ اس نے زور سے میری پیٹھ پر دو دستھڑ جمایا اور لات مار کر بولی:

"اب وہاں گیا تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔ سمجھا!" اور وہ مجھے گھسیٹتی باہر لے گئی۔ "آج تجھے کھانا نہیں ملے گا۔"

اس رات بھی پتاجی دیر سے لوٹے۔ جب ماں تھک کر اپنے بستر پر پڑ رہی تو وہ میرے پاس آئے۔ بھوک کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پتاجی ایک منٹ کھڑے اندھیرے میں مجھے دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے میرے سرہانے ایک پیکٹ رکھ دیا اور چلے گئے۔ میں نے اندھیرے میں ٹٹول کر پیکٹ کھولا۔ اس میں سینڈوچز، پیسٹریاں اور بند تھا۔ میں ایک منٹ تک ہاتھ سے وہ چیزیں محسوس کرتا لیٹا رہا۔ پھر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے محسوس کیا کہ میں پتاجی سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ میں اس شخص کے اندر دیکھ رہا ہوں جو میرے سامنے بھی نہیں۔ میں اندھیرے میں لیٹا لیٹا کھاتا رہا۔ پھر میں سو گیا۔

صبح اس پیکٹ کی وجہ سے ماں اور پتاجی میں لڑائی ہوئی۔ پتاجی نے صرف اتنا کہا کہ وہ بچوں کو بھوکا نہیں دیکھ سکتے۔ ماں اور بھی بھڑک اٹھی اور جو جی میں آیا کہے گئی۔ پتاجی حسب معمول خاموش رہے۔

"تم چاہتے ہو میرے گھر میں کوئی عزت نہ رہے۔ میرے بچوں کو میرے خلاف اکساتے ہو۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟ میں کہتی ہوں تم اس کے خلاف ہو جاتے ہو۔ چلی جاؤں گھر چھوڑ کے؟ پر یاد رکھو اتنی آسانی سے میں بھی نہیں جانے والی۔"

اور پھر وہی رونا دھونا اور ٹھنڈا چولہا اور موت کی سی سرد اور زرد فضا۔ اس روز پتاجی مجھے اپنے ساتھ سیر کرانے لے گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے اپنے ساتھ کسی بچّے کو لیا تھا، ورنہ ہم میں سے کسی کو معلوم ہی نہ تھا کہ باپ کی انگلی پکڑ کر بازاروں میں سے گزرنا اور کھلونوں اور مٹھائیوں کے لیے ضد کرنا کیا ہوتا ہے۔ پتاجی کی انگلی تھامے بازاروں میں سے گزرنا اور لوگوں کو آتے جاتے دیکھنا بڑا اچھا لگا کہ اس میں ایک طرح کی حفاظت اور بڑے پن کا احساس تھا اور ان تمام چیزوں اور مناظر کے معنی بدل گئے تھے جو میں نے سکول سے آتے جاتے اکیلے دیکھے تھے۔ اب ان میں وہ اجنبیت اور اکیلاپن اور کھردراپن نہیں رہا تھا جو دل کو اذیّت پہنچاتا تھا اور قریب کی چیزوں کو بھی بہت دور کرتا تھا اور بھرے شہر میں اکیلا چھوڑ جاتا تھا۔ ہم مندر میں جا بیٹھے۔ میں تالاب میں مچھلیوں کو دیکھ رہا تھا اور پتاجی کی آنکھیں مندر کے کلس پر چمپاتی دھوپ پر تھیں۔ میرا جی مچھلیوں کے ساتھ تیرنے اور پانی میں غوطہ لگانے کو کر رہا تھا۔ لوگ مندر میں آ جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پھول اور پرشاد تھا۔

"تم پاروتی کے ہاں کیوں گئے تھے؟" اچانک انھوں نے پوچھا، ایک مچھلی سطح پر تیرتے پھول کو سونگھ کر پانی میں غوطہ لگا گئی تھی۔

"پتاجی پاروتی بری عورت ہے؟"

"وہ دیکھو پھول۔ کوئی تم سے پوچھے تو تم فوراً کہہ سکتے ہو کہ یہ پھول ہے۔ لیکن یہ تو تم نہیں بتا سکتے کہ پانی کے اندر تالاب کی تہ میں کیا ہے اور

سمندر کی تہہ میں کیا ہے۔ یہ تو تم بالکل نہیں بتا سکو گے کیوں کہ تم نے وہاں جا کر دیکھا نہیں۔ اور جو مس کر سکتے ہیں وہ پوری طرح نہیں سمجھتے اور جو خود تلاش کرتے ہیں اور ڈوب کر پتا کرتے ہیں وہ پوری طرح سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔"

مجھے اس وقت پتاجی کی بات سمجھ نہیں آسکی تھی لیکن اچھی لگی تھی ان کی بھاری، گمبھیر آواز دل تک پہنچ رہی تھی اور اس دھوپ کی طرح اچھی لگ رہی تھی جو سردیوں میں سرسوں کے کھیتوں پر چمکتی ہے اور بدن کو میٹھی میٹھی گرمی دیتی ہے۔ پتاجی وہاں مندر میں بیٹھے اس شیشے کی طرح لگ رہے تھے جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے اور اس شخص سے بالکل مختلف تھے جو آرام کرسی میں نیم دراز حقہ پیتا تھا اور کوئی تعلق کسی سے نہیں رکھتا تھا۔ پتاجی نے کہا کہ میں مندر میں جانا چاہوں تو جا سکتا ہوں۔ میں اندر جہاں مورتیاں تھیں، چلا گیا۔ بڑی بڑی، سونے چاندی اور پھولوں سے ڈھکی مورتیوں اور چاندی کی چھت والے کمرے اور سونے کی طرح چمکتے ستونوں کو دیکھ کر بڑا اچھا لگا اور میں نے ہاتھ جوڑ کر آنکھیں موند لیں اور پرارتھنا کی کہ ماں پتاجی سے لڑنا اور پاروتی کو برا بھلا کہنا چھوڑ دے۔ (جو منظور نہیں ہوئی۔) دعا مانگ کر میں باہر آگیا۔ پتاجی تالاب میں مچھلیوں کو آٹا ڈال رہے تھے جو بڑی تعداد میں سطح پر آگئی تھیں۔

"چلیں؟" انھوں نے پوچھا۔

ہم مندر کی حدود سے نکل آئے۔ کچھ بچوں کو کھلونے اور مٹھائی لیتے دیکھ کر انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے کچھ لینا پسند کروں گا۔ میں نے

انکار کر دیا۔ پھر میں نے انھیں اپنی پرارتھنا کے بارے میں بتایا تو وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولے:

"ہاں، ماں کے لیے دعا کیا کرو۔"

"پتاجی، ماں آپ سے لڑتی کیوں ہے؟"

"اُس کا اس میں کوئی قصور نہیں۔"

"پھر کس کا قصور ہے؟"

"شاید اس میں کسی کا بھی نہیں۔"

"پتاجی، میری کتاب میں لکھا ہے کہ کسی کو بُرا مت کہو، کسی کا دل مت دکھاؤ اور کسی سے لڑو نہیں، سب سے محبت کرو۔"

"ہاں، کتابوں میں یہی لکھا ہے!"

پھر انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔ ہم گھر کی طرف لوٹ رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ پتاجی کے چہرے پر وہی غم اور اداسی کی سیاہ پرچھائیاں تیر رہی ہیں اور وہی پتھریلا پن سارے جسم پر چھا گیا ہے اور وہ ایک دم اجنبی، غیر اور دور ہو گئے ہیں۔

پاروتی کئی دن کھڑکی میں دکھائی نہیں دی۔ مشین کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ پھر ایک شام گوگی سے معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے اور اپنے کمرے میں اکیلی پڑی رہتی ہے۔ میرے دل میں اسے دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی، لیکن ماں کا ڈر تھا۔ وہ ٹانگیں توڑ دے گی۔ میں نے ایک شام پتاجی کے ساتھ سیر کرتے ہوئے کہا:

"پتاجی، پاروتی کو بخار آرہا ہے۔"

وہ دور افق پر پھیلی درختوں کی سیاہ قوس کو دیکھ رہے تھے۔ میری بات سن کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے ان کی انگلیوں میں لرزہ محسوس کیا اور ان کے چہرے پر جیسے کچھ پگھل رہا تھا۔ وہ پھر درختوں کی اس قوس کو دیکھنے لگے۔ میں نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ واپسی پر ہم مندر گئے۔ پتاجی نے باہر سے آٹا لیا اور مچھلیوں کو گولیاں بنا بنا کر ڈالنے لگے اور میں اندر چلا گیا جب میں باہر آیا تو پتاجی مندر کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ آگے بڑھ آئے اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ کہا نہیں۔

"میں نے بھگوان سے کہا ہے کہ وہ پاروتی کو جلدی سے اچھا کر دے۔"

پتاجی خاموش رہے، صرف ان کے ہاتھوں کا دباؤ میرے شانے پر قدرے بڑھ گیا اور وہ جیسے پگھل پگھل کر میرے وجود میں سرایت کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا:

"پتاجی، آپ مندر میں کیوں نہیں جاتے؟"

"بڑا ہو کر آدمی سچا نہیں رہتا۔ اسے ڈر لگنے لگتا ہے۔"

"بھگوان سے؟"

"نہیں، اپنی کمزوریوں اور گناہوں سے کہ وہ جو دکھائی نہیں دیتا سب کچھ دیکھتا ہے۔"

"پاپ کیا ہوتا ہے پتاجی؟ ماں کہتی ہے بتاشے اٹھا کر کھانے سے پاپ لگتا ہے اور نرک میں جانا ہے۔"

"پاپ وہ ہے جو تم ٹھیک سمجھتے ہوئے بھی نہ کرو۔ اور جن میں صحیح قدم اٹھانے کا حوصلہ نہیں ہوتا وہ پاپی ہوتے ہیں اور اس دنیا میں نرک بھوگتے ہیں اور دکھی رہتے ہیں۔

دوسرے دن شام کو میں پاروتی کے ہاں چلا گیا۔ ماں کی ناراضگی کا ڈر ایک لمحے کے لیے سانپ کی طرح پھنکارا تھا لیکن میں نے اس کا سر کچل دیا۔ پاروتی کے کمرے میں زرد اور مدھم روشنی والی لالٹین جل رہی تھی جس سے کمرے کی اداسی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ پاروتی دیوار کے ساتھ چارپائی پر کمبل لپیٹے پڑی تھی۔ اس کا چہرہ زرد، ہونٹ خشک اور بال بکھرے سے تھے۔ سوکھی گھاس کی طرح اُلجھے ہوئے۔ وہ بہت کمزور نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر پکارا:

"پپو!"

میں اس کے قریب چلا گیا اور بستر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ پاروتی نے کمبل سے ہاتھ نکال کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے اپنے بستر پر بٹھا لیا۔ اس لمحے مجھے ایسا لگا کہ میں پاروتی کے وجود کا ایک حصّہ ہوں اور وہ بے چینی، وہ بھٹکن جو میرے دل، میری روح میں تھی اس کے چھو دینے سے ایک دم دور ہو گئی ہے اور اندر اور باہر ایک خوشگوار سکون اور توازن ہو گیا ہے۔

"کل میں نے مندر میں پرارتھنا کی تھی کہ تم جلدی سے اچھی ہو جاؤ۔"

"کیوں؟"

مجھے خود نہیں معلوم کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے۔ میں خاموش بیٹھا رہا

اور اس کی نرم انگلیوں کا لمس اپنے ہاتھ پر محسوس کرتا رہا۔ اس نے شایدپنی
آنکھیں پونچھی تھیں۔ پھر وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی تھی:

"تمھارے ماتاجی کو معلوم ہو گیا تو؟"

"نہیں معلوم ہو گا، پتاجی ماں سے کبھی نہیں کہیں گے۔ ماں اُن سے لڑتی
ہے۔ پہلے پتاجی کسی کو ساتھ نہیں لے جاتے تھے اب صرف مجھے ساتھ لے
جاتے ہیں اور بڑی اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ پہلے مجھے ان سے ڈر لگتا تھا،
اب نہیں لگتا۔ وہ باہر جا کر باتیں کرتے ہیں، گھر میں بالکل نہیں بولتے۔"

"کیا باتیں کرتے ہیں؟"

مجھے پوری طرح ان کی باتیں کبھی سمجھ نہیں آتی تھیں اور جو سمجھ آیا
تھا شاید اسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اس لیے
میں پھر چپ ہو گیا۔ چند سیکنڈ کمرے میں خاموشی رہی پھر میں نے کہا:

"ماں کہتی ہے تم بہت بری ہو اور ہماری دشمن بھی۔"

وہ چھت کو دیکھتی ہوئی ہنس دی۔ پھر بولی:

"پھر یہاں تم کیوں آئے ہو؟"

"مجھے تم اچھی لگتی ہو۔"

پاروتی نے مجھے سینے سے لگا لیا کئی منٹ اس طرح گزر گئے پھر اس
نے وہی بات کہی جو پتاجی نے کہی تھی اور میں حیران ہوا تھا کہ دونوں نے ایک
ہی طرح کیسے سوچا تھا۔

"تم نے میرے لیے پرارتھنا کی ہے نا! ماں کے لیے بھی کرنا۔"

پھر وہ میرے سکول اور پڑھائی کے بارے میں پوچھنے لگی اور یہ کہ میں پڑھ کر کیا بنوں گا اور کیسے رہوں گا۔ اتنی دلچسپی سے نہ ماں نے کبھی پوچھا تھا اور نہ پتاجی نے اور نہ مجھے ہی معلوم تھا کہ مستقبل میں مجھے کیا کرنا ہے۔
اس روز پاروتی کی دوا لینے میں گیا۔ واپسی پر ماں نے دیکھ لیا۔ اس نے پوچھا بھی دوا کس کی ہے، لیکن میں جواب دئے بغیر بھاگ آیا اور دوا پاروتی کو دے کر گھر چلا گیا۔ ماں اس وقت پتاجی کے سامنے کمر پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور تھانیداروں کی طرح بول رہی تھی۔ اس نے ایک آدھ مرتبہ پاروتی کا اور میرا نام بھی لیا تھا۔ اس سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ میرا ہی ذکر کر رہی ہے۔ میں چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تھا کہ ماں نے دیکھ لیا اور لپک کر مجھے گردن سے دبوچ لیا۔
"جا کہاں رہا ہے، ادھر آ" وہ مجھے گھسیٹ کر پتاجی کے سامنے لے آئی۔
"جا اسے جان سے مار دے، مجھ سے کیا کہتی ہے۔ میں کیا کروں؟" پتاجی نے نہایت لاتعلقی اور بے رازداری سے کہا:
"جان سے تو تم مجھے مارو گے" ماں پھنکاری "اسے اور سر چڑھاؤ اور ساتھ لیے لیے پھرو۔ خوب میرے خلاف سکھاؤ۔ تمھیں چین ہی اس دن آئے گا۔ جب میری ارتھی اُٹھے گی۔ اِتنے اتنے بچّوں سے میری بے عزّتی کراتے ہو"
ماں آنکھوں پر پلّہ رکھ کر رونے لگی۔ دیدی اور بھیّا بھی آ گئے اور دروازے میں کھڑے ہو کر اندر دیکھنے لگے۔
"کیوں گیا تھا وہاں؟" پتاجی نے کڑک کر پوچھا۔ میں سہم گیا۔ پہلی مرتبہ وہ

اس طرح کڑکے تھے ان کے نتھنے پھول رہے تھے اور ہونٹ کپکپا رہے تھے اور چہرہ دھک رہا تھا۔ انھوں نے پورے زور کا تھپڑ میری گال پر جڑ دیا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ "کون لگتی ہے وہ تیری؟ کیوں گیا تھا وہاں؟" پتاجی نے حقّے کی نَے نکال لی تھی اور دھڑا دھڑ مجھ پر برسانے لگے تھے اور بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہے تھے: "کون لگتی ہے وہ تیری؟" وہ مجھے اس وقت تک مارتے رہے جب تک کہ نَے ٹوٹ نہیں گئی۔ ماں نے رونا بند کر دیا تھا اور دہشت زدہ سی بیٹھی مجھے تکے جا رہی تھی۔ پتاجی نے پھینک کر تھکے ٹوٹے سے کرسی پر گر پڑے تھے۔ ان کے ہاتھ پاؤں میں لرزہ تھا۔ نہ کیوں مجھے ان پر بے اختیار پیار آ گیا اور ماں پر شدید غصّہ۔

"کتنی بے دردی سے مارا ہے بچّے کو۔" ماں دیوار سے لگی کھڑی کہہ رہی تھی۔ اس رانڈ سے پوچھو جا کر جو میرے پیچھے پڑی ہے۔ اس کے تن بدن میں کیڑے پڑیں۔ سات جنم اندھی ہو۔"

"بکواس بند کرو۔" پتاجی چیخے۔

پہلی مرتبہ میں نے انھیں گھر میں اس طرح بولتے سنا تھا۔ ایک دم ماں خاموش ہو گئی تھی اور گھر پر سناٹا چھا گیا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی تھی کہ وہ اس طرح گرجے تھے۔ میں بہ مشکل تمام خود کو سنبھالتا ہوا بستر پر جا کر ڈھیر ہو گیا تھا۔ پتاجی کوٹ پہن کر جب چلے گئے تو ماں دیر تک پاروتی کو کوستی رہی۔ میں بستر پر پڑا رہا۔ میرا تمام بدن دُکھ رہا تھا اور جل رہا تھا اور میں چاہ کر بھی نہیں رو پا رہا تھا، جیسے آنسو خشک ہو گئے ہوں۔

اس رات تایاجی بہت دیر سے لوٹے۔ دیر تک ان کے قدموں کی آواز کمرے میں سنائی دیتی رہی، جیسے وہ جلدی جلدی چکر لگا رہے ہوں گھر پر سناٹا چھایا تھا۔ ماں اس وقت مہابنی میں جا سوئی تھی۔ میں جاگ رہا تھا۔ پھر وہ بھاری قدم مجھے اپنی طرف آتے محسوس ہوئے میں دم سادھے پڑا رہا۔ میں نے بند آنکھوں سے بھی دیکھ لیا کہ تایاجی مجھ پر جھکے کھڑے ہیں اور غور سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ پھر وہ بستر پر بیٹھ گئے اور دھیرے دھیرے میرے بدن پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ مجھے لگا کہ وہ جلن، وہ درد ان کی انگلیوں نے باہر کھینچ لیا ہے اور میں بھلا چنگا اور پھول کی طرح ہلکا ہو گیا ہوں۔ وہ آنسو جو خشک ہو گئے تھے آپ سے آپ میری آنکھوں میں آ گئے اور گالوں پر سے گردن پر بہنے لگے۔ میں آنکھیں نہیں کھول سکا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ تایاجی کا چہرہ اترا ہوا اور اداس ہے اور میں اسے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکوں گا۔ پھر وہ اٹھ کر اندر چلے گئے اور اس رات بھوک کے باوجود مجھے نیند آ گئی۔

کئی دن میں سکول نہیں گیا، کھیلنے بھی نہیں گیا۔ ان دنوں ماں تایاجی سے لڑی بھی نہیں لیکن فضا زیادہ بوجھل اور سردسی رہی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ پاروتی کیسی ہے۔ کسی سے پوچھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ تایاجی ان دنوں اور بھی دور ہو گئے تھے۔ وہ سر لٹکائے خاموش بیٹھے حقہ پیتے رہتے یا پڑھتے رہتے تھے۔ وہ دور سے مجھے دیکھ کر چلے جاتے۔ پھر جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو وہ مجھے اپنے ساتھ سیر کرنے لے گئے

اور میں بھول گیا کہ انھوں نے مجھے مارا تھا۔ نہر کی پٹری پر خشک، بھورے پتوں پر چلتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: "بیرونی مار سے اندر کی مار زیادہ خطرناک ہوتی ہے، وہ مار جو ضمیر مارتا ہے۔ یہ مار تم نے برداشت کر لی۔ ضمیر کے خلاف کچھ نہ کرنا کہ اس کی مار برداشت نہیں کر سکو گے!"

سکول کے سال ختم ہوتے گئے، اور میں پارو تی سے بے دھڑک ملنے لگا۔ اس کے بالوں میں سفید تار نظر آنے لگے تھے۔ وہ اب بھی بال کھلے رکھتی تھی۔ میں نے اس سے ایک آدھ مرتبہ پوچھا بھی کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے، لیکن اس نے کبھی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ ہنس کر کہتی:

"پپو، تو یہ سب کچھ کیوں پوچھتا ہے؟"

"مجھے اب پپو مت کہا کرو۔"

"کیوں رے؟ تو کیا بدل گیا ہے؟"

"ہاں، اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔"

"ہو گیا ہو گا اپنے لیے، میرے لیے تو وہی پپو ہے جو کانچ چبھ جانے سے رو دیا تھا۔"

اور ہماری باتیں اس طرح بھٹک جاتیں اور میرا وہ سوال ہی رہ جاتا۔ ماں اب زیادہ دخل نہیں دیتی تھی۔ دیدی کی شادی ہو گئی تھی اور بھیا ہوسٹل میں چلا گیا تھا۔ ماں جیسے تھک گئی تھی۔ لیکن پتاجی کے معمول میں فرق نہیں آیا تھا۔ وہی طویل سیر اور گھر میں آرام کرسی پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتا۔ میں کالج پہنچ گیا تھا۔ اب پتاجی کی باتیں کچھ کچھ سمجھ آنے لگیں تھیں تو انھوں

نے بات کرنا کم کر دیا تھا۔ میری زندگی بھی گھر کی چار دیواری سے باہر پھیلی وسیع دنیا میں غوطے لگا رہی تھی اور سب کچھ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہر چیز، ہر شے کے معنی بدل رہے تھے، روپ بدل رہے تھے۔ باہر سے تو وہی روپ تھا لیکن اندر سے کچھ اور نظر آنے لگا تھا۔ اور تبھی مجھے کالج کی فضاؤں میں مالا ملی تھی اور ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے اور نہ جانے کیسے پاروتی نے میرے بتائے بغیر یہ جان لیا تھا کہ میرے سینوں میں ایک لڑکی آ بسی ہے۔

"بتاتا کیوں نہیں رے۔ کون ہے وہ؟"

"کوئی نہیں۔" میں شرما جاتا۔

"لڑکیوں کی طرح شرماتا ہے۔ مجھ سے بھی چھپائے گا۔"

"میرے ساتھ پڑھتی ہے۔" اور میں نے اس رات لالٹین کی روشنی میں ساری رات کتھا اسے سنا دی تھی۔ وہ نہایت انہماک اور دلچسپی سے سنتی رہی تھی اور پھر چپ رہ گئی تھی۔ میں نے پوچھا تھا:

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"ہیں!" وہ چونکی پھر بولی، کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ کیسی لگتی ہے؟ مجھ سے ملوائے گا نہیں؟ بلا لا کسی دن!"

پھر ہم تینوں ایک باغ میں ملے۔ پاروتی بڑی ہچکچاہٹ کے بعد باغ میں چلنے کو راضی ہوئی تھی۔ صرف میرے لیے۔ پاروتی مالا سے اس طرح ملی جیسے اسے برسوں سے جانتی ہو۔ وہ خوب گھل مل کر باتیں کرتی رہیں۔ کچھ دیر کے لیے تو میں خود کو بالکل اکیلا محسوس کرنے لگا۔ میں چاہتا تھا مالا مجھ سے

باتیں کرے، میری طرف متوجہ ہو لیکن وہ پاروتی میں ہی ڈوب گئی تھی۔ بعد میں مالا نے مجھے بتایا کہ اسے پاروتی بہت اچھی لگی تھی۔

اچانک میرے اور مالا کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو گئی اور میں پریشان رہنے لگا۔ یہ پریشانی پاروتی سے چھپی نہیں رہ سکی۔ ایک دن وہ بولی:

"تو نے مالا سے شادی کی بات کی؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"وہ براہمن ہیں اور ہم کھتری۔ میرے ماں باپ ..."

پاروتی کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ وہاں عجیب سا پتھریلا پن آگیا اور وہ خالی خالی سا لگنے لگا۔ پھر بولی:

"جب تم پہلی بار اس سے ملے تھے تو کیا تمھیں معلوم نہیں تھا کہ وہ براہمن ہے اور تم کھتری؟"

"معلوم تھا۔"

"اور تم نے یہ بھی سوچا تھا کہ تمھارے ماں باپ اس شادی پر رضامند نہیں ہوں گے اور..."

"نہیں۔" میں نے جرم کے سے احساس سے کہا۔

"پھر تم اسے ملتے کیوں رہے؟"

میں نے سر لٹکا لیا۔

"بولو، تم اس سے کیوں ملتے رہے؟" پاروتی کے لہجے میں سختی اور غصہ تھا

تم اسے دھوکا دیتے رہے۔ تم کیا سمجھتے تھے کہ عورت ہے، چھوڑ دو گے تو رو دھو کر خاموش ہو جائے گی۔ شرم آنی چاہیے! یہی سیکھا ہے؟ جب تم میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی تو اس بے چاری سے یہ کھیل کیوں کھیلا؟ اسے یہ جیون بھر کی آس کیوں بندھائی؟ تم عورت کے دل کو نہیں جانتے۔ تم اس کے چہرے، اس کے ہاتھ پیر، اس کے سر پیر کو عورت سمجھتے ہو۔ تمھیں نہیں معلوم عورت کی زندگی میں محبت کے کیا معنی ہوتے ہیں!"

"لیکن اس کے ماں باپ۔"

"تم نے اس سے بات کی ہے۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا، مجھ سے جھوٹ مت کہنا، میں سب جانتی ہوں۔ میں اس کے ماں باپ سے بات کر سکتی ہوں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ اجازت دے دیں گے۔"

"لیکن....."

"اپنی کمزوری کو اس کی کمزوری نہ کہو۔" پاروتی جھنجھلا کر بولی۔ "لڑکیاں کسی حد تک ڈرپوک ضرور ہوتی ہیں لیکن جب انھیں کسی کے اٹوٹ پریم کا سہارا مل جائے تو وہ پہاڑ سے بھی ٹکرا سکتی ہیں۔ جب تم نے مالا سے محبّت کی ہے تو اس سے شادی کرنے میں کیا حرج ہے۔ ذات پات کا شریر اور آتما سے کیا سمبندھ۔ تم نہیں جانتے عورت شادی کے بناء — " وہ ایک دم خاموش ہو گئی، پھر بولی: "تم اپنے پتاجی سے بات کرو، وہ اجازت دے دیں گے۔"

یہ بات پاروتی نے اتنے وثوق سے کہی تھی جیسے وہ پتاجی سے بات کر چکی ہو۔ اس کے بعد میں کئی دن پاروتی سے نہیں ملا۔ جان بوجھ کر نہیں گیا۔

میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا اور پاربتی مالا سے مل چکی تھی۔ اس کے سر پہ نہ جانے کیوں یہ سوار تھا کہ میں مالا سے شادی کروں۔

کچھ دن بعد اس سے ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے۔ وہ بستر پہ پڑی تھی۔ پہلا سوال جو اس نے مجھ سے کیا وہ مالا کے بارے میں تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں پتاجی سے بات نہیں کر سکا۔ وہ بہت جھنجھلائی اور پھر جب تک میں بیٹھا رہا اکھڑی اکھڑی سی باتیں کرتا رہا۔

جس دن اس کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور اسے ہسپتال لے گئے پتاجی بڑے پریشان سے اپنے کمرے میں تیز تیز سے چکر لگاتے رہے۔ وہ چھڑی لے کر ایک مرتبہ سیڑھیوں تک گئے، پھر لوٹ کر کرسی پر جا بیٹھے اور حقہ پیتے رہے۔

دوسرے دن پاربتی نے پران تیاگ دیئے۔ اس وقت میں اور مالا اس کے پاس تھے۔ پاربتی کے سینے میں سخت درد تھا اس کے باوجود وہ ہمیں دیکھ کر مسکرائی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تو ڈاکٹر نے اسے منع کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ مر گئی۔ اس کی (DEATH REPORT) میں ڈبل نمونیہ لکھا تھا۔

پاربتی کے پھول میں نے پرواہ کیے اور اب اس کی یاد آتی ہے۔ گھاٹ سنسان ہے اور وہ ذرا فاصلے پر جلتی ہوئی زرد روشنی بالکل اکیلی اکیلی سی لگ رہی ہے۔ لیکن وہ سلاخوں والی کھڑکی اب بند ہو گئی۔ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ شاید چوکیدار ہے۔ اب مجھے چلنا چاہیے۔

چوکیدار نہیں، پتاجی ہیں۔ وہ منہ منہ بہتے پانی اور اس پہ جھلملاتی روشنیوں

کو دیکھ رہے ہیں۔ اور میں ان کے دل کی گہرائیوں میں دیکھ رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے سامنے ایک ایسا ساز ہے جس کا تار ٹوٹ گیا ہے۔

⊙

س۔ و بیرا:

علی عبّاس حسینی

میٹھا کڑوا جھوٹ

مجید جب ٹرین سے اترا تو اس وقت صبح کے سات بج چکے تھے، لیکن سورج روپوش تھا، اس نے اپنے درخشاں چہرے پر گہرے کہرے کی نقاب ڈال رکھی تھی۔ یخ پڑ رہی تھی۔ برف میں جھلی ہوئی ہوا چل رہی تھی۔ چہار باغ جیسے بڑے اسٹیشن پر، جہاں ہر ٹرین کی آمد و روانگی کے وقت ایک میلہ سا لگ جاتا ہے، مجید نے ایک عجیب طرح کا سناٹا پایا۔ اسٹیشن کیا تھا، جیسے لڑکی کی رخصتی کے بعد برات اتارنے والا گھر۔ بس پانچ سات قلی دکھائی دیئے۔ وہ بھی منہ لپیٹے ہوئے، پالا مارے پودوں کی طرح سکڑے سکڑائے۔ مجید کی اس سفر پر روانگی کے وقت بھی موسم کی یہ کیفیت لکھنؤ پر طاری تھی۔ بجز یہ اس وقت عام طور پر ٹھنڈک کا یہ اثر نہ تھا۔ غالباً اس لیے کہ شروع شروع کا معاملہ تھا، لوگوں میں قوّت برداشت زیادہ تھی۔ اب تو شاید ہر ایک کا خون جمنے لگا تھا۔

رات کو ٹرین پر مجید نے اس سردی کو بری طرح محسوس کیا تھا۔ اس لیے برتھ پر اپنا خاصا موٹا روئی دار گدّا بچھایا تھا، دو دو کمبل اوڑھے تھے، پھر ان پر اپنا اوور کوٹ بھی ڈال لیا تھا۔ سوتے وقت نہ اونی قمیص اتاری تھی اور

نہ اپنا سوئٹر۔ پھر بھی ٹھنڈک کی وجہ سے وہ گٹھڑی ہی بنا رہا ۔۔۔ اس کا بار بار جی چاہ رہا تھا کہ وہ حمیدہ کی چہیتی چادر اٹیچی سے نکال کر جسم میں لپیٹ لے، مگر اس نے سردی کھائی، آرام کی نیند نہ سویا، مگر اس نے حمیدہ کی شال نہ نکالی، ڈر تھا کہ اوڑھنے لپیٹنے میں کہیں رل دل نہ جائے۔

بہت ہی عزیز تھی یہ چادر حمیدہ کو۔ اسی اپریل کے مشاعرے میں مجید سری نگر بلایا گیا تھا۔ وہیں سے یہ شال، شہر کی ساری دوکانیں چھان کر وہ حمیدہ کے لیے لایا تھا ۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی کی سب سے بڑی تمنا ہے کہ اس کے پاس ایک ایسی شال ہو جو ہم چشموں میں کسی کے پاس نہ نکلے۔ جو ہُنٹرہ پائندہ۔ مجید کو ایک ایسی ہی چادر دستیاب بھی ہو گئی تھی چوڑے حاشیوں پر اتنا عمدہ، نازک اور باریک کام کہ صنّاع کا ہاتھ چوم لینے کو جی چاہے۔ بیچ والے حصہ پر کشمیر کے سارے پھول کھلے ہوئے۔ گلاب و لالہ، بنفشہ، نرگس، سیوتی اور جوہی، کنول اور کوزہ ۔۔۔ اوڑھنے والی کی پشت و شانہ پر گویا بہار آئی ہوئی چمن کا منظر دکھائیں گے۔

کشمیر سے واپسی میں پٹھان کوٹ سے لکھنؤ تک سلیپنگ برتھ پر لیٹے لیٹے مجید نے نہ جانے کتنے ہی حسین خواب جاگتے ہی میں دیکھے تھے۔ کتنی خوش ہو گی حمیدہ! اس کے کتابی گالوں میں کس طرح خون چھلک آئے گا۔ شانوں پر چادر پڑتے ہی وہ کیونکر شاخِ گل کی طرح لچکے گی، اس کے گلاب کی پنکھڑی جیسے لب کس طرح پھڑکیں گے، اُس کے آب دار دُرِ دنداں کیسے جھلکیں گے وہ کس طرح اٹھلا اٹھلا کر چلے گی۔ اس کی کمر اور کولھوں میں کیسے کیسے ڈل بابل

پڑیں گے اور وہ اس نادر تحفہ پر شوہر کا آنکھوں ہی آنکھوں میں کس پیار سے انداز سے شکریہ ادا کرے گی اور شکریہ ادا کرتے کرتے کچھ سوچ کر خود بخود شرما بھی جائے گی۔

اور جب وہ لکھنؤ پہنچا تھا اور اُس نے گھر میں داخل ہوتے ہی سوٹ کیس سے نکال کر وہ چادر حمیدہ کے کندھوں پر ڈال دی تھی، تو اس کے یہ سارے خواب سچ نکلے تھے ——— وہ بوکھلائی بھی تھی، وہ مسکرائی بھی تھی، وہ کھلکھلائی بھی تھی، وہ چہک بھی اُٹھی تھی اور اُس نے مجید کو پیار اور محبت کے انعامات سے مالا مال بھی کر دیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس چادر نے حمیدہ کی نظر میں ایک نو یہ نو صنم کی حیثیت بھی اختیار کر لی تھی۔ اس نے اُسے سینت کر شیشے کی الماری میں رکھا اور اس میں ایک مضبوط قفل ڈال دیا ——— یہ الماری کنجوس کے دل کی طرح ہمیشہ بند رہتی۔ صرف اس کے شیشے دن میں دو دفعہ باہر سے جھاڑ دیے جاتے تھے۔ یہ خاص اوقات تھے گویا اس کی زیارت کے لیے ——— وہ مغل بادشاہوں کی طرح جھروکے میں بیٹھ کر "درشن" دیتی۔ اور حمیدہ رعایا پرجا کی طرح پرنام کر لینا ہی اپنا سہاگ سمجھتی۔ ہمسائیاں، اعزّہ، عورتیں وہی جن کی ایسی نادر چیز کی محرومی ملکیت میں حمیدہ کی ساری عظمت اور شان تھی، انھیں بھی اس کی یونہی شیشے میں بند جھلک دکھائی جاتی ——— کیا مجال کہ کوئی اسے ہاتھ لگا سکے ——— کبھی کبھی مجید نے ٹوک بھی دیا تھا کہ شال چادر اوڑھنے کی چیز ہے، پرستش کی نہیں، اوڑھنی نہیں ہو تو ہر مہینے میں ایک آدھ بار اسے دھوپ ہی دکھا

دو ـــ اُونی کپڑا ہے کہیں کیڑے نہ لگ جائیں۔"

حمیدہ چڑ کر کہتی "ارے کیسے بدشگونی کے الفاظ اپنے مُنہ سے نکال رہے ہو! میں روز اسے دیکھتی بھالتی رہتی ہوں۔ نگوڑے کیڑوں کی کیا مجال جو میری شال کے آس پاس بھی پھٹک سکیں! ـــ"

مجید کہتا "اچھا تو یہی کرو کہ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے اُسے باہر نکال کر اپنے پہلو میں رکھ لیا کرو۔ معلوم ہو گا بہار سے لہلہاتے باغ میں بیٹھی ہو۔"

وہ کہتی "آپ دیکھتے نہیں، کیسی موئی آندھیاں چل رہی ہیں۔ گرد جلوں کے بچیلوں میں گھس کر اسے میلا کر دے گی۔ بس اب اسے تو میں اسی دن نکالوں گی جس دن جاڑوں میں اسے اوڑھ کر اپنے منّو کی برات لے کر چاندسی بہو گھر لانے جاؤں گی!" اور وہ تین برس کے کھلونوں سے کھیلتے ہوئے منّو کو گود میں اُٹھا کر اتنا چومتی اتنا چومتی کہ وہ لبسورنے لگتا اور مجید کا جی چاہنے لگتا کہ وہ دونوں غنچہ دہنوں کی آغوش میں سمیٹ کر ایک ساتھ کلیجے میں بھر لے۔

حمیدہ کی اس چادر پر فریفتگی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ مجید اس سے کچھ کچھ جلنے سا لگا تھا۔ اس کو یہ شبہ سا ہونے لگا تھا کہ حمیدہ کی محبّت میں بیٹا ہی نہیں شریک بن گیا ہے بلکہ یہ شال بھی اس میں حصّہ لگانے لگی ہے۔ وہ شال کیا لایا، اس نے اپنے لیے ایک رقیب اپنے ہاتھوں بہم پہنچایا۔ غرض شال کی پوجا جاری رہی، گرمیاں بھی گزریں، برسات بھی گئی رہی، جاڑے کا موسم بھی آیا، مگر شال نے اپنی جگہ نہ چھوڑی۔

لیکن مجید کے تعجب کی انتہا نہ رہی دو دن پہلے ـــ اس روز جب وہ

اس کڑاکے کی سردی میں اپنے مختصر سفر پر روانہ ہونے لگا اور ہولڈال میں بستر رکھا جانے لگا تو حمیدہ کو یاد آیا کہ اب تک مجید کا بیا لحاف تیار نہ ہو سکا تھا منّو اپنے پالنے میں سلایا جاتا تھا اور حمید شریک زندگی ہی کے لحاف میں شرکت کر کے رُوئی اور دوئی دونوں نعمتوں سے فیضیاب رہتا تھا۔ مگر اس سرد سفر کے لیے نہ روئی تھی نہ دوئی ــــ حمیدہ تھوڑی دیر کھڑی گھبرائی گھبرائی اس مشکل کا حل سوچتی رہی، پھر جھپٹ کر الماری میں سے اپنی چہیتی شال چادر نکال لائی۔ ــــ مجید نے روکا۔ "دو دو کمبل کافی ہیں، میں تمھاری چادر نہ لے جاؤں گا" سفر میں رُل دَل جائے گی!"

مگر حمیدہ نہ مانی، چادر اٹیچی میں رکھ کر بولی "رُل دَل جائے موئی! اب تمھاری جان سے زیادہ تھوڑے پیاری ہے!"

مجید نے چھیڑنے کے لیے کہا "اور اگر راستے میں کسی نے ہتھیا لیا تو؟"

وہ بڑے گھمنڈ سے بولی "ارے تم سلامت رہو، ایسی بیسیوں آ جائیں گی!"

مجید کو بیوی کی اس انتہا محبت کا اندازہ نہ تھا۔ حمیدہ اپنی محبوب ترین چیز میاں پر سے نچھاور کرنے کو تیار تھی۔ اس میں کسی طرح کے جذبہ ایثار و قربانی کی جھلک نہ تھی۔ بلکہ بالکل پُر خلوص محبت کا اظہار تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کی نظر میں شوہر کے آرام کے مقابلے میں کسی چیز کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔ مجید کو اپنے دل میں ایک شرمندگی سی محسوس ہوئی تھی۔ اسی خجالت کی وجہ سے اُس نے یہ طے کر لیا تھا کہ چاہے مجھ پر جو کچھ گزر جائے حمیدہ کو یہ چادر نہ

اوڑھوں گا اور اسے بعینہٖ ایسی ہی نئی واپس لاکر دوں گا۔ اس لیے رات میں جب وہ گٹھڑی بنا پڑا تھا اس نے چادر اٹیچی سے نہ نکالی ——

اس وقت جب گاڑی اسٹیشن کے قریب پہنچی تھی اور اس نے جلدی جلدی ہولڈال باندھا تھا اور گرم شوٹ پر موٹا اوورکوٹ پہنا اور گلے میں اُونی مفلر لپیٹا تھا تو اس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ گھر پر پہنچتے ہی بیوی کو اس کی شال چادر اوڑھا دوں گا اس لیے ہاتھوں کو دستانے سے چھپانے سے پہلے اُس نے اٹیچی سے چادر نکال لی تھی اور گاڑی سے اُسے اچھی طرح سنبھالتے اُترا تھا جیسے وہ سچ مچ نذر دی جانے والی پھولوں کی چادر ہو۔ رکشے پر بھی بیٹھا تو اس کی تہیں کھول کر اسے ٹانگوں پر ڈالا نہیں بلکہ اسے گود میں اس طرح رکھا کہ کہیں سے شکن، دھبّہ یا گرد نہ پڑے۔

رکشے والا جوان تھا۔ بھرے بھرے شانے، چوڑا سینہ مضبوط کمر، موٹی موٹی پنڈلیاں، موٹی موٹی انگلیوں والے بڑے بڑے پاؤں؛ اُس نے سر اور گردن میں ایک سوتی مفلر پگڑی کی طرح لپیٹ رکھا تھا —— وہ آدھی آستین کی خاکی قمیص پر ایک پرانا سینڈ وکٹ سوتی سوئٹر پہنے تھا اور ٹانگوں میں ایک میلا خاکی نیکر۔ پنڈلیاں بھی کھلی تھیں اور پاؤں بھی ننگے تھے —— اپنے جسم کی ٹھنڈک دُور کرنے کے لیے وہ رکشا تیز تیز چلا رہا تھا۔ رکشے کی تیز رفتاری نے ہوا پر صیقل رکھ دی تھی —— اس ہوا نے مجید کی گرم موزے میں لپٹی، گرم پتلونوں میں ڈھکی پنڈلیوں میں گھسنے اور آر پار نکل جانے کی کوشش شروع کر دی۔ مجید نے بڑی احتیاط سے حمیدہ کی

شال کی ایک اور تہ کھول کر اسے ٹخنوں تک لٹکا لیا —— اور جیب سے سگرٹ نکال کر اُسے جلانا چاہا، ہوا کے جھونکے نے دیا سلائی کی کئی تیلیاں بجھا دیں۔ اس نے رکشے والے سے کہا "ذرا رو کو بھئی، میں سگرٹ جلا لوں!"

مجید نے سگریٹ پر کش لگاتے ہوئے رکشے والے پر نظر کی۔ اس کے دراوڑی چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلکنے لگے تھے۔ اس کی بغلیں بھیگ گئی تھیں اور وہ یخ زدہ ہوا کے جھونکوں سے محفوظ ہو رہا تھا۔ مجید نے سوچا، کتنی گرمی ہے خود انسان کے جسم میں۔ بس محنت مزدوری کی دیا سلائی دکھائی اور آگ بھڑک اُٹھے گی۔ پھر نہ لحاف کی ضرورت نہ کسی شال کی!

اس نے پوچھا "کہاں کے رہنے والے ہو؟"

وہ بولا "گونڈا جلا (ضلع)"

مجید نے مسکرا کر پوچھا "مہریا ہے؟"

وہ بولا "اوہ نا ہوت اور بالک نہ ہوتن، شاب ماشاء اللہ بالا ماں رکشا چلا ہُت۔ (وہ نہ ہوتی اور بچے نہ ہوتے صاحب تو اس سردی میں رکشا چلاتا)

مجید نے اور کریدا "یہیں شہر میں ہیں؟"

وہ بولا "ناہیں شاب، اپنا دلیش ماں" (نہیں صاحب اپنے دیس میں)

مجید نے مسکرا کر کہا "جب ہی!"

رکشے والا اس "جب ہی" کے طنز کو کیا سمجھتا۔ مگر وہ گنگنانے لگا یعنی

لڑ جئی ہیں تو منوا ماں کھٹک ہوئی ہے کہ ی !"

مجید نے پوچھا۔ "اچھا تو فلم دیکھنے کے لیے پیسے بچا لیتے ہو!"

وہ بولا "ارے کب ہوں کب ہوں، سال چھ مہینا ماں نواب شاب"۔ (ارے کبھی کبھی سال چھ مہینے میں نواب صاحب)

مجید جھنجھلا اُٹھا۔ نہ جانے کیوں یہ سارے پردیسی لکھنؤ کے ہر سفید پوش کو نواب سمجھ لیتے ہیں۔ وُہی محنت مزدوری سے عاری طبقہ۔ بیکاروں کی جماعت، "پدرم سلطان بود" کہہ کر اکڑنے والے اپاہج۔ مجید تو صُبح سے شام تک اپنے جُوتا سازی کے کارخانے میں لگا رہتا، بچیس تیس کاریگروں کی نگرانی کرتا۔ دھوپ لُو سردی پانی میں دوکان دوکان پھر کر آرڈر حاصل کرتا، خون پسینہ ایک کرتا جب جاکر چار پیسے ہاتھ آتے ——— وہ کیا اس رکشے والے کی طرح مزدور نہیں؟ اور یہ کہتا ہے اُسے نواب صاحب!

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ دُور سے نم ہوا اپنے دوش پر ایک دلدوز کراہ کی آواز لائی۔ کراہنے والا کچھ منمنا بھی رہا تھا۔ مگر صاف سنائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر بھی آواز میں ایک انسانی دل کے لیے ناقابل برداشت درد تھا۔ مجید نے گھبرا کر رکشے والے سے پوچھا۔ "ارے یہ کون کراہ رہا ہے بھائی؟"

اس نے رکشا آہستہ کر کے آستین سے مُنہ کا پسینہ پُوچھتے ہوئے کہا:

ارے اکے گو بنگلی ہو شاب! ہرم جادے اُہ کا بھی کھراب کیہن۔ اوسے ایک چھوٹا بالک کا چھاتی سے لگاتے سڑک پر پڑل ہو۔ بس ہر دکھن چیکھت ہو۔ اِہ کا بچہ بولائی بلکوا کا کچھو اوڑھا دیو ای سردی سے مرت ہو" اور اُہ کھُد ننگی ہو! (ارے

صاحب ایک پگلی ہے۔ حرام زادوں نے اس کو بھی خراب کیا ہے ـــــ وہی ایک چھوٹا سا بچہ سینے سے لگائے سڑک پر پڑی ہے۔ بس ہر وقت چیختی رہتی ہے۔ ''اس کو بچالو! اس بچے کو کچھ اوڑھا دو! یہ سردی سے مر رہا ہے!'' اور وہ خود ننگی ہے!)

مجید نے تعجب سے پوچھا۔ ''ارے تو اتنے بڑے شہر میں کسی اللہ کے بندے نے اسے کوئی رضائی کمبل نہ اوڑھایا؟''

وہ بولا ''جیہہ کا پاس رجائی کمل ہوت ہے نشاب، وہ کھدا اوڑھیہے کہ اُہ کا دی ہے!'' (جس کے پاس رضائی کمل ہوگا صاحب وہ خود اوڑھے گا کہ اس کو دے گا)

رکشے والے نے بڑے زور سے کھنکار کر حلق صاف کیا اور زور زور سے تھوکا۔ وہ رکشا اور بھی آہستہ کر کے بولا ''جی نواب نشاب، بڑا لوک موٹر ماں سیدھے پڑے ہوئے پُوں پُوں کرت سَن سَن نکل جات ہن، اُہ کا ہے کا پگلی کی اور دیکھی ہن۔ اُو آپن دو سو، اڑھائے سو کا کمل پگلی پر ڈال دی ہن؟ آپو کا بات کہت ہن!''

(اجی نواب صاحب، بڑے لوگ موٹر میں شیشہ چڑھائے پُوں پُوں کرتے سن سن نکل جاتے ہیں۔ وہ کاہے کو پگلی کی طرف دیکھیں گے۔ کیا وہ اپنے دو سو، ڈھائی سو کے کمل پگلی پر ڈال دیں گے؟ آپ بھی کیا بات کہتے ہیں!)

رکشا اب پگلی کے قریب آگیا تھا۔ ناک کے بیٹھے ہوئے بانسے سے نکلی ہوئی منمناتی آواز صاف سنائی دینے لگی تھی۔ ''ارے بچا لو اس بالک کو! اس کو کوئی دستر اڑھا دو! یہ پاپی نہیں ہیں ہوں! مر جائے گا اس

سردی میں ؛ اسے بچا لو! آہ! آہ! بھگوان کیا اس دنیا میں کہیں دَیا نہیں؟ آہ! آہ!"

مجید نے دیکھا پگلی فٹ پاتھ پر آدھی ننگی پڑی ہے۔ بس ایک چھوٹی سی پھٹی دھوتی رانوں میں لپٹی ہے ایک کونا پیٹ پر پڑا ہے۔ جس کے نیچے سے ایک بچے کا سر دکھائی دے رہا ہے۔ پگلی کے بال مٹی میں اٹے ہیں اور اس کے چہرے اور چھاتی پر اس طرح کے نشانات ہیں جیسے کسی نے اُسے تیز ناخونوں سے نوچا ہے ــــــ اس کی آنکھیں بند ہیں اور اس کی باچھوں سے خون بہہ کر جم گیا ہے جیسے اس نے اپنے دانتوں سے اپنی زبان اور ہونٹ چبا ڈالے ہیں۔ اور وہ کراہے جا رہی ہے۔ "آہ! آہ آہ!" اور اس پر مکھیاں بھی بھن بھنا رہی ہیں اور چیونٹیاں بھی جگہ جگہ چمٹی ہوئی ہیں۔

مجید کے دل نے کہا۔ "یہ تو کسی بھلے گھر کی بھٹکی ہوئی لڑکی ہے۔ کسی فریبی نے دھوکا دیا اور ماں باپ نے گھر سے نکال دیا۔" دفعتہً پگلی نے کراہتے ہوئے لال لال خون کبوتر دیدوں سے آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ چیخی، "یہ بالک اپرادھی نہیں؛ اُسے بچا لو! اسے کچھ اوڑھا دو!"

یہ فریاد مجید کے جسم میں کرنٹ کی طرح دوڑ گئی۔ اس کے دل و دماغ جھنجھنا اُٹھے۔ وہ اس طرح کانپا کہ گھٹنے پر رکھی ہوئی شال پھسل کر جوتوں پر آ رہی وہ اُسے جھک کر اُٹھانے اٹھانے لیے سوچے سمجھے کہہ اُٹھا۔ "روکو جی رکشا!" رکشے والے نے پورا بریک لگایا، رکشا جھٹکے سے رُکا تو اُس نے مجید کو سوالیہ انداز سے دیکھا۔

مجید نے شال اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ "یہ چادر لو۔ اس ننگی کو اوڑھا دو!"
رکشے والے نے تعجب سے پوچھا۔ "ای پگلی کا؟" (اس پگلی کو؟)
مجید نے جھنجھلا کر کہا۔ "ہاں، اسی کو!"
اس نے رکشے سے اترتے ہوئے کہا۔ "ارے ای چدریا بہت بڑھیا ہو نواب شاب! اہ کا بن ناہک پھینکت ہو!" (ارے یہ چادر بہت ہی اچھی ہے نواب صاحب، اسے آپ ناحق ہی پھینک رہے ہیں)
مجید نے ڈانٹ کر کہا۔ "بکو مت! جاکے اسے اڑھا آؤ۔"
مگر نہ مجید خود رکشے سے اترا اور نہ اس نے اپنے ہاتھ سے پگلی کو چادر اڑھانے کی ہمت کی۔ اس کی طرف نظر کرتے ہی متلی معلوم ہوتی تھی۔ خیال آتا کتنی گندی ہے وہ! نہ جانے کیسی کیسی بیماریوں کے جراثیم اس کے جسم سے لپٹے ہوں گے! اور جب رکشے والا چادر لے کر کچھ ناخوش سا پگلی کی طرف بڑھا تو مجید نے ادھر ادھر سڑک پر گھبرائی ہوئی نظر ڈالی۔ کوئی دیکھتا تو نہیں اس کی اس بیوقوفی کو۔ کوئی دیکھ لے گا تو نہ جانے کیا سمجھے گا اپنے دل میں۔
رکشے والے نے پگلی کے پاس جا کر چادر کو زور سے جھٹکا دے کر پھیلایا اور حمیدہ کی چہیتی چادر اس کے گندے جسم پر ڈالتے ہوئے بولا۔ "لے رے پگلی! تمہار کسمت جاگ گئی۔ اب کھوب گرما کے لیٹ!" (لے رے پگلی، تیری قسمت جاگ گئی اب خوب گرما کے لیٹ!)
پگلی نے شال کی سرسراہٹ اور اپنے قریب ایک انسان کی موجودگی محسوس کی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دانت نکال کر اس طرح مسکرائی کہ

چہرہ اور بھی ڈراؤنا ہو گیا۔ رکشے والا جلدی سے پیچھے ہٹا۔ وہ تیز قدم رکھتا رکشے تک پہنچا اور اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی اُسے پُوری تیزی سے بھگا دیا۔ نہ جانے وہ پگلی سے ڈر کر بھاگا تھا یا خود اُس کے اپنے کچھ ایسے جذبات و خیالات تھے جن سے وہ بھاگ رہا تھا۔

اور مجید اس سوچ میں پڑ گیا تھا کہ وہ کیا کہے گا، حمیدہ سے۔ کیا وہ بیوی سے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اس نے اس کی محبوب چادر ایک پگلی کو اڑھا دی ؟ کیا وہ اس کو اپنی توہین نہ سمجھے گی ؟ کہیں آنسو آ گئے اس کی چشم میگوں میں تو ؟ کہیں اُتر گیا اس کا ہنس مکھ چہرہ تو ؟ اس سے تو کیا وہ جھوٹ بولے گا۔ ایسا جھوٹ کہ آنسو کی بجائے حمیدہ کے منہ سے کلمۂ شکر نکلے ـــــ

حمیدہ نے میاں کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ اُسے اوور کوٹ اتارنے میں مدد دی۔ دہکتے ہوئے کوئلوں سے بھری انگیٹھی اس کے پاس لا کر رکھ دی ـــــ گرم گرم پانی سے ہاتھ منہ دھونے کا انتظام کیا۔ جلدی جلدی کھولتی ہوئی چائے تیار کر اکے پلائی۔ جب وہ سوٹ اتارنے اور گھریلو کپڑے پہننے دوسرے کمرے میں چلا گیا تو حمیدہ نے اٹیچی کیس کھولا کہ کپڑے کبرڈ میں رکھ دے۔ ساری چیزیں موجود تھیں، مگر شال کہیں نظر نہ آئی ـــــ اس نے ہولڈال بھی کھول ڈالا بستر میں بھی وہ غیر حاضر نکلی۔ اس نے گھبرا کر مجید سے بلند آواز میں پوچھا۔

"میری شال کیا ہوئی ؟"

مجید نے جھوٹی کہانی گھڑلی تھی۔ وہ اس کے پاس آکر منہ سُکھا کر بولا، "وہ

تو ریل میں چوری ہو گئی۔"

حمیدہ کا چہرہ تمتما اٹھا ۔۔ وہ بولی "کون موا لے گیا اُسے ؟"

مجید نے نظریں نیچی کر کے کہا "رات کو ریل میں گھر سے بھی زیادہ سردی تھی۔ جب دو کملوں اور اوور کوٹ اوڑھنے سے بھی ٹھنڈک میں کمی نہ ہوئی تو میں نے اُن کے اُوپر سے تمھاری چادر بھی ڈال لی معلوم ہوتا ہے وہ کروٹ لینے میں برتھ سے نیچے گر گئی ۔میں سو ہی رہا تھا کہ دو مسافر اُتر گئے ۔۔۔ انھیں میں سے کوئی اُسے بغل میں دبا لے گیا۔" اب وہ آنکھیں اُٹھا کر ذرا سا مسکرایا اور بولا "چیز ہی ایسی تھی کہ جو دیکھے مُنہ میں پانی بھر آئے !"

حمیدہ کوسنے لگی ۔"اللہ کرے اس کا ہاتھ سڑ جائے ! میری شال اوڑھنا اُسے کبھی نصیب نہ ہو ! اس کی قبر میں کیڑے پڑیں !" اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ ہی گئے ۔۔۔

ماما عدّن ناشتے کے سلسلے میں ہدایت لینے کے لیے آکر کھمبے سے لگی کھڑی تھی ۔وہ تڑ سے بولی "اے ہے بی بی ۔ اتّی سی چادر کے چلے جانے پر آپ روتی ہیں ۔خدا کا شکر کیجیے کہ میاں کو کوئی چوٹ چپیٹ نہیں آئی ۔۔۔ سنتی ہوں آج کل چلتی گاڑی میں ڈاکے پڑتے ہیں ۔موئے ڈاکو لوٹتے ہی نہیں ، مسافر کی جان تک لے لیتے ہیں ۔۔۔ اللہ آمین سے میاں صحیح سلامت ساتھ خیریت کے پلٹ آئے ،صدقہ اُتروایئے ! شکر کا سجدہ ادا کیجیے !"

حمیدہ کا موڈ بالکل بدل گیا ۔۔۔ اس نے جھٹ پرس میں سے سو روپیہ نکال کر عدّن کی طرف بڑھایا "سچ کہتی ہو بُوا ! صدقے اُن پر سے ایسی ایسی

سینکڑوں چادریں ۔ اتم ایک سینی میں سوا سیر کھڑا ماش اور ایک پیالے میں سوا پاؤ کڑوا تیل اور اس میں سوا دو روپے رکھ کر ان کے ہاتھ سے چھوا کر کسی فقیر یتیم کو دے دو اور میں جاتی ہوں ابھی دوگانہ پڑھنے ——" اور وہ وضو کرنے اُٹھ کھڑی ہوئی ۔

مجید نے سوچا ۔ چلو کام بن گیا ۔ ایک ذرا سے جھوٹ نے بڑا نیک انجام دکھایا اور اُس نے زبان پر عجیب طرح کی شیرینی محسوس کی ۔

دوسرے دن جب ٹھنڈی ہوا ذرا گرمائی ، تو پانچ بجے کارخانے سے پلٹتے وقت مجید اسی سڑک پر مڑ گیا جدھر پگلی فٹ پاتھ پر پڑی تھی ۔ اس نے دیکھا میونسپلٹی کے مہتر اس کی اکڑی ہوئی لاش ایک ٹھیلے پر لاد رہے ہیں ۔ اس کے جسم پر وہی میلی پھٹی دھوتی ہے اور اس کا مرا ہوا بچہ اسی طرح اس کی چھاتی سے چپکا ہوا ہے —— مگر حمیدہ کی جہیتی چادر کا دُور دُور کہیں پتا نہیں ! اور مجید کا منہ کڑوے لعاب سے بھر گیا !

○

نقوش :

عنایت اللہ

جب سوزِ عشق جاگا

نور چاچا گاؤں کی آبرو کار کھوالا تھا۔

یوں تو بڑے شاہ جی مرحوم کے مزار کا بھی گاؤں پہ سایہ تھا اور اب ان کی گدی پر پیر چراغ شاہ بیٹھے تھے جن کی دعا و برکت سے گاؤں شرار، بھوت، پریت، جن، چڑیل، پکڑ، سایہ اور ہر بلا سے محفوظ تھا اور دشمن کا بھی سر نیچا رہتا تھا، لیکن گاؤں کے دشمن پیر چراغ شاہ سے کم اور نور چاچا سے زیادہ ڈرتے تھے۔ نور چاچا کی کرامات ہی ایسی تھیں۔

گاؤں کے دشمن کہیں دُور دراز نہیں رہتے تھے، ان کا گاؤں وہ سامنے نظر آتا تھا۔ یہی کوئی پون کوس کا فاصلہ ہو گا۔ نور چاچا کے گاؤں اور اُس گاؤں کی کھیتوں کے مینڈھ را نجھے تھے، دونوں گاؤں کے درمیان بہتا سرکاری کھٹہ بھی سانجھا تھا۔ ہری کھیتیوں کی آغوش میں شیشم کے پیڑوں تلے قبرستان بھی سانجھا تھا۔ اُدھر کی بیٹیاں اِدھر اور اِدھر کی بیٹیاں اُدھر بیاہی ہوئی تھیں۔ ڈیڑھ کوس پرے ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن بھی سانجھا تھا دونوں گاؤں کے فوجی جوان اسی اسٹیشن پر اُترتے تھے اور اپنے اپنے گاؤں میں چھٹی کاٹ کر اسی اسٹیشن سے رات کی مسافر گاڑی سے دُور پردیس چلے

جایا کرتے تھے۔ اس اسٹیشن پر بھی ایک گاڑی رُکا کرتی تھی، وہ بھی رات بارہ بجے۔ ڈھور ڈنگر چرتے چگتے اور بچے لدکڑے لگاتے اِس گاؤں سے اُس گاؤں تک جا پہنچتے تھے، لیکن دلوں میں جو فاصلے حائل ہو گئے تھے وہ بڑی کٹھن مسافت تھی جسے نہ اُس گاؤں کے گبھرو پاٹ سکے نہ اُس گاؤں کے بیالوں نے کبھی طے کرنے کی ہمت کی

کرتے بھی کیسے؟ صرف سرکاری کٹھ ہوتا تو وہ بھلا ناگ کے پار کر جاتے لیکن درمیان میں ناگ حائل ہو گئی تھی۔ ناگ پر پاؤں رکھ کر گزرنا ممکن نہ تھا حالانکہ اسی ناگ پہ پاؤں رکھ کر دونوں گاؤں کے بیسیوں آدمی جیل جا چکے تھے۔ کئی عمر قید بھگت رہے تھے اور کئی نعرے لگاتے پھانسی چڑھ گئے تھے۔ جو قتل ہو گئے تھے اُن کے بھی اور جو پھانسی چڑھ گئے تھے اُن کے بھی، جنازے دونوں گاؤں نے مل کر پڑھے تھے اور قاتلوں اور مقتولوں کی قبریں بھی پہلو بہ پہلو کھدی تھیں۔

یہ سلسلہ ایک مدّت سے جاری تھا اور طویل مدّت تک جاری رہنے کے امکانات بھی روشن تھے۔ باراتیں بھی آتی تھیں، ڈولیاں بھی جاتی تھیں اور جنازے بھی اُٹھتے تھے۔ رشتے ناطے جو گڑ شکر سے طے ہوتے تھے، ڈھولک کی تھاپ پر کنوارے گیتوں میں پروان چڑھتے۔ بینڈ باجے بجتے، گولے چلتے، پھر میکے اور سسرال کے تین چار پھیروں میں کوئی بات پیدا ہو ہی جاتی تھی جس سے سہاگن جو ڈولی پہ جاتی تھی طلاق لے کر پا پیادہ لوٹ آتی تھی اور اس کے جواب میں کوئی ایک دو بچوں کی ماں سسکیاں لیتی اسی آنگن میں جا بیٹھتی تھی جہاں

سے برسوں پہلے اُس کی ڈولی اُٹھی تھی!

نور چاچا نے تو رشتوں ناطوں کا سلسلہ ہی توڑ دیا تھا۔ اُس کی عمر آج پچاس برس ہو چکی تھی لیکن اسے وہ واردات کل کی بات کی طرح یاد تھی جب وہ دس گیارہ برس کا بچہ تھا تو اس کا باپ اس کی آنکھوں کے سامنے قتل ہو گیا تھا۔ آج نصف صدی گزرنے والی تھی، لیکن باپ کی لاش ابھی تک اس کی نظروں تلے تڑپ رہی تھی۔ جوہڑ کے قریب لڑائی ہوئی تھی۔ یہ جوہڑ پیپل کی چھاؤں تلے دونوں گاؤں کے درمیان تھا۔ دونوں گاؤں کی بھینسیں اس میں بیٹھا کرتی تھیں اور دونوں گاؤں کے بچے اس میں تیرا کرتے تھے۔ نور چاچا جو اس وقت نور چاچا نہیں نادان سا نور تھا، اپنے باپ کے ساتھ تھا۔ بات اتنی سی ہوئی تھی کہ اُن کی بھینس پار والوں کی ایک بھینس سے لڑ پڑی۔ نور کے باپ نے دوسری بھینس کو لاٹھی دے ماری تھی۔ اس گاؤں کے دو آدمی قریب ہی کھیتوں میں پانی لگا رہے تھے۔ وہ کدالیں لیے نور چاچا کے باپ پر ٹوٹ پڑے تھے۔ دو آدمی ادھر سے بھی پہنچ گئے تھے۔

نور چاچا کو آج صرف اسی قدر یاد تھا کہ اُس کے باپ کا سر کھُل گیا تھا اور وہ جیٹھ کی جھلستی دھوپ میں دہکتی دھرتی پر تڑپ رہا تھا۔

لڑائی تو بظاہر بھینسوں پر ہوئی تھی لیکن اس کے پس منظر میں نصف صدی کی سیاست تھی جو اب روایت بن گئی تھی اور جسے بڑے بوڑھے ورثے کے طور پر گاؤں میں چھوڑ گئے تھے۔ نور چاچا کا باپ قتل ہو گیا اور چار ہی سال بعد اُس کی ماں بھی مر گئی اور وہ تپتے خلاؤں میں بھٹکنے کے

لیے اکیلا رہ گیا تھا۔ باپ کی زمین خاصی تھی۔ ننھیال والوں نے اُسے گود لے لیا اور گاؤں والوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ لیا اور یتیم بچے کی کھیتیاں ویران نہ ہونے دیں، مگر بچے سے جو پیار چھن گیا تھا وہ اُسے کوئی نہ دے سکا۔

شفقت اور پیار کی محرومی نے نور چاچا کے ذہن میں باپ کی تڑپتی لاش کے تصوّر کو اور زیادہ اجاگر کر دیا تھا اور انتقام کا زہر اس کی سوچ اور فکر پر چھایا چلا گیا۔ وہ ابھی چھوٹا تھا، بڑوں کی طرح سوچ سکتا تھا نہ لڑ سکتا تھا، لیکن وہ جلد اور بہت ہی جلد انتقام لینے کے لیے بے تاب تھا۔ وہ ہمجولیوں میں کم اور بڑوں کی اُن چنڈال چوکڑیوں میں زیادہ اٹھتا بیٹھتا تھا۔ جہاں پار والے گاؤں کے خلاف نت نئی سازشیں تخلیق ہوا کرتی تھیں۔ وہاں اُن کے مویشی چوری کر لانے، کھلیان جلا دینے، کسی لڑکی کو اٹھا لانے اور پانی کی باری پر دنگا فساد کرنے کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ یہ تخریبی باتیں نور چاچا کے کچے ذہن میں قندیلیں روشن کرتی جا رہی تھیں۔ اُس کی نفسیاتی خلش اور جذباتی ہیجان کو ان ہی باتوں سے تسکین ملتی تھی۔ وہ جب بڑوں کی محفل سے اٹھتا تھا تو تنہائی میں کتنی ہی دیر تصوروں میں انتقام کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ اُس کے ذہن میں نفرت و حقارت اور انتقامی جذبات کے سوا کچھ نہ رہا۔

لڑکپن میں وہ بڑوں کی سی پختہ باتیں کرنے لگا تھا اور جب لڑکپن جوانی میں مدغم ہو گیا تو اس کے چہرے پر مردوں کی پختگی کا پُرکشش روپ چڑھ گیا۔ اس کا خوبرو تصوّر گاؤں کی گوریوں کو کنواری تنہائیوں میں گدگدانے

لگا لیکن نور چاچا کی تنہائیوں کو باپ کی لاش تلخ بنائے رکھتی تھی۔ وہ جب تنہا ہوتا تھا تو تصویروں میں باپ کی لاش اور زیادہ نکھر آتی تھی اور نور چاچا کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔

بیس برس کی عمر میں ننھیال والوں نے اس کے باپ کی تمام زمین اس کے نام منتقل کرا دی اور نور چاچا جو چہرے سے خوبرو اور جسم و جثہ کا دل نشین گبھرو تھا۔ اُن تمام والدین کو پیارا لگنے لگا جن کی بیٹیاں شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھیں۔ وہ اب گاؤں کا راجہ تھا اور کئی بے چین نگاہوں اور پُر شباب آہوں کا مرکز، لیکن نور چاچا کی نگاہیں کھیتے کے پار اُس گاؤں پر جمی رہتی تھیں جس کے دو آدمیوں نے دس برس گزرے اس کے باپ کو قتل کر دیا تھا اور عدالت میں جا کر صاف بری ہو آئے تھے۔ نور چاچا تو کسی بھی لہ زبانی کی باری پہ یا جوہڑ پر ڈھور ڈنگروں سے ہی کوئی بات پیدا کر کے لڑائی کر سکتا تھا۔ اب تو اس کے بازوؤں میں بے پناہ قوت تھی اور دماغ صرف لڑنے مرنے کی ہی سوچتا تھا، لیکن اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ قتل کروں گا، بدلہ لوں گا لیکن ایک بار نہیں بدلہ لیتا ہی رہوں گا اور پھر زندہ رہ کر تماشہ دیکھا کروں گا۔

"نور بیٹا!" ایک روز بڑے چوہدری نے اُسے پیار سے کہا تھا۔ "اب گھر بسا لو، جوانی یوں اکیلے نہیں کٹا کرتی۔ گاؤں والے انگلیاں اٹھاتے ہیں۔"

"چاچا جی!" نور نے پُراسرار سی مسکراہٹ سے کہا تھا۔ "شادی!

گاؤں سے نہیں کروں گا۔ نہ میری بارات جائے گی، نہ میں کہیں سے ڈولی لاؤں گا، پار والے چوہدری کرم دین کی بیٹی، زینت، جوان ہو گئی ہے، اسے اٹھا لاؤں گا، اپنے گاؤں کے بیچ بیٹھ کر نکاح پڑھاؤں گا اور ایک مہینہ بعد طلاق دے دوں گا۔" نورے نے متانت سے کہا تھا "پھر اسی گاؤں کی ایک اور لڑکی اٹھا لاؤں گا اور زبردستی نکاح کر کے تھوڑے دنوں بعد طلاق دے کر گاؤں سے نکال دوں گا۔"

چوہدری نے چونک کر نورے کو دیکھا لیکن وہ خراماں خراماں کھیتے کی طرف جا رہا تھا۔ رت چیت بیساکھ کی تھی۔ گندم کے خوشے پک کے سنہرے ہو چلے تھے اور بیساکھ کی پرکیف تپش نے جوان سینوں میں ہل چل مچا رکھی تھی۔ خوشے تن کے جھوم رہے تھے اور الھڑ جوانیاں مٹک مٹک کر گھوم رہی تھیں۔ دل بے طرح دھڑک رہے تھے۔ دلوں کی باتیں زیرِ لب تبسم میں الجھی تھیں اور اس تبسم میں انگڑائیاں مسکرا رہی تھیں۔ بازو آپ ہی آپ انگڑائیوں کے لیے پھیل جاتے تھے۔

"نورا!" اسے یوں آواز سنائی دی جیسے گندم کے کسی خوشے نے سرگوشی میں بلایا ہو۔ وہ رک گیا "کہاں چلے نورا!" —— اس نے دیکھا، دو کھیتوں کے درمیان مینڈھ پر مہراں بیٹھی تھی۔ وہ کہیں جا رہی تھی لیکن نورے کو دیکھ کر بیٹھ گئی تھی۔ مہراں گاؤں کی حسین لڑکی تھی اور کنواری۔ جانے کتنے امیدواروں کی آنکھیں اس کی راہ میں سجدہ ریز رہتی تھیں، لیکن مہراں کی اپنی جبیں نورے کے قدموں میں جھکتی جا رہی تھی۔ نورے کو معلوم نہ تھا۔

"کیوں مہراں!" نور نے مسکرا کر پوچھا: "یہاں کیوں بیٹھ گئی؟"

"کوئی دیکھ نہ لے۔" مہراں نے مسکراتی ہوئی سی آہ لے کے کہا، "تم کہاں چلے؟ ..... بیٹھ جاؤ نا۔"

"کیوں؟"

"کوئی دیکھ نہ لے۔"

"پگلی مہراں۔" اُس نے کہا اور اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر آگے بڑھنے لگا۔

مہراں نے اس کا راستہ روک لیا۔ نور بھی رُک گیا اور سنجیدہ سے لہجے میں بولا: "مہراں! میں گاؤں کی آبرو کا رکھوالا ہوں اور تم گاؤں کی بیٹی ہو۔"

"میں بے آبرو تو نہیں۔ نورا!" مہراں نے دھیمے مگر باوقار لہجے میں کہا: "میں گاؤں کی آبرو ہوں اور اپنی رکھوالی بھی کر سکتی ہوں، پر فرق اتنا سا ہے کہ تم مرد ہو میں عورت ہوں۔" اُس نے آہ لی اور سسکی سی لے کر بولی: "جا، نورا! پھر کبھی تیری راہ نہ آؤں گی۔"

نور کے جی میں جانے کیوں آئی کہ مہراں کے پاس بیٹھ جائے لیکن مہراں آنچل سے آنسو پونچھتی اُٹھ بیٹھی تھی۔ نور کو دھچکا سا لگا۔ بولا: "بُرا مان گئی مہراں؟ میں تو گاؤں کی ہر لڑکی کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔"

"اوہ! مہراں گردن کو پیارا سا خم دے کر بڑی سادگی سے بولی: "ہر لڑکی کو بہن سمجھتا ہے تو بیاہ کس سے کرے گا؟"

"بار والے چوہدری کرم دین کی بیٹی زینت سے۔"

"ہائیں! مہراں چونک اٹھی۔ اپنے باپ کے قاتلوں سے جا رشتہ جوڑے گا؟"
"نہیں"۔ نور نے سنجیدہ سی مسکراہٹ سے کہا: "رشتہ مانگنے نہیں جاؤں گا نہ رشتہ جوڑوں گا، زینت کو اٹھا لاؤں گا۔"

اور وہ مہراں کو خلاؤں میں بھٹکتا چھوڑ کے آگے چلا گیا۔

اس رات نور بہت دیر بعد گھر آیا۔ سارا گاؤں گہری نیند سو گیا تھا۔ اگلی صبح پڑوسیوں نے پوچھا کہ رات کہاں رہے تو وہ مسکرا کر بات گول کر گیا۔ اور کسی کو پتا نہ چلنے دیا کہ وہ شام کے اندھیرے میں باپ کے قاتلوں کے گاؤں کے گرد گھومتا رہا ہے اور زینت کے باپ چوہدری کرم دین کے گھر کا جائزہ لیتا رہا ہے۔

پھر نور اکثر غائب رہنے لگا اور رات بہت دیر سے گھر آنے لگا۔

فصل کٹ کے کھلیانوں میں ڈھیر ہو گئی۔ کھلیانوں میں پکی گندم کی پہاڑیاں سی کھڑی ہو گئیں اور دھوپ میں سوکھنے لگیں۔ ایک رات نور چاچا کے گاؤں والوں کو پار والے گاؤں کے کھلیانوں سے مہیب سے شعلے اٹھتے نظر آئے۔ تاریک رات سرخ ہو رہی تھی، کھلیان جل رہے تھے اور دھوئیں کے بھوت شب کی تیرگی میں اٹھ اٹھ کر گم ہو رہے تھے۔ دوسری صبح نور کے گاؤں میں خوشیاں ناچ رہی تھیں۔ ہر کوئی ہر کسی سے فاتحانہ لہجے میں پوچھ رہا تھا ___ "کس نے لگائی تھی؟" ___ لیکن ہر کوئی سر ہلا کے چپ ہو رہتا تھا۔ گاؤں والے اس مرد کا منہ چوم لینا چاہتے تھے جو ان کے دشمنوں کی فصل جلا آیا تھا۔ صرف نور تھا جو ابھی جاگا ہی نہیں تھا۔ دن کا پچھلا

پہر گذر چکا تھا جب نور آنکھیں ملتا باہر نکلا تو تین چار آدمیوں نے اُسے گھیر لیا۔ پوچھا۔ نور! سُنا تُو نے بھی رات بار والوں کا ایک کھلیان جل گیا ہے؟"

"ایک کھلیان؟" نور کے چہرے کا تاثر یوں بدل گیا جیسے اُسے دُکھ ہوا ہو۔

"کیوں؟" ایک آدمی نے طنز آلود لہجے میں کہا: تمہیں رنج ہوا ہے کہ تیرے باپ کے قاتلوں کا کھلیان جل گیا ہے؟"

"بہت رنج ہوا ہے بھائیو!" نور نے کہا "میں نے تو اُن کے دو کھلیانوں میں انگارے رکھے تھے اور آگ بھڑکنے سے پہلے بھاگ آیا تھا۔"

"ارے دونوں جل گئے ہیں" ایک نے اس سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا "تو نے انتقام لے لیا نور!" اور نور کے چہرے پر رونق آگئی۔ بولا: ابھی نہیں۔ انتقام تو میں تمام عمر لیتا رہوں گا۔ یہ تو بسم اللہ کی ہے۔"

بڑے بوڑھوں نے نور کو سینے سے لگا لیا۔ وہ خوش تھے کہ بار والے دشمنوں کے خلاف جنگ کو زندہ رکھنے کے لیے ایک اور رہبر میدان میں اتر آیا ہے۔

عین اس وقت بار والے گاؤں کے بیس پچیس آدمی لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لیے کھیتوں پر صف آرا ہوئے اور للکار للکار کر نور کے گاؤں والوں کو گالیاں دینے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے سوا ان کے کھلیانوں کو اور کوئی آگ لگانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ نور کے گاؤں کے چھوٹے

بڑے چھویاں اور کلہاڑیاں لے کر نکل آئے۔ لیکن نور نے راہ روک لی اور بولا
۔۔۔ "سر کھل جائیں گے مردو! بچوں کو یتیم نہ کرو، بچوں کی ماؤں کو بیوہ نہ کرو۔
ان گالیوں کا جواب اب نور دے گا۔ اب ڈانگ سوٹا نہیں چلے گا۔ تم اپنے
کھلیانوں پہ پہرے بٹھا دو، باقی میں سنبھال لوں گا۔"

لیکن نور کے گاؤں کے مرد اُس کی ایک بھی سننے پہ آمادہ نہ تھے اُدھر
سے گالیاں تیروں کی طرح سنسناتی چلی آ رہی تھیں۔ اِدھر نور اپنے گاؤں
والوں کی راہ روکے کھڑا تھا۔ بول بول کر اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔
آخر یہ جھاگ ضائع نہ گئی اور اُس نے خون خرابہ ہوتے ہوتے بچا لیا۔

دو ہی روز بعد نور نے گالیوں کا انتقام لے لیا۔ وہ اس طرح کہ ایک
رات وہ پھر گھر بہت دیر سے آیا اور دوسری صبح پتا چلا کہ پار والے چودھری
کرم دین کے دو بیل اور چودھری رب نواز کی ایک بھینس مر گئی ہے۔ چند
دنوں بعد خبر ملی کہ کسی نے چارے میں زہر ملا دیا تھا۔ یہ مویشی گرمیوں کی
وجہ سے باہر کی کھرلی پہ بندھے تھے اور نور گاؤں کے چوکیدار اور باہر سوئے
ہوئے آدمیوں کی نظر بچا تا کھرلی میں زہر کی پڑیا بکھیر آیا تھا۔ نور بے حد مسرور
تھا اور اُس کے چہرے پر انوکھی سی رونق آ گئی تھی۔

دوسرے روز پار والے گاؤں کے تین آدمی نور کے گاؤں کے دو آدمیوں
سے الجھ پڑے۔ وہ اپنے دو بیلوں اور ایک بھینس کا انتقام لینا چاہتے تھے
جوہڑ کا کنارہ میدانِ جنگ بن گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ کوئی قتل نہ ہوا۔ نور
جن چراغ شاہ کے پاس گیا اور عرض کی کہ دونوں گاؤں کا راضی نامہ کرا دیں

دونوں گاؤں شاہ جی کی مریدی میں تھے، اُن کا کہنا حکم کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاہ جی دونوں فریقوں کو تعویذ دیا کرتے تھے۔ اور لوگ پھانسی پر چڑھ جانے تک اُن کے تعویذ گلے میں لٹکائے رکھتے تھے۔ وہ انتقام لینے کی شبھ گھڑی بھی بتایا کرتے تھے۔ اب نوراں کے پاس فریقوں میں راضی نامے کے لیے گیا تو انھوں نے دونوں گاؤں کے پنچوں کو بلا کر دونوں گاؤں کی تاریخ میں ایک اور راضی نامے کا اضافہ کر دیا اور بات تھانے تک نہ پہنچنے پائی ــــــ نور کا مقصد ہی یہی تھا۔

کھلیانوں سے دانے گھروں میں آگئے تھے اور جن کے کھلیان جل گئے تھے وہ سینے کی آگ کو ٹھنڈی آہوں سے بجھانے کی کوشش کر رہے تھے جہاں ایک مہینہ پہلے کھڑی فصلوں کی لہریں تھیں وہاں اب دُور دُور تک پھیلا ہوا میدان تھا۔

راضی نامے کو دس روز گذر گئے تھے۔ جمعرات کا دن تھا۔ دونوں گاؤں کے بوڑھے، بچے، عورتیں کھیتوں کے میدان میں جمع ہو گئی تھیں۔ ارد گرد کے دیہات کے لوگوں نے بھی اسی میدان میں آکر ہجوم کیا اور میلے کا سا سماں بن گیا۔ دونوں گاؤں کے میراثی ڈھول پیٹ رہے تھے اور دس بارہ بیل گاڑیاں میدان میں گھوم رہی تھیں۔ گاڑیوں سے جُتے بیلوں کو صابن سے نہلایا گیا تھا۔ گردنوں میں گھنٹیاں، اٹھنیوں اور چونیوں کے ہار اور ٹانگوں میں بندھے گھنگھرو سُر تال میں چھنک رہے تھے۔ بعض نے بیلوں کے سینگوں پر ریشمی رومال باندھ رکھے تھے اور اُن کی پیٹھوں پر رنگ برنگے دوپٹے پھیلا کر

باندھ دیتے تھے۔

یہ "گڈوں" (بیل گاڑیوں) کی دوڑ کا مقابلہ تھا جو نورے نے پار والے گاؤں سے طے کیا تھا۔ راضی نامے کے دوسرے روز نور، پار والے چوہدری کرم دین کے ہاں چلا گیا تھا اور اُس کے گھٹنے چھو کر بڑے ادب اور احترام سے کہا تھا --- "چاچا جی، میں ثبوت دینے آیا ہوں کہ یہ راضی نامہ پہلے راضی ناموں کی طرح ٹوٹنے کے لیے نہیں بنایا گیا۔ اگر آپ بھی ہماری طرح سچے دل سے دشمنی ختم کر دینا چاہیں تو آیئے مل جل کر ہنسیں کھیلیں اور ایک دوسرے کے غم بانٹ لیں۔ دونوں گاؤں کے گبھرو حرام موت مر رہے ہیں۔ کوئی قتل ہو جاتا ہے اور کوئی پھانسی چڑھ جاتا ہے۔"

نورے نے ایسے لہجے میں بات کی تھی کہ چوہدری کرم دین کے آنسو نکل آئے تھے اور اُس نے نورے کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا تھا: "نور بیٹا! یہ عہد تیرا باپ کرتا تو قتل نہ ہوتا۔ بہت خون خرابہ ہو چکا بیٹا! ۔۔۔۔" اور کرم دین پر رقت طاری ہو گئی تھی۔

یہ وہی چوہدری کرم دین تھا جس کی بیٹی، زینت، کو نورے نے اٹھا لانے، زبردستی نکاح پڑھوانے اور تیسرے مہینے طلاق دے کر گاؤں سے نکال دینے کا عہد کیا تھا۔

کرم دین کے آنسو دیکھ کر نورے نے سر جھکا لیا، پھر بولا "چاچا، آؤ ہم دنیا کو دکھا دیں کہ ہم ایک ہو گئے ہیں۔ آؤ چاچا، اس جمعرات کے روز دونوں گاؤں مل کے "گڈوں" کی دوڑ کریں اور ہنسیں کھیلیں۔"

اور یُوں نُور نے دونوں گاؤں کو گڈوں کی دوستانہ دوڑ پر راضی کر لیا تھا لیکن نُور کے اپنے گاؤں کے چند آدمی نُور کے اس اقدام پر خوش نہیں تھے اور وہ جگہ جگہ کہتے پھر رہے تھے کہ راضی نامے، تو ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن دشمنوں سے یوں گھل مل جانا کہاں کی غیرت ہے۔ خود نور کا باپ انہی دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔

اس احتجاجی چہ میگوئیوں کے باوجود گڈوں کی دوڑ ہو رہی تھی اور جمعرات کے روز دونوں گاؤں کے درمیان خالی کھیتوں کے وسیع میدان میں ہزاروں دیہاتیوں کا ہجوم تھا۔

نُور کا گڈا ابھی دوڑ میں شامل تھا۔ اُس نے اپنے کالے بیل کو دولھا کی طرح سجا رکھا تھا اور گڈے اور بیل کے سینگوں کو کڑوا تیل مل کر چمکایا ہوا تھا۔ نور نے چارخانہ کا لاچہ، "دو گھوڑے" کی بوسکی کا لمبا کرتہ اور سر پر فیروزی رنگ کا صافہ باندھ رکھا تھا۔ اُس کا کلف سے اکڑا ہوا شملہ سب سے زیادہ اونچا تھا۔ وہ فاتحانہ انداز سے گڈے کو میدان میں چکر دے رہا تھا اور پار والے گاؤں کے بچے بچے کو ماتھے پر ہاتھ رکھ کر، ہنس ہنس کر، سلام کر رہا تھا۔

پار والے گاؤں کا ایک گڈا اس کے قریب آ کر رکا۔ نور نے گھوم کر دیکھا وہ پار والے مہدی حسین کا گڈا تھا۔ مہدی حسین، نُور کا ہم عمر تھا اور اسی کی طرح گبھرو اور خوبرو۔ نور کے باپ کو مہدی حسین کے باپ نے ہی قتل کیا تھا۔ لیکن وہ عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو گیا تھا اور اب بڑھاپے نے اُس کی کمر دوہری کر دی تھی۔ مہدی حسین کو اس نے دشمنوں کے سامنے

کبھی نہ جھکنے کے سبق دیتے تھے اور اُسے لٹھ بازی میں طاق کر دیا تھا۔ گاؤں والے کہا کرتے تھے کہ مہدی حسین کی لاٹھی سنز گز تک مار کرتی ہے۔

اس لیے اپنا بیل اور گڈا نور کی طرح سجا رکھا تھا۔ نور کے قریب گڈا روک کر اُس نے نور کو مسرت اور انسبیت سے سلام کیا۔ نور اپنے گڈے سے اُس کے گڈے میں کود گیا اور اس قدر زور سے بغل گیر ہوا کہ مہدی حسین کا چہرہ لال ہو گیا اور اس کی ہنسی نکل گئی۔ میدان میں بکھرے ہوئے ہجوم میں سرگوشیاں سنائی دینے لگیں جو سمٹ سمٹا کر ایک قہر آلود طعنے میں سمٹ آئیں —— "بے غیرت، باپ کے قاتل کے بیٹے کو سینے سے لگا رہا ہے" —— نور کے گاؤں والے اُسے نفرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔

پنچ میدان میں آ گئے۔ ڈھول یکبارگی بج اُٹھے۔ بکھرے ہوئے ہجوم میں کھلبلی مچ گئی اور میدان خالی ہو گیا۔ گڈے ایک طرف چل پڑے اور دور ایک صف میں جا کھڑے ہوئے، تماشائی میدان کے دونوں طرف دیواروں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ دونوں گاؤں سے چھ چھ گڈے دوڑ کے لیے آئے تھے۔ چوہدری کرم دین میدان کے وسط میں ہاتھ میں چادر لیے کھڑا تھا۔ گڈوں کے بیل صف میں کھڑے بے تابی سے کھُر مار رہے تھے سواروں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور وہ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھنے لگے۔

نور نے اپنا گڈا درمیان میں رکھا۔ دو گڈے بائیں، مہدی حسین کا گڈا تھا۔ نور بار بار مہدی حسین کو دیکھ کر مسکراتا تھا اور مہدی کی پُر شباب

مسکراہٹ اور زیادہ کھِل گئی تھی۔ نور کے گاؤں والے نُور کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے ۔ "کم عقل کو اتنا بھی پتا نہیں کہ راضی نامے تو ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن راضی نامے کا یہ مطلب تو نہیں کہ دشمنوں کو یوں ہنس ہنس کر سلام کرتے پھریں"۔

میدان کے وسط میں کھڑے چوہدری کرم دین نے چادر اونچی کر لی۔ ڈھول یکبارگی خاموش ہو گئے۔ تماشائیوں کے ہجوم پر سناٹا چھا گیا۔ سواروں نے بیلوں کی رسیاں تان لیں اور چابک لہرانے لگے۔ چوہدری کرم دین نے چادر ہلا کر جھٹکے سے نیچے کی، اور بھاگ کر میدان سے نکل گیا۔ کائنات کا یہ چھایا ہوا سکوت "ہلا نیلے ...... اللہ بیلی بگے ..... اللہ ای اللہ" اور بیلوں کے گھنگھرؤں، گھنٹیوں اور قدموں کی بے ہنگم آوازوں اور مہیب جھنکار، ہجوم کی "ہلا شیری" اور نعروں اور ڈھولوں کے شور سے قیامت کا ہنگامہ بپا ہو گیا۔

سامنے پون کوس کھلا میدان تھا۔ راہ میں اونچی نیچی مینڈھیں اور کہیں کہیں درخت بھی تھے۔ کہیں کا موڑ بھی تھا۔ اور گڈوں کو پون کوس کی یہ ناہموار مسافت چشم زدن میں طے کر کے سبز جھنڈے تک پہنچنا تھا جو ویران سے ریلوے اسٹیشن سے ڈیڑھ دو سو گز اس طرف نصب کیا گیا تھا۔ ہجوم گڈوں کے ساتھ ساتھ بھاگ پڑا اور گڈے سو ڈیڑھ سو گز تک جس طرح ایک صف میں چل گئے تھے ابھی تک ایک ہی صف میں بھاگ رہے تھے۔ تازہ دم بیل جیسے سمجھ گئے تھے کہ یہ اُن کے گاؤں کی عزت اور ناک کی دوڑ ہے اگر پیچھے

رہ گئے تو نہ کوئی انھیں عابن سے نہلائے گا، نہ سینگوں پر تیل چپڑے گا، نہ یوں جبینی کے رنگ رنگیلے دو پٹوں سے سجائے گا۔ بیل عزت و ناموس کے نام پر ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ گڈے ناہموار کھیتوں میں فٹ فٹ بھر اُچھلتے تھے اور اُن کے پہیے اچھل اچھل کر گھوم رہے تھے۔

آگے جا کر گڈوں کی ترتیب بکھرنے لگی۔ نور نے اپنے بیل کی رسّی کو بائیں طرف جنبش دی تو اُن کا گڈا مہدی حسین کے قریب چلا گیا۔ مہدی کے پیچھے اُسی کے گاؤں کا گڈا تھا، جس کا سوار مہدی اور نور کی طرح گٹھا ہوا جوان تھا۔ یہ دونوں پار والے گاؤں کی آبرو اور لاج کے رکھوالے تھے۔ ذرا آگے جا کر مہدی اور نور کے گڈے پہلو بہ پہلو ہو گئے۔ دونوں سینہ پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگا رہے تھے۔ دونوں گڈے باقیوں سے آگے نکل گئے تھے۔ مہدی حسین سے پیچھے والے سوار کو آگے بڑھنے کی راہ نہیں مل رہی تھی۔ اُس نے اپنے بیل کی رسّی کھینچ کر گڈا نور کے پہلو میں کرنا چاہا لیکن نور نے دیکھ لیا اور اُس نے گڈا دائیں کر کے اُس کا راستہ روک لیا۔ پھر اس نے گڈا نور اور مہدی حسین کے درمیان سے نکالنا چاہا تو نور نے اپنے بیل کو مہدی کے قریب کر لیا مگر تیسرا گڈا مہدی کے پیچھے ہی رہا۔

گرد کے بادل اور نعرے آسمان تک جا پہنچتے تھے۔ ہجوم بھاگ بھاگ کر پسینہ پسینہ ہونے لگا۔ سب کی نظریں اب نور اور مہدی حسین پر تھیں۔ باقی گڈے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اگلی مینڈھ زیادہ اونچی تھی۔ تینوں گڈے بڑی زور سے اُچھلے۔ نور مشکل سے سنبھلا۔ مہدی حسین گڈے میں گر

پڑا لیکن اُٹھ بیٹھا۔ اس کا بیل جانفشانی سے اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ مہدی کے گاؤں کا دوسرا گڈا جو اُس کے پیچھے چلا آرہا تھا مہدی کے بائیں پہلو میں ہونے لگا مگر نور نے اپنا گڈا مہدی کے پہلو میں دبا کر اسے دائیں ہو جانے پر مجبور کر دیا اور تیسرا گڈا مہدی حسین کے پیچھے ہی رہا ـــــ یہ نور کا کمال تھا۔

میدان آدھا طے ہو گیا تھا اور تماشائیوں کا ہجوم تھک کر تتر بتر ہو گیا تھا۔ صرف وہی ساتھ دے رہے تھے جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ نور نے اچانک اپنا گڈا دائیں کو کر لیا اور مہدی حسین کے گڈے سے آٹھ دس قدم پرے چلا گیا۔ نور کا پرے ہٹنا تھا کہ مہدی حسین کے گڈے کا ایک پہیہ کسی گڑھے میں دھنس گیا، پھر گڈا کئی فٹ ہوا میں اچھلا مہدی گیند کی طرح اچھل کر بیل کے آگے جا پڑا اور اس کا گڈا اور بیل لڑھکنی کھا کر مہدی کے اوپر جا پڑے۔ پیچھے اسی کے گاؤں کا دوسرا گڈا اس کے ساتھ لگا چلا آ رہا تھا۔ ایک دو گز کا ہی فاصلہ تھا۔ گڈا روکنے کا وقت ہی نہ تھا۔ یہ گڈا بھی اچھلا اور مہدی کے اوندھے پڑے گڈے سے دھماکے سے ٹکرایا اور اس کا سوار اس تصادم میں پس گیا۔

گرد گھٹا کی طرح اٹھی اور اس گرد سے صرف نور کا گڈا بدستور بھاگتا باہر نکلا۔ دوسرے دونوں گڈوں کو گرد نے چھپا لیا تھا۔ تھکا ہارا ہجوم تیزی سے بھاگا۔ پچھلے گڈوں نے رخ موڑ لیے اور رک گئے۔ ان کے سوار کود کر بھاگے، گھوڑ سواروں نے باگیں موڑ لیں اور یہ سارا انبوہ گرد پر ٹوٹ پڑا

دیکھا مہدی حسین بھی اور اس کے گاؤں کا دوسرا سوار بھی مر چکے تھے۔

ایک بیل کی گردن اور دوسرے کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ آخری سانسیں لے رہے تھے۔ مہدی حسین اور اس کے ساتھی کی لاشیں خون میں لت پت تھیں۔ نور گڈے سے اتر کر بھاگ کر آیا اور اس نے اپنا شملے دار صافہ سر سے اتار کر چہرے پہ رکھ لیا جیسے سسکیاں لے لے کے رو رہا ہو۔ سب نے دیکھا کہ وہاں ایک گہرا گڑھا تھا جس میں مہدی حسین کے گڈے کا پہیہ آ گیا تھا۔ مہدی کے گاؤں کے لوگوں نے نور کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور ایک نے لرزتے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر کہا "نور، تو مہدی کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے گڈا پرے کیوں لے گیا تھا؟" —— ایک اور آواز آئی —— "نورے، یہ خون تمہیں ہضم نہیں ہو گا۔ تجھے معلوم تھا کہ یہاں گڑھا ہے۔"

"جو اللہ کو منظور تھا، بھائیو!" نور نے اداس اور ملتجی لہجے میں کہا "میرا بیل بے قابو ہو کر پرے چلا گیا تھا۔ اپنی اپنی تقدیر ہے بھائیو۔ کہو تو میں بھی اپنے گڈے تلے آ کر مر جاؤں۔"

اس میدان میں جہاں نعرے گونج رہے تھے اور ڈھول بج رہے تھے مردوں کی ہچکیاں اور عورتوں کے بین گونجنے لگے، بیلوں کی گھنٹیوں اور گھنگھروؤں کی اداس اداس جھنکار نوحہ کرنے لگی۔ شام کو دونوں گاؤں نے مل کر مہدی حسین اور اس کے ساتھ مرنے والے کا جنازہ پڑھا۔ قبرستان میں ایک اور آواز سنائی دی —— "نور سنگھ داس طرح بدلہ نہیں لیا کرتے

تجھے معلوم تھا وہاں گڑھا ہے، ورنہ تم گڈا پرے کرتے، مہدی کو بھی خبردار کر دیتے۔"

"نورے!" ایک اور دشمن سی آواز آئی۔ "تو نے باپ کے خون کا بدلہ لے لیا ہے۔ اب ہماری باری ہے۔"

نور نے پیر چن چراغ شاہ کے مرحوم باپ کے روضے کی قسم کھا کر کہہ دیا:
"مجھے معلوم نہ تھا وہاں گڑھا ہے۔ میں نے انتقام نہیں لیا۔ جس روز انتقام لوں گا للکار کر لوں گا۔"

لیکن نور نے جھوٹی قسم کھائی تھی۔ اُس نے انتقام لے لیا تھا۔ جس روز بار والے گاؤں میں گڈوں کی دوڑ کا دن مقرر کر کے آیا تھا۔ اسی رات، جب سارا گاؤں سو گیا تھا وہ کدال لیے میدان میں چلا گیا تھا اور اس نے اطمینان سے یہ گڑھا کھودا تھا، اس میں سوکھی جھاڑیاں رکھ کر کاریگری سے اوپر مٹی بچھائی تھی اور مٹی اِدھر اُدھر بکھیر کر گندم کے خشک پودے اور جھاڑیاں رکھ دی تھیں۔ دوڑ میں ابھی تین روز باقی تھے۔ ان تین دنوں میں سورج نے تازہ مٹی کو خشک کر کے کھیتوں کے رنگ سے ملا دیا۔ دوڑ کے دوران نور نے بڑی ہوشیاری سے اپنا گڈا مہدی حسین کے قریب رکھا تھا اور مہدی کے پیچھے والے گڈے کو اُسی کے پیچھے ہی رہنے دیا تھا۔ اس نے گڑھے پر نشانی رکھی ہوئی تھی جو قریب آئی تو نور نے اپنا گڈا ایک طرف کر لیا تھا ۔۔۔۔ اس نے اپنے باپ کے خون کا انتقام قاتل کے بیٹے سے لے لیا تھا۔

استادی سے دو آدمی قتل کر دینے کے باوجود نور کی نظروں تلے اس کے باپ کی لاش تڑپتی ہی رہی۔ اُس کے سینے میں جو آگ بھڑک رہی تھی وہ صرف ایک روز تک ٹھنڈی رہی۔ جب مہدی حسین اور اس کے ساتھی کی لاشیں قبروں میں اُتر کر نُور کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو اس کی نظروں کے سامنے اس کے اپنے باپ کی خونچکاں لاش تڑپنے لگی۔ سینے کی آگ پھر بھڑک اٹھی۔ بچپن کی جو خون آلود یادیں ذہن میں جم گئی تھیں وہ دو خون کر کے بھی نہ ڈھل سکیں۔ اس سے پہلے وہ دشمنوں کے دو بیل اور ایک بھینس زہر دے کر مار چکا تھا۔ ان کے کھلیان جلا چکا تھا۔ پھر بھی وہ بے چین تھا۔ وہ شفقت اور پیار کی محرومی میں پل کے جوان ہوا تھا اور اس کے ذہن میں پیار کی جگہ باپ کی خون آلود لاش کا بسیرا تھا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ دونوں گاؤں کی دشمنی اور گہری ہو گئی۔ پہلے راضی نامے ٹوٹا کرتے تھے، اب رشتے ناطے بھی ٹوٹ گئے۔ اب نہ اِدھر سے بارات جاتی تھی، نہ اُدھر سے ڈولی آتی تھی۔ گاؤں کی شادیاں گاؤں میں ہی ہو جاتی تھیں۔ دونوں گاؤں میں اب دو دو چوکیدار رات بھر جاگتے تھے۔

نور اب گاؤں کا ہیرو بن گیا اور لوگ اُسے گاؤں کی آبرو کا رکھوالا کہنے لگے۔

نور شام کے بعد گاؤں سے غائب رہنے لگا۔ کسی کو معلوم نہ تھا وہ کہاں جاتا ہے۔ پھر اس کے متعلق مشہور ہو گیا کہ وہ پار والے گاؤں کے

چوہدری کرم دین کی بیٹی، زینت، کو اٹھا لانے کی فکر میں ہے۔ جو کسی حد تک ٹھیک بھی تھا۔ کیونکہ گاؤں میں اب سبھی اس کے پیچھے پڑ گئے تھے کہ وہ شادی کر لے اور اس کا ایک ہی جواب تھا۔ ”یار وا لیے چوہدری کرم دین کی بیٹی زینت کو اٹھا لاؤں گا، زبردستی نکاح پڑھواؤں گا اور تیسرے مہینے طلاق دے کر گاؤں سے نکال دوں گا۔“

اس دوران مہراں نے کئی بار اس کی راہ روکی اور ایک بار نورے کو کہہ ہی دیا۔ ”نورا! بیاہ کروں گی تو تیرے ساتھ کروں گی، کسی اور نام کے ساتھ رجسٹر پر انگوٹھا نہیں لگاؤں گی، نہیں تو جس روز تیری بارات جائے گی اس روز میرا جنازہ اُٹھے گا۔“

نور مسکرا دیا۔ مہراں کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اس نے جذبات سے بے قابو ہو کر نور کا گریبان پکڑ لیا اور مٹھیاں بھینچ کر بولی: ”سچ بتا نورے! تیرے سینے میں دل ہے یا پتھر؟“

”جو کچھ تھا، دے آیا ہوں۔“ نور نے متانت سے کہا

”کس چڑیل کو؟“ مہراں نے اُس کا گریبان چھوڑ کر یوں پوچھا جیسے صدمے سے ہچکی لے رہی ہو۔

”مہراں! وہ چڑیل ہی ہے۔“ نور نے دُکھی ہوئی سی آہ لے کر کہا: ”دیکھتا ہوں وہ مجھے کھاتی ہے یا میں اُسے کھاتا ہوں۔“ مہراں کا سر جھک گیا۔ نور نے اس کی ٹھوڑی تھام کر کہا ”چند روز اور انتظار کر لے مہراں! نظر تو یہی آتا ہے کہ میرا گھر تو ہی بسائے گی۔“ اور نور مہراں کے دل میں

ایک معمہ ڈال کر کھیتے کی طرف چل دیا۔

ایک سال گزر گیا۔

پار والے گاؤں سے راتوں کو ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیوں کے گیت سنائی دینے لگے اور نور پر خاموشی چھاتی چلی گئی۔ پھر ایک روز اُس گاؤں سے گولوں کے دھماکے اور ڈھول کے ساتھ باجے بھی بجتے سنائی دیئے۔ نور جو شام کو غائب ہو جایا کرتا تھا اُس شام کھانا کھائے بغیر لیٹ گیا اور اندر سے دروازہ بند لیا۔۔۔ اس شام پار والے چوہدری کرم دین کی بیٹی زینت کی شادی اسی گاؤں کے ایک آدمی سے ہو گئی تھی ۔۔۔ اسی زینت کو نور اٹھانا چاہتا تھا، لیکن وہ نور کے انتقام کا نشانہ بننے سے صاف بچ گئی تھی۔

ایک وہ وقت تھا کہ مہراں نور کی راہ روکا کرتی تھی اور اب یہ وقت آیا کہ زینت کی شادی کے تیسرے روز نور نے مہراں کو راہ میں روک لیا اور اداس سی مسکراہٹ سے کہا ۔۔۔ "مہراں! کہو، تمھارے ماں باپ سے بات کروں؟"

اور اُسی چاند کی سترھویں رات مہراں کی ڈولی نور کے آنگن میں آن اُتری۔ وہ رات بڑی حسین تھی۔ سارا گھر اُن کا اپنا تھا۔ مہراں کی نہ ساس تھی نہ سسر، نہ نند، نہ جیٹھ۔ بس اللہ کا نام تھا اور مہراں نور کی پوجا کر رہی تھی۔

پھر عروسی کی شب گذر گئی، پچیس برس گذر گئے۔

نور اور مہراں اکیلے ہی رہے، نہ بچی نہ بچہ۔

نور کی جوانی اب گئے وقت کا قصہ کہانی بن گئی۔ نور آج وہ گبھرو نور نہیں

نور چاچا بن گیا تھا۔ عمر کے پچاس برس بیت گئے تھے۔ سر اور مونچھوں کے بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ چہرے پر جوانی کی جو رونق تھی اُس پر باریک باریک لکیروں کا جال بچھنے لگا تھا۔ مہراں نے جوانی نور چاچا کی خدمت میں گزار دی یا نقاہوں اور مزاروں پر اولاد کے لیے نذر نیاز دیتے گذر گئی، پر مہراں کی گود ہری نہ ہوئی لیکن نور چاچا کو چنداں افسوس نہ تھا۔ گاؤں کا ہر بچہ اس کا اپنا ہی بچہ تھا۔ وہ بوڑھا ہو کر گاؤں کے بچوں میں گھل مل گیا تھا اور انھیں اپنی جوانی کے قصّے سنایا کرتا تھا۔ وہ بچوں میں وہی زہر گھول رہا تھا جو بڑے اس کے سینے میں بھر گئے تھے۔ لیکن نور چاچا اُن بزرگوں سے مختلف تھا۔ وہ نوجوانوں کو دشمن کے آمنے سامنے آکر لڑنے سے روکا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ دشمن کو استادی سے مارو۔ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

مہدی حسین کے استادانہ قتل کے بعد اُس نے زندگی کے پچیس برس پارٹیوں پر زمین دوز حملوں میں گزار دیئے۔ اُس نے یہاں تک کیا تھا کہ دس برس گزرے قریب کے ایک اور گاؤں کا ایک آدمی جو ہٹر کے قریب ایسے پُراسرار طریقے سے قتل ہو گیا تھا کہ مہینہ بھر قاتل کا سراغ نہ ملا تھا۔ نور چاچا نے جھوٹی شہادتیں اور ثبوت فراہم کر کے پار والے گاؤں کے ایک بے گناہ آدمی کو پکڑوا کر عمر قید دلوا دی تھی۔ نور چاچا نے بڑی ہوشیاری اور دانشمندی سے کڑیاں ملائی تھیں، جنھیں قانون نے بھی تسلیم کر لیا تھا۔

چند ہی برس گذرے ایک رات نور چاچا شہر سے لوٹ رہا تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا، جب وہ گاؤں میں داخل ہوا۔ ہر سو اندھیرا سکوت تھا۔ اُسے

ایک آدمی کا سایہ سا نظر آیا جو دبے پاؤں گلی میں دیوار کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ نور چاچا اُسے دیکھنے کے لیے رُک گیا پھر دبے پاؤں اُس کے تعاقب میں چل پڑا۔ گرمیوں کا موسم تھا اور بعض گھروں کے ڈھور ڈنگر باہر کی کھرلیوں پہ بندھے تھے۔ وہ آدمی ایک کھُرلی کی طرف بڑھا تو نور چاچا کو اپنی جوانی کی ایک رات یاد آ گئی۔ وہ بھی پار والے گاؤں اِسی طرح آدھی رات دبے پاؤں گیا تھا اور ایک کھُرلی میں زہر کی پُڑیا بکھیر آیا تھا۔

نورچاچا دبے پاؤں تیزی سے بڑھا اور پیچھے سے اُس آدمی کی گردن بازو کے گھیرے میں لے کر بازو کا شکنجہ دبا دیا۔ اُس آدمی کے ہاتھ سے کوئی چیز زمین پہ گری۔ نورچاچا نے بازو کا شکنجہ اور تنگ کر کے اُس آدمی کے پیٹ میں زور زور سے گھونسے مارے۔ ذرا دیر بعد بازو ڈھیلا کیا تو وہ آدمی لڑھک کر گر پڑا۔ نورچاچا نے نبضیں دیکھیں، پھر دل پہ ہاتھ رکھا، وہ مر چکا تھا۔ نورچاچا نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھ سے جو چیز گری تھی وہ ایک پُڑیا تھی۔ ویسی ہی پُڑیا جیسی وہ برسوں گذرے، پار والے گاؤں کی ایک کھُرلی میں ڈال آیا تھا۔

وہ آدمی پار والے گاؤں سے آیا تھا۔ نورچاچا نے اُس کی لاش کو کندھے پہ ڈالا اور گاؤں سے باہر نکل گیا۔ رات کی گاڑی گذرنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ ریلوے لائن کوس بھر دُور تھی۔ نورچاچا لاش اُٹھائے تیزی سے چلا جا رہا تھا۔

دوسری صبح ریلوے لائن پہ لوگوں کا ہجوم جمع تھا اور ہر سو یہ خبر پھیل

گئی کہ پار والے گاؤں کا ایک آدمی گاڑی تلے آکر کٹ گیا ہے۔

ایسے بیشمار ہی قصے تھے جواب، عمر کے بچاسویں برس، نور چاچا گاؤں کے بچوں کو سنایا کرتا تھا۔ اس کی فتح کا قابلِ داد پہلو تو یہ تھا کہ اُس نے ڈھور ڈنگر بھی مارے تھے، کھلیان بھی جلائے تھے، قتل بھی کیے تھے اور پار والوں کو رہ رہ کے ایسے ڈنک مارے تھے کہ وہ رو پیٹ کر چپ ہو رہے تھے۔ لیکن پولیس میں رپورٹ درج کرانے کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے نہ پنچوں میں بیٹھ کے کوئی جواز پیش کر سکتے تھے۔ پار والوں نے جن چراغ شاہ سے بڑے بڑے زوردار اور تباہ کن تعویذ لکھوائے تھے جن میں کچھ نور چاچا کے کھیتوں میں دبائے گئے لیکن جن چراغ شاہ کی کرامات نور چاچا کی استادی کے سامنے بے اثر رہی۔

جن چراغ شاہ کے باپ کے مزار اور دونوں گاؤں کے مشترک قبرستان کے درمیان پیڑوں کا گھنا جھرمٹ تھا۔ جھرمٹ تلے جھاڑیاں اور گھاس تھی۔ قبرستان سے مزار کی طرف جاؤ تو جھرمٹ کا چکر کاٹ کے جانا پڑتا تھا۔ جھرمٹ گھنا بھی تھا وسیع بھی۔ اندر سے گذرنا آسان نہ تھا اور اس وجہ سے کوئی جھرمٹ کے اندر سے نہیں گذرا کرتا تھا کہ وہاں چڑیلیں رہتی تھیں۔ گاؤں کے اکثر لوگ جن چراغ کی گدی کی قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ انھوں نے وہاں چڑیلوں کو دیکھا ہے۔ ایک روز نور چاچا وہاں سے گزر رہا تھا تو ٹھٹھک کے ایک پیڑ کے تنے کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اُسے جو منظر دکھائی دیا اس سے اس کا پسینہ نکل آیا۔ اُسے یوں لگا جیسے پار والے اُس کی

لاش پہ ڈھول پیٹ رہے ہیں اور اس کی ناک کتّے چاٹ رہے ہیں۔

اُس نے دیکھا کہ پیڑوں کے جھرمٹ تلے، جھاڑیوں کی اوٹ میں اُس کے گاؤں کی ایک کنواری لڑکی، رضیہ، پار والے گاؤں کے ایک جواں سال آدمی کے ساتھ بیٹھی ہنس کھیل رہی تھی۔ رضیہ کا باپ فوج میں جمعدار تھا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ چند مہینے کراچی بھی رہ آئی تھی اور وہ آدمی فوج میں لیفٹیننٹ تھا۔ اور ان دنوں چھٹی آیا ہوا تھا۔ نُور چاچا کو چکر سا آیا اور اُس نے معاً سوچا کہ پہلے جا کر رضیہ کے باپ کو قتل کر دے، جس نے لڑکی کو شہر کی ہوا لگا کر اس قدر بے حیا بنا دیا تھا۔

نُور چاچا کے ہاتھ میں بڑی خوبصورت چمکدار پھل والی کلہاڑی تھی وہ دیکھ رہا تھا کہ گاؤں کی جس آبرو کا وہ رکھوالا تھا وہ دشمنوں کے ایک جواں سال آدمی کے قدموں میں پڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور وہ دونوں اس کی موجودگی سے بے خبر رہے۔

جوانیاں دنیا سے بے خبر ہو کے ایک دوسرے میں گھل مل گئی تھیں۔ نُور چاچا اس آدمی کو خوب جانتا تھا۔ اس کا نام انور تھا۔ پچیس چھبیس برس کا وہ خوبصورت نوجوان چوہدری کرم دین کی اُسی لڑکی زینت کا بیٹا تھا جسے نُور چاچا جوانی میں اغوا کرنا چاہتا تھا، لیکن نور جو آسمان سے تارے بھی توڑ لاتا تھا اسے اغوا نہ کر سکا تھا۔ آج وہ بھی پچاس برس کی بڑھیا ہو چکی تھی اور اس کا بیٹا انور، خوبرو، نوجوان، فوج میں لیفٹیننٹ تھا۔

نُور چاچا، انور اور رضیہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ دونوں اُس کی

طرف پیٹھ کیے بیٹھے تھے۔ وہ اُن کی طرف بڑھا تو رضیہ نے اپنا سر انور کے کندھے پہ پھینک دیا اور انور نے اس کے بالوں میں انگلیاں اُلجھا لیں۔ نُور چاچا رُک گیا۔ اس کا سر آپ ہی آپ جُھک گیا اور طویل آہ بھر کر دبے پاؤں پیچھے کی طرف چل پڑا۔ وہ اسی طرح سر جھکاتے گاؤں میں داخل ہوا، گھر گیا اور لیٹ گیا۔ وہ چھت کو گھور رہا تھا۔ اس پر ایسی خاموشی کبھی طاری نہیں ہوئی تھی۔ اس کا سر کبھی یوں نہیں جھکا تھا۔ مہراں نے بہت پوچھا لیکن اس نے اداس سی مسکراہٹ سے اُسے ٹال دیا۔ صرف ایک بار کہا:

مہراں! بڈھا ہو گیا ہوں، اب تھک جاتا ہوں۔"

وہ بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ اُسے خیال آیا کہ اس نے دونوں کو قتل کیوں نہ کر دیا لیکن یہ خیال بھی آ گیا کہ اچھا ہوا وہ وہاں سے کھسک آیا اور انھیں قتل نہ کر بیٹھا۔ وہ مطمئن بھی تھا، بے قرار بھی اور اطمینان اور بیقراری کا تصادم اسے بے حال کر رہا تھا۔

اسی رات کے دوسرے پہر نُور چاچا کے دروازے پہ دستک ہوئی۔ اس نے باہر آ کر دروازہ کھولا۔ باہر پھٹے پرانے کمبل میں لپٹا ہوا ایک آدمی کھڑا تھا۔ وہ بغیر سلام کیے اندر آ گیا اور بولا: "پردیسی ہوں، بڑی دُور سے آیا ہوں، صبح چلا جاؤں گا۔"

نُور چاچا اُسے اندر لے آیا۔ جب اُس نے لالٹین جلائی تو اس آدمی نے کمبل اتار پھینکا اور بولا — "نور چاچا! چاچا ہو تو مجھے بھی قتل کر دو، خالی ہاتھ تمھارے گاؤں آیا ہوں۔"

دوپارہ والے گاؤں کا انور تھا۔ مہرآں بھی جاگ اٹھی تھی اور حیرت زدہ نظروں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"ایک بات کرنے آیا ہوں چاچا!" انور نے کہا۔

نورچاچا نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور گہری سانس لے کر آہستہ سے بولا: "بیٹھ جاؤ۔"

"میں جانتا ہوں ہمارے گاؤں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔" انور نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا: "اور میں جانتا ہوں کہ تمھارے گاؤں میں لیموں چوروں کی طرح آکر زندہ نکل جانا ممکن نہیں۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ گاؤں میں تم واحد آدمی ہو جو صحیح معنوں میں مرد ہو۔ تمھارا دل گردہ دُور دُور مشہور ہے اور نورچاچا! جو مرد ہو وہ گھر آئے مہمان کو بے آبرو نہیں کیا کرتا۔"

نورچاچا عجیب طرح ہنس دیا۔ خالی خالی لہجے میں بولا: "کیوں تم لوگ اس قدر وحشی سمجھتے ہو؟ میں جانتا ہوں تم فوج میں لیفٹیننٹ بن گئے ہو لیکن ہم کوئی ایسے گئے گذرے تو نہیں۔"

"مہدی حسین اور افضل کو تم نے قتل کیا تھا چاچا!" انور نے مسکرا کر کہا۔ "شباب خاں کا گلا گھونٹ کر ریلوے لائن پر تم نے پھینکا تھا....!"

"تم تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، انور!" نورچاچا نے اُسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: "تمھیں کہانیاں سنانے والوں نے شاید یہ نہیں بتایا کہ مجھے مہدی کے باپ نے اس وقت یتیم کیا تھا جس

وقت میں ننھا سا بچّہ تھا..... خیر، یہ قصّے بڑے لمبے ہیں، بیٹا!" اُس نے گھر آئے دشمن کو سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے پوچھا: "کہو، تم میرے گھر کیوں آئے ہو؟"

"میں تمھیں طعنے دینے نہیں آیا، چاچا!" انور نے کہا: "تم وحشی ہو تو ہمارے گاؤں والے بھی درندے ہیں، خونخوار وہ تم سے اچھے تو نہیں۔ میں اپنے گاؤں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ صرف اتنا کہنے آیا ہوں کہ ہمارے گاؤں کے رشتے ناطے کلہاڑیوں، برچھیوں اور ٹوکوں سے کٹ گئے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ایک وہ زمانہ تھا جب دونوں گاؤں سے براتیں اور ڈولیاں آتی جاتی تھیں۔"

"خون خرابے اس وقت بھی ہوتے تھے۔" مہراں بول اٹھی: "سہاگنوں کے سہاگ اُجڑ جاتے تھے اور....."

نور چاچا نے ہاتھ کے اشارے سے مہراں کو چُپ کرا دیا اور بولا: "تم بات کیے جاؤ بیٹا! لیکن ایک بات بتا دوں۔ میں راضی نامے کی بات نہیں سنوں گا۔ راضی نامے بہت ہوئے تھے، اب نہیں ہوں گے۔ تم پڑھ لکھ کر عزت غیرت شہروں میں ڈبو آئے ہو۔ لیکن ہم لوگ اب بھی یہاں ناک کی قدر خوب جانتے ہیں۔"

"نہیں نہیں چاچا!" انور نے کہا: "میں تم پر یہ الزام دھرنے نہیں آیا، نہ اپنے بزرگوں کی وکالت کروں گا۔ میں کہہ رہا تھا کہ....." وہ کہتے کہتے رک گیا اور مہراں کی طرف دیکھ کر ملتجی لہجے میں بولا: "چاچی جی!

اگر تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ تو.....“ نور چاچا نے مہراں کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا، تو انور نے آہ بھر کر کہا: ”ہمارے رشتے ناطے ٹوٹ چکے ہیں، نور چاچا! لیکن دلوں کے رشتے ٹوکوں سے نہیں کاٹے جاتے.....“ انور کے لہجے میں جذباتیت کا رنگ نکھر آیا اور اس نے رنجیدہ سی آہ بھر کر کہا ”میں تم سے بھیک مانگنے آیا ہوں چاچا!..... پتہ نہیں تم نے جوانی میں کسی کو دل دیا تھا یا نہیں ؟ پتہ نہیں تم نے کسی سوہنی کو اپنی ران کے قتلے بھون کے کھلائے تھے یا نہیں؟ کوئی سوہنی تیرے لیے کبھی چناب کا سینہ چیر کر تیرے پاس پہنچی تھی یا نہیں..... ؟ معلوم نہیں چاچا! تم نے جوگی بن کے اپنے کان کبھی چھدوائے تھے یا نہیں اور در در پہ صدائیں لگائی تھیں یا نہیں؟..... تیرا دل مرجھا گیا ہے، نور چاچا! تجھے شاید دل کی دھڑکنیں یاد نہیں رہی ہوں گی.....“

رات کا اندھیرا بہت گہرا تھا اور سکوت اس سے بھی زیادہ گہرا۔ انور کی جذبات بھری باتوں نے نور چاچا پر کچھ اور کیفیت طاری کر دی۔ عین اس وقت دور کہیں رات کے سکوت سے کسی کی بڑی ہی سریلی اور بڑی ہی پُرسوز لَے سنائی دی۔ جانے کون شب کی خاموش تیرگی میں بَیت الاپتا جا رہا تھا ــــ

رے رات کالی تانگ یار دالی دل وچ شوق بلن دا نیر کھڑکے
اک در بند دوجا دربان دشمن جیہیں در کھولاں در بے پیر کھڑکے
ستے ہوئے دربان نوں ویکھ کے تے پیریں چلاتے پیریں بجبر کھڑکے

سائیاں جنہاں نوں غم اسے یار والا سنے ہڈیاں انہاں سر بر کھڑکے

ادھر انور کی باتیں عشق کا سحر جگا رہی تھیں، اُدھر رات کی تاریکی سے اُبھرتے ہوئے منزلم بول طلسم طاری کر رہے تھے۔ نور چاچا کے جسم نے جھرجھری لی۔

"میں نے وہ سوہنی دیکھی تھی، انور!" نور چاچا یوں بولا جیسے خواب میں بڑبڑا رہا ہو۔ اس کی آنکھیں بڑی دُور جھانک رہی تھیں۔ "وہ مجھے چناب کی لہروں پر نہیں، جلتے کھلیانوں اور خون کے بہتے دریا میں تیر کے ملنے آیا کرتی تھی.....۔" نور چاچا کی آواز دب گئی۔

"آج ایک اور سوہنی بھڑکتے شعلوں میں تیر کے میرے پاس آتی ہے نور چاچا!" انور نے جذباتی لہجہ میں کہا: "اور آج رات میں بھی ان شعلوں میں کود کر آیا ہوں۔ انگ انگ جل رہا ہے، چاچا!"

نور چاچا کے چہرے کا تاثر یکسر بدل چکا تھا اور اس کی آنکھیں بے چینی سے خلاؤں میں بھٹکنے لگی تھیں، جیسے یادیں اور تصور اسے بڑھاپے سے اٹھا کر انور کی عمر میں لے گئے ہوں۔

"انور!" نور چاچا نے اپنائیت سے کہا: "تمہیں رضیہ کا رشتہ نہیں مل سکے گا۔"

انور نے چونک کے کہا: "تم نے کیسے جانا کہ میں رضیہ کا رشتہ مانگنے آیا ہوں؟"

"میں کیا نہیں جانتا، بیٹے!" نور چاچا نے کہا: "لیکن میرے گاؤں کا رشتہ

تیرے گاؤں نہیں جائے گا۔ کوئی صورت ہی نہیں۔"

"تم چاہو تو اس کے ماں باپ راضی ہو جائیں گے۔ انور نے کہا۔

"نہیں!" نورچاچا نے سر ہلا کر کہا۔ "میں اس گاؤں کی آبرو کا رکھوالا ہوں، میں کس طرح کہہ دوں کہ آبرو دشمن کے حوالے کر دو۔ میں بھی ہاں کر لوں؟ یہ ممکن نہیں۔"

"رضیہ میرے سامنے ساتھ نکل جانے کو تیار ہے۔" انور نے کہہ تو دیا لیکن وہ لرز اُٹھا۔ اسے معلوم تھا کہ نورچاچا اپنی ناک پر اتنی غلیظ مکھی نہیں بیٹھنے دے گا۔

"تو نکال لے جاؤ۔" نورچاچا نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن تمہارے گاؤں سے ایک تنکا بھی اٹھا کے جانا آسان تو نہیں۔" انور نے کہا: "اگر رضیہ کو نکال لے جانا آسان ہوتا تو میں تمہارے پاس آتا ہی کیوں؟ مجھے اپنا ڈر نہیں چاچا! پکڑے گئے تو تم لوگ رضیہ کی بوٹی بوٹی کر دو گے اور تم اپنا بڑھاپا میرے خاندان کا بچّہ بچّہ زمین کے نیچے نیچے آ کر ختم کرنے میں گذار دو گے۔"

"تم نے زینت سے بات کی ہے؟" نورچاچا نے پوچھا۔

"زینت؟" انور نے پوچھا: "یعنی اپنی ماں سے؟"

"ہاں، ہاں،" نورچاچا بولا: "تم زینت کے بیٹے ہو، نا؟"

"ہاں چاچا!"، انور نے کہا "میری ماں میری راز داں ہے۔ سچّی بات بتاؤں چاچا، مجھ سے ماں نے ہی کہا تھا کہ چوری چھپے نورچاچا کے پاس

چلے جاؤ۔ وہ نہ مانے تو اسے کہنا کہ زینت نے کہا ہے، یہ کام ضرور کرنا ہے۔"

نور چاچا کا سر جھک گیا۔ وہ آہستہ سے اٹھا، دروازے تک گیا اور سر جھکائے لوٹ آیا۔ پھر آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ رات کے سکوت کو گیدڑوں کی بھیانک چیخوں نے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ جب گیدڑوں کی چیخ چنگھاڑ بند ہوئی تو کتے یکبارگی بھونک اُٹھے۔ نور چاچا سر تا پا کانپ اٹھا۔ دھیمی سی آواز میں بولا: "آؤ چلیں۔"

تھوڑی دیر بعد مہراں اس کمرے میں آئی تو کمرہ خالی تھا اس نے آہ بھری اور زیرِ لب بولی: "آہ یہ خون بھی نورے کے نام لکھا تھا۔" وہ جانتی تھی کہ نورے نے پار دا لے کسی انسان کو کبھی نہیں بخشا۔

بہت دیر بعد نور چاچا آ گیا۔ مہراں نے فوراً پوچھا: "لاش کہاں پھینک آئے ہو؟"

نور چاچا چپ چاپ کمرے میں ٹہلنے لگا اور افسردہ سے لہجے میں بولا: "نہیں مہراں میں اُسے کنٹھے سے پار چھوڑ آیا ہوں ..... وہ میرے ہاتھ سے زندہ نکل گیا ہے۔ میں اسے خود ہی چھوڑ آیا ہوں ....." نور چاچا رنجیدہ تھا اور ہنس بھی دیا۔ سوگوار سی ہنسی۔ حیرت زدہ مہراں کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا: "تم حیران ہو رہی ہو، لیکن مہراں! یہ لڑکا آج میرے سامنے وہی خواب بکھیر گیا ہے جو میں نے کبھی دیکھا تھا۔ بھولی بسری باتیں یاد کرا گیا ہے۔ تمہیں یاد ہے مہراں جب تم نے جوانی میں مجھے راہ میں روکا تھا تو میں نے کہا تھا کہ میں دل کسی کو دے چکا ہوں۔ تم نے بہت پوچھا تھا لیکن

لیکن میں نے نہیں بتایا تھا۔ پھر تم شادی کے بعد بھی پوچھتی رہی تھیں کہ وہ کون ہے؟ لیکن میں نے یہ راز اپنے سینے ہی میں رہنے دیا تھا..... آ، مہراں! آج تمھیں ایک کہانی سناؤں۔"

مہراں حیران تھی کہ نورے چاچا کو کیا ہو گیا ہے۔ اسے اُس نے اس کیفیت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

نورے چاچا پلنگ پر بیٹھ گیا اور جذبات سے رُندھی ہوئی آواز میں بولا "تم نے شاید سنا ہو گا کہ میں نے جوانی میں قسم کھائی تھی کہ میں پار والے چوہدری کرم دین کی بیٹی زینت، کو اٹھا لاؤں گا۔ اس سے نکاح پڑھواؤں گا، اور طلاق دے کر گھر سے نکال دوں گا۔ میں اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینا چاہتا تھا، مہراں!..... میں کئی راتیں پار والے گاؤں چوروں کی طرح جاتا رہا اور اندھیرے میں چوہدری کرم دین کے گھر کے چکر کاٹ کر اس کی بیٹی کو اٹھا لانے کی راہیں ڈھونڈتا رہا۔ لیکن وہاں چوکیدار بھی تھے اور کتے بھی۔"

نورے چاچا نے آہ بھری اور آنکھیں سکیڑ کر بولا: "ایک شام میں گاؤں سے جلدی نکل گیا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ میں پیڑوں کے جھنڈ سے گزر رہا تھا کہ مجھے چوہدری کرم دین کی وہی بیٹی اکیلی آتی دکھائی دی جسے میں راتوں کے اندھیرے میں ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ وہ مزار پہ سلام کر کے آ رہی تھی..... آہ، زینت! وہ بہت حسین لڑکی تھی۔ تمھیں اس کی جوانی اور حسین یاد ہے، نا مہراں؟ اب تو وہ بوڑھی ہو گئی ہے، لیکن مجھے اسی طرح نظر آ رہی ہے، جس طرح پیڑوں کے جھنڈ تلے دیکھی تھی۔ میں نے اسے زبردستی

اٹھالانے کی جو قسم کھائی تھی اُسے دیکھ کر ٹوٹنے لگی لیکن میں سنبھل گیا اور اسے روک کر کہا: "میں تمہیں اٹھا لے جاؤں گا زینت!" اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آگئی اور پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولی: "سچ کہتے ہو نور؟ قسم کھاؤ تم مجھے اٹھا لے جاؤ گے!" اس نے میرے ہاتھ تھام لیے اور اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔ "اللہ قسم نور! میں ابھی ابھی شاہ جی کے مزار پر منت مان کر آئی ہوں کہ نور میرے ماں باپ کے ہاں رشتہ مانگنے آئے اور وہ ہاں کر دیں؛ مہراں! میں نے کلہاڑی پھینک کر اسے سینے سے لگا لیا، اور زینت نے اپنا لال انگارہ گال اس قدر زور سے میرے ہونٹوں پر رکھ دیا کہ میری قسمیں ٹوٹ گئیں۔ جانے ہم کتنی دیر وہیں بیٹھے رہے۔ اس نے کہا، "میں مرد کی بچی ہوں اور کسی مرد سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ جو حوصلہ تم میں ہے وہ دونوں گاؤں کے کسی مرد میں نہیں۔"

مہراں کے آنسو جاری ہو گئے۔

نور پلنگ پر مہراں کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا: "پھر ہم پیڑوں کے اسی گھنیرے جھرمٹ تلے ملتے رہے۔ وہ مجھے اپنے ماں باپ کے پاس جا کر رشتہ مانگنے پر مجبور کیا کرتی لیکن میں نہ اسے دل سے اتار سکا نہ اس سے ملنے سے باز رہ سکا اور اس کے ماں باپ کے پاس رشتہ مانگنے بھی نہ جا سکا۔ باپ کے قاتلوں کے گاؤں میں غیرت والے بھیک مانگنے نہیں جایا کرتے، مہراں!......

"پھر وہ روز آیا کہ زینت کو کھیڑے اٹھا لے گئے۔ شادی سے چند راتیں

پہلے وہ مجھے ملی اور کہنے لگی: "ہماری منزلیں جدا ہو گئی ہیں۔ لیکن نور! آ قسم کھائیں کہ ہم اپنے بیٹے بیٹیوں کو ایک دوسرے سے بیاہیں گے، اور میں نے سب کدورتیں بھول کر مولا علیؑ مشکل کشا اور پنج تن پاک کی قسم کھا لی کہ میں اپنی پہلی بیٹی تمھارے پہلے بیٹے کو دوں گا۔"

نور چاچا نے چپ چاپ بیٹھی مہراں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: "لیکن میرے اولاد نہ ہوئی، اور آج زینت کا بیٹا مجھے میری قسم یاد دلا گیا ہے!"

"اوہ" مہراں نے چونک کر پوچھا: "انور زینت کا بیٹا ہے نا! انور کو معلوم ہے کہ تم نے قسم کھائی تھی؟"

"نہیں"، نور چاچا نے کہا: "یہ راز خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ آج صرف تمھیں سنا رہا ہوں۔ انور نے کہا تھا کہ مجھے ماں نے کہا ہے نور کے پاس جاؤ اور اُسے کہو کہ رضیہ کا رشتہ دلا دے، لیکن مہراں، انور کو معلوم نہیں کہ جس اوٹ میں اس کی ماں مجھے ملا کرتی تھی وہیں آج وہ میرے گاؤں کی سے آکر ملتا ہے۔ اپنی کوئی بیٹی نہیں، پر رضیہ، اپنے گاؤں کی بیٹی تو ہے! میں نے اسے گود لیا ہے، اسے کہانیاں سنائی ہیں، میں شہر سے اس کے لیے ریوڑیاں لایا کرتا تھا۔ ذرا دل پہ ہاتھ رکھو، مہراں! تم نے بھی مجھ سے محبت کی ہے ......" نور چاچا چپ ہو گیا اور یک لخت بلند آواز سے بولا: مہراں، عمر کے پچاس برس انسانوں کو ڈنگ مارتے گزار دیئے ہیں۔ میں نے تمام عمر جھوٹی قسمیں کھائی ہیں، مہراں! جی میں آتی ہے ایک نیکی کر

مروں ۔ زینت کو جو قسم دی تھی وہ پوری کر دکھاؤں ۔ چھبیس برس گذرے زینت نے مجھے کہا تھا کہ مرد کی بچی ہوں اور جو حوصلہ تم میں ہے وہ کسی مرد میں نہیں ..... مہراں ! زینت یہ نہ کہے نور مرد نہیں تھا ..... کہو مہراں ! میرا ساتھ دو گی ؟"

"میں نے کب تمہارا ساتھ نہیں دیا ، نور !" مہراں نے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا : مرنا جینا تیرے ساتھ ہے ۔ بتا میں کیا کروں ؟"

"بس یہی کہ میں جو کچھ کروں اسے راز سمجھ کر اپنے سینے میں لے کر مر جانا ۔"

نور چاچا پہ خاموشی طاری ہو گئی ۔ رات گزر گئی پھر سات روز گذر گئے اور نور چاچا پہ خاموشی ہی طاری رہی ۔ اس نے دو چار مرتبہ ارادہ کیا کہ رضیہ کے ماں باپ سے کہے کہ رضیہ کا رشتہ انور کو دے دیں لیکن دونوں گاؤں کے رشتے اسی نے خود توڑے تھے ، اب اپنی ناک کی لیے حرمتی گوارا نہ تھی ۔

آٹھویں رات نور چاچا گھر سے غائب ہو گیا ۔ مہراں بہت بے چین تھی اور بے تابی سے نور کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی لیکن نور چاچا آج کی رات لوٹ آنے کے لیے نہیں گیا تھا ۔ مہراں کے سینے میں ایک زہریلا راز ڈنک مار رہا تھا ۔

دروازے پہ دستک ہوئی ۔ مہراں نے بھاگ کر دروازہ کھولا لیکن نور نہیں تھا ، رضیہ کا باپ تھا ۔ اس نے نور چاچا کے متعلق پوچھا تو مہراں نے کہا کہ کسی کام سے نکلا تھا ابھی لوٹا نہیں ۔ بس آ ہی رہا ہو گا ۔

رضیہ کا باپ اندر آگیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ مہراں اس کے دل کا حال جانتی تھی لیکن اَن جان بن کے بولی "کیوں بھائیا جی! کوئی خاص بات ہے؟"

"رضیہ کا کچھ پتہ نہیں۔" باپ نے کہا۔ "ہر جگہ تلاش کر آئے ہیں۔ شام کو کہ گئی تھی کہ مزار پہ دیا جلانے جا رہی ہوں پھر واپس نہیں آئی۔" بوڑھے باپ کے آنسو نکل آئے۔

رضیہ کا مہراں کے سوا کسی کو پتہ نہ تھا۔ نور چاچا کے بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق رضیہ شام کو ہی اس کے گھر آچھپی تھی اور تھوڑی سی دیر پہلے نور چاچا اسے کمبل میں لپیٹ کر ساتھ لے گیا تھا۔ اُدھر سے انور سوا کوس دور، ریلوے سٹیشن کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے گھر والوں کو اتنا ہی بتایا تھا کہ شہر جا رہا ہوں اور رات دیر سے لوٹوں گا۔ اس کی چھٹی ختم ہونے میں ابھی کچھ روز باقی تھے۔ وہ بہت دیر سے ریلوے سٹیشن کے اُدھر اندھیرے میں کھڑا نور چاچا اور رضیہ کا انتظار کر رہا تھا آدھی رات کو ایک مسافر گاڑی ایک آدھ منٹ کے لیے رکتی تھی۔ انور کو یقین نہیں تھا کہ نور چاچا جیسا زہری آدمی اپنے گاؤں کی بیٹی اس کے لیے اغوا کر لائے گا۔ اسے خدشہ نظر آ رہا تھا کہ نور چاچا اکیلا آئے گا اور اُسے قتل کر کے لاش ریلوے لائن پر پھینک دے گا۔ اس خدشے کے پیش نظر اس نے اپنا پستول ساتھ لے لیا تھا۔

مسافر گاڑی آنے ہی والی تھی اور ریلوے اسٹیشن کا ایک ہی قلی تھا

جو اونگھتے ہوئے سٹیشن ماسٹر کے پاس کھڑا تھا۔ انور کو اندھیرے میں قدموں کی آہٹ سنائی دی تو اس نے پستول کو مضبوطی سے پکڑ لیا لیکن نور چاچا نے کمبل میں لپٹی رضیہ اس کے سامنے لا کھڑی کی!

"انور!" نور چاچا نے رقّت آمیز لہجے میں کہا: "میں اپنی عزّت اور غیرت تیرے قدموں میں ڈالے جا رہا ہوں۔ اب اپنا وعدہ نبھاؤ، کہ تم یہ راز اپنے سینے میں لے کے مر جاؤ گے اور یہ بھی کہ تم اپنے گاؤں کبھی واپس نہیں آؤ گے"۔

اُس نے انور کو سینے سے لگا لیا اور زیرِ لب بولا "تم زینت کے بیٹے ہو"۔

"نور چاچا!" انور نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں دبایا اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دے کر کہا: "میں نے اُس روز بھی قسم کھا کر کہا تھا کہ رضیہ مل جائے تو ساری عمر گاؤں نہیں آؤں گا۔ اس گاؤں میں آ کر کروں بھی کیا؟ یہاں انسانوں کے روپ میں بدروحیں بستی ہیں اور ایک دوسری کو لہولہان کرتی رہتی ہیں۔ یہاں پیروں اور ان کے تعویذوں کی حکمرانی ہے۔ لیکن میں تلوار کا دھنی ہوں۔ میں اس دیس کا باسی نہیں۔ میری دنیا اور ہے۔ میں یہاں سے ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں"۔

"نور چاچا!" رضیہ بول پڑی: "پیر چراغ شاہ کی ڈیوڑھی کی قسم، مر جاؤں گی پر تیری ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دوں گی"۔

گاڑی ابھی دُور تھی لیکن انجن کی مدھم سی بتّی دکھائی دے رہی تھی۔ نور چاچا نے انور اور رضیہ کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور بولا: "سنبھل کے اندھیرے میں گاڑی میں بیٹھ جانا"۔ اور اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

نورے چاچا تیزی سے چل پڑا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا لیکن وہ گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ وہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ اسی سمت جا رہا تھا جس سمت گاڑی کو جانا تھا۔ وہ مسرور تھا کہ انور کی ماں سے اس نے قسم کھا کر جو وعدہ کیا تھا۔ آج پچیس برس بعد اسے نبھا رہا تھا لیکن اُسے خیال آ گیا کہ وہ گاؤں کی آبرو دشمنوں کی اولاد کے قدموں میں ڈال آیا ہے، وہ تو اس آبرو کا رکھوالا تھا۔ اس کے سینے میں بچھو ڈنک مارنے لگے۔ وہ تڑپ اٹھا اور رُک گیا۔

اس نے گھوم کر دیکھا۔ گاڑی ریلوے سٹیشن پہ رکتے ہی چلنے کی وسلیں دے رہی تھی۔ نورے چاچا بہت دُور نکل گیا تھا۔ اس نے چاہا کہ بھاگ کر رضیہ کو انور سے چھین لائے اور انور کا گلا گھونٹ کر ریلوے لائن پر پھینک دے۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں، خون آنکھوں میں چڑھ آیا اور وہ ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑا لیکن اس کے سامنے انور کا بھرا بھرا خوبصورت چہرہ آ گیا اور اسے آواز سنائی دی ”نورے چاچا! تُو نے کسی سوہنی کو کبھی اپنی ران کے تلے بھُون کے کھلائے ہیں!؟“

وہ رُک گیا اور اندھیرے میں سے ایک رنجیدہ سی نسوانی آواز ابھری ”نُور! ہماری منزلیں جدا ہو گئی ہیں۔ آؤ قسم کھائیں کہ ہمارے بیٹے بیٹیاں .....“

ایک آواز کل پرسوں ہی اس نے سنی تھی اور دوسری آواز پچیس چھبیس برس پرانی تھی، لیکن دونوں آوازیں کتنی قریب آ گئی تھیں۔ نورے چاچا

رُک گیا اور اس کی نظروں کے سامنے انور کا تصور اور زیادہ نکھر آیا۔ جب تصوّر نکھرا تو انور کی آنکھوں سے زینت جھانکنے لگی۔ زینت کے رس بھرے ہونٹ ہلنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں: "نور! انور میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ اسی جگر میں تیرے پیار کو چھپا رکھا ہے نُور!"

اور نُور سر جھکائے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ تصورات اسے درختوں کے جھنڈ میں لے گئے۔ پچیس برس گذرے ۔۔۔ بیتے لمحوں کا قافلہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ لوٹ آیا! اور نُور، زینت کو گھٹتے ہوئے بازوؤں کے گھیرے میں لے کے اونگھنے لگا۔ وہ چلتا چلا گیا جیسے خوابوں کی دنیا میں چل رہا ہو۔ زینت کے بیٹے کے سر پہ ہاتھ پھیر کر اسے زینت یاد آگئی تھی۔

گاڑی چل پڑی تھی۔ نور چاچا کو قریب ہی انجن کی وسل سنائی دی۔ تصوّروں کا طلسم ٹوٹ گیا۔ گاڑی اس کے قریب آگئی تھی۔ انجن کی چھک چھک کا چھک سے شب کی تیرگی لرز رہی تھی۔ گاڑی کے شور نے نور چاچا کو جھنجوڑ کر یاد دلایا کہ اس گاڑی میں انور اور رضیہ جا رہے ہیں۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ آگئی "انور، میری زینت کا بیٹا!" اس نے زیر لب کہا: "میں نے مردوں کی طرح اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔"

جب انجن اس کے قریب آیا تو ہیبت ناک گڑگڑاہٹ سے نور چاچا کا سینہ دہلنے لگا اور اس بھیانک شور سے اسے برسوں پرانی گڈوں کی دوڑ یاد آگئی، پھر اُسے مہدی حسین یاد آگیا اور یہ بھی یاد آیا کہ مہدی حسین اس کے باپ کے قاتل کا بیٹا تھا اور اسے یہ بھی یاد آیا کہ وہ اپنے گاؤں کی

بیٹی کا ہاتھ اپنے باپ کے قاتلوں کے گاؤں کے لڑکے کے ہاتھ میں دے آیا ہے ..... وہ تو خود گاؤں کی آبرو کا رکھوالا تھا!

انجن اور قریب آگیا۔ نور چاچا کا سینہ بڑی زور سے کپکپایا۔ جب انجن بالکل قریب آگیا تو نور چاچا کلہاڑی تان کر ریل کی پٹڑی کے وسط میں انجن کے سامنے آگیا اور تیز رفتار انجن پہ کلہاڑی کا بھرپور وار کر کے للکار کر بولا ــــ "رُک جا، میرے گاؤں کی آبرو کو یہیں اتار جا....."

گاڑی کی رفتار اور تیز ہو گئی اور نور چاچا کے جسم کے کئی ٹکڑے کرتی، بل کھاتی، انور اور رضیہ کو آغوش میں لیے، اندھیرے میں گم ہو گئی۔

○

ساونی

جوتا

ڈائی روڈ پر پہلی بلڈنگ سات منزلہ ہے۔ اس کے بعد چار منزلہ بلڈنگوں کی ایک لمبی قطار بہت دُور تک چلی گئی ہے۔ میرے دوست نے سات منزلہ بلڈنگ کے قریب رُک کر مجھ سے کہا۔ "وہ دیکھو۔ اس سات منزلہ بلڈنگ کی چار دیواری کے باہر سڑک کے کنارے جامن کے پیڑ کے نیچے جو موچی بیٹھا ہے نا۔۔

!۔۔۔۔۔

"ہاں!"

"یہ سات منزلہ بلڈنگ پانچ سال پہلے اُسی موچی کی تھی!"

"پھر۔ کیسے ——؟" میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔

یہ تم اسی موچی سے پوچھو۔ میرا دوست بولا۔

مگر اس وقت پوچھنے کا موقع نہیں تھا۔ ہم دونوں ایک انٹرویو کے لیے اسی بلڈنگ کی پانچویں منزل پر جا رہے تھے۔ جب انٹرویو سے ناکام ہو کے لوٹے تو میرا دوست تو اس قدر خفا اور بیزار ہوا دنیا سے۔ کہ اس نے میرا انتظار بھی نہیں کیا۔ اپنا انٹرویو ختم کر کے چلتا بنا۔ حالانکہ معاملہ صرف ڈیڑھ سو روپے کی نوکری کا تھا!

بلڈنگ سے نکل کر میں ٹہلتا ٹہلتا موچی کے پاس چلا گیا۔ موچی بلڈنگ کی طرف بیٹھے کسی پیڑ کے نیچے اپنا سامان رکھتے آلتی پالتی مارے بدھ کی طرح گم سم بیٹھا تھا۔ اس کا جسم کمر تک ننگا تھا۔ نیچے صرف ایک دھوتی تھی۔ سانولے سینے کے بال کھچڑی تھے۔ ٹانٹ گنجی تھی۔ ہاتھ کھردرے اور چہرہ گول مٹول تھا آنکھیں چھوٹی چھوٹی، بے حد چمکیلی اور مسکراتی ہوئی سی تھی۔ وہ اپنی ہیئت اور شخصیت سے کسی طرح سات منزلہ بلڈنگ تو کجا، سات گز زمین کا مالک بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ —— اس کی شخصیت میں کوئی خاص بات نہ تھی سوائے اس کے کہ اس کی صحت بہت اچھی معلوم ہوتی تھی اور اس کے جسم کی کھال کمائے ہوئے چمڑے کی طرح چمکتی تھی۔ مگر ایسے صحت مند اور کسرتی جسم تو اس شہر میں لاکھوں کے پاس ہوں گے —— سات منزلہ بلڈنگ کتنوں کے پاس ہوگی؟

"پالش کہ مرمت؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"دونوں!" میں نے جواب دیا۔

موچی نے میرے جوتے اتار لیے اور انھیں الٹ پلٹ کے غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے سوچا، یقیناً میرے دوست نے مجھ سے مذاق کیا ہے —— پھر خیال آیا۔ آخر پوچھ لینے میں ہرج کیا ہے؟

"میں نے سنا ہے۔ تم کبھی اس سات منزلہ بلڈنگ کے مالک تھے!"

موچی نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑے اطمینان سے میرے جوتوں کو الٹ پلٹ کر انھیں بڑے غور سے دیکھتا رہا، جیسے وہ میرے جوتے دیکھنے

کی بجائے انھیں پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو، پھر اس نے اپنی نگاہ اٹھا کر میرے چہرے کی طرف دیکھا، گویا جوتے کے چمڑے کو پڑھنے کے بعد میرے چہرے کے چمڑے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو!

معلوم نہیں اس نے کیا دیکھا کیا پڑھا، وہ آہستہ سے مسکرایا "معلوم ہوتا ہے اس شہر میں نئے نئے آئے ہو" موچی نے مجھ سے کہا۔

"ہاں، نوکری کی تلاش میں آیا تھا!"

"اور وہ ملی نہیں!" موچی نے پھر کہا۔

"ہاں! مگر تمھیں کیسے معلوم ہے؟" میں نے پوچھا۔

موچی نے لکڑی کا ایک چھوٹا سا کھُردرا سٹول میرے لیے پیڑ کے سایے میں رکھ دیا اور میرے جوتے کو لکڑی کے ایک اڈّے میں الٹا پھنساتے ہوئے بولا "اس سٹول پر بیٹھ جاؤ اور سنو۔ میں عام طور پر سناتا نہیں ہوں ——— مگر تم حقدار ہو سننے کے ———!"

"میں بچپن سے بیالیس برس تک کی داستان نہیں سناؤں گا، کیونکہ بیج سے پیڑ تک کا عرصہ بہت بڑا عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصے میں درخت بہت سے گناہ کرتا ہے اور بہت سے گناہ اس پر وارد کیے جاتے ہیں۔ لوگ اس کی شاخوں سے لٹک کر خودکشی کرتے ہیں۔ اور ڈاکو اس کے تنے سے ٹیک لگا کے لوٹ کا مال سنبھالتے ہیں۔ اور درخت چڑیوں کو گھونسلا بنانے کی اجازت دیتا ہے تاکہ سانپ ان کے انڈے چرا سکے۔ زمین سے آسمان تک

سفر کرتے ہوئے ہری کونپل کی کھال کس قدر موٹی ہو جاتی ہے۔ یہ ایک الگ المیہ ہے۔ اسے سنانے کے لیے نہ میرے پاس فرصت ہے۔ نہ تمھارے پاس وقت!"

موچی کا لہجہ ہی بدل گیا تھا۔ میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ میں نے سٹول اس کے قریب کھسکا لیا تاکہ اس کا کوئی لفظ مجھ پر ضائع نہ ہو!

"میں تمھیں اپنی پرانی زندگی کا صرف آخری واقعہ سناؤں گا جب میں بیالیس برس کا تھا۔ اور جب میں نے زمانے کے سرد و گرم سے گزر کر ٹھیکہ، پرمٹ، کوٹہ، سمگلنگ، سٹہ، بے ایمانی، رشوت، دھمکی، عاجزی، خوشامد، چاپلوسی، دھوکا دھڑی، غرضیکہ ہر طرح کی ٹکڑم استعمال کر کے پانچ کروڑ روپیہ اکٹھا کر لیا۔ کوئی معمولی رقم نہیں ہے اور کسی معمولی بے ایمانی سے نہیں ملتی ہے۔ اس کے لیے ایمان داری کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن ایسی ایمانداری جو بے ایمانی کی طرح استعمال ہو سکے اور بہت سا سچ چاہیے جسے جھوٹ کی طرح خرچ کیا جا سکے! تم اسے نہیں سمجھو گے ...... ڈیڑھ سو روپے کی نوکری تلاش کرنے والے اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اتنی بڑی رقم کو حاصل کرنے کے لیے جھوٹ اور سچ، معصیت اور معصومیت، نیکی اور گناہ کو آئن سٹائن کی اضافیت کی طرح استعمال کرنا پڑتا ہے —!"

میں چونک گیا —!

موچی نے میرے جوتے کا تلا گیلا کیا —!

لیکن کبھی میں بھی ہری کونپل تھا۔ میری جلد بڑی نازک تھی اور ذرا سی لے

ایمانی مجھے گرم لُو کی طرح جھلس دیتی تھی۔ اور صبح کی ہوا میرے لیے آسمان کی خوشبوئیں لاتی تھیں۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ آسمان کی طرف دیکھنے کی بھی ایک سزا ہے!"

"بیالیس برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے میری کھال موٹی اور کھُردری ہو گئی تھی اب مجھ پر نہ کسی لُو کا اثر ہوتا تھا نہ کسی خوشبو کا۔ بیالیس برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے میں نے دس کروڑ روپے کما لیے اور یہ سات منزلہ بلڈنگ جو تم سامنے دیکھ سکتے ہو۔ یہ بھی کھڑی کر لی۔ اور بہت سی جائداد ——— وزیر لوگ مجھے لینے کے لیے ہوائی اڈے پر آتے تھے۔ اور میں نے سوچا اب میں سب کچھ خرید سکتا ہوں۔ اور سب کو خرید سکتا ہوں ———!

"اور پھر دس کروڑ روپے انٹی میں رکھ کر جو میں خریدنے کو نکلا تو معلوم ہوا ہر چیز بکتی ہے ——— سیاست، مذہب، اخلاق، شہرت، دوستی، وفاداری خوبصورتی، عشق، ادب، سائنس، شاعری .... ہر چیز مناسب بھاؤ سے بکتی ہے ——— دام لگاتے جائیے مال اٹھاتے جائیے ......!"

"یہ جان کر دماغ اور بھی خراب ہو گیا۔ اور میں ہر ایک کو جوتے کی نوک پر رکھنے لگا ———!

"میرے دوست رام دیال ترپاٹھی نے مجھے بہت سمجھایا۔ تم زندگی کو بالکل غلط سمجھ رہے ہو۔ سٹے، کوٹے، پرمٹ، لائسنس اور اسمگلنگ کے دھندوں نے تمھاری مت مار دی ہے ——— زندگی کی اخلاقی قدروں سے تمھارا ایمان

اٹھ گیا ہے۔ تم سب کو اپنے ایسا ہی چور اور غرض کا بندہ سمجھتے ہو۔ حالانکہ آج بھی اس دنیا کیا، اسی شہر میں لاکھوں لوگ ایسے بستے ہیں جنھیں تمھارے روپیہ کی بالکل پروا نہیں ہے۔ اور جو تمھیں اور تمھارے روپے کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں ———!"

"میں زور سے ہنسا ———!

"میری ہنسی سن کر تر پاٹھی کا چہرہ تمتمانے لگا۔ مجھی کو دیکھو——— کیا میں نے کبھی تمھارے دس کروڑ روپیوں سے ایک کوڑی بھی مانگی ہے؟"

"تم بے وقوف ہو!"

"میری طرح بے وقوف اور اپنی عزّتِ نفس کی خاطر اپنی آن پر مٹ جانے والے اس شہر میں لاکھوں لوگ موجود ہیں!"

"مجھے یقین نہیں ہے" میں نے کہا۔

آزما دیکھو———! وہ بولا۔

"مجھے بھی فوراً ہی ایک ترکیب سوجھ گئی۔ روپے کی گرمی تھی، دماغ بھی گرم تھا——— میں نے اسی وقت ایک اسٹینو کو بلا کے ایک اشتہار کا مسودہ اسے بنایا——— جو دوسرے دن ٹائمز میں چھپ بھی گیا۔

جوتے کھانے والے کو پانچ سو روپے انعام

جو شخص راقم الحروف سے دس جوتے کھائے گا اسے پانچ سو روپیہ انعام دیا جائے گا۔ جوتے کھانے کا ٹائم وہی ہے جو دفتر جانے کا ٹائم ہے یعنی صبح دس بجے سے شام کے پانچ بجے تک!

جوتے کھانے والے ملاقاتی اپنی بی اے کی ڈگری ساتھ لائیں ——— بی اے کی ڈگری اور اپنا فوٹو دونوں کو ساتھ لانا لازمی ہے۔ ورنہ جوتے نہیں پڑیں گے!

گوری جیرن باگڑیا
، ٹرنر روڈ —— بمبئی

دوسرے دن ٹائمز میں اشتہار دیکھ کر رام دیال ترپاٹھی دوڑا دوڑا میرے پاس آیا ——

"یہ کیا حماقت ہے؟"

"میں نے کہا تمھیں معلوم ہے۔ ہمارے ملک میں جوتے کھانا کس قدر معیوب سمجھا جاتا ہے؟ آپ ایک آدمی کی لڑکی بھگا سکتے ہیں لیکن اسے جوتے نہیں مار سکتے۔ پہلی بات وہ برداشت کر لے گا —— دوسری نہیں ...... ہرگز نہیں ..... کسی طرح نہیں .....!"

"ہاں! یہ تو سچ ہے" ترپاٹھی نے اقرار کیا۔

"اسی لیے میں نے اشتہار دیا ہے۔ میں تمھیں دکھانا چاہتا ہوں کہ زندگی کی قدریں کس قدر رل گئی ہیں!"

"مگر یہ بی اے کی پخ کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"کیونکہ مجھے غریبوں پر بھروسا نہیں۔ غریب کا اخلاق کیا اور اس کی اوقات کیا؟ وہ تو دس روپے کے لیے دس جوتے کھانے پر تیار رہتا ہے اسی لیے میں نے شریفوں میں اشتہار دیا ہے تاکہ تم پر شرافت کی قلعی اچھی طرح کھل جائے۔"

"تبر پاٹھی چپ ہو گیا۔ ہم دونوں انتظار کرنے لگے۔ گیارہ بج گئے، دو بج گئے، تین بج گئے —— ایک آدمی جوتے کھانے کے لیے حاضر نہیں ہوا۔ جب چار بجے تو تبر پاٹھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ مجھے غصّہ تو بہت آیا مگر کیا کرتا۔ ساڑھے چار بجے کے قریب ایک دبلا پتلا نوجوان جو شکل وصورت سے بے حد فاقہ زدہ معلوم ہوتا تھا۔ ڈرتے ڈرتے انٹرویو کے لیے آیا۔ اس نے اپنی ڈگری دکھائی، فوٹو دکھایا۔ "جوتے کھانے کے لیے کسی پرائیویٹ کیبن کا بندوبست کیا ہے آپ نے؟"

"نہیں جناب، میں نے اس سے بڑی سختی سے کہا۔ جوتے سرِعام پڑیں گے، پبلک میں، اس بلڈنگ کے باہر کے گراؤنڈ میں!"

"وہ کچھ لمحے سوچتا رہا۔ عجب پس وپیش میں تھا۔ پھر اس نے ایک سرد آہ بھری۔ اپنی بی اے کی ڈگری کو تہ کیا۔ فوٹو کو جیب میں رکھا، وہ کچھ کہے سنے بغیر چلا گیا۔

"تبر پاٹھی خوشی سے چہکنے لگا —— !

"میں سوچنے لگا —— سوچ سوچ کر میں نے کہا "غلطی میری ہے میں نے انعام اس قدر کم رکھا ہے۔ ٹائمز کو غریب لوگ تو پڑھتے ہی نہیں۔ ورنہ اب تک بہتیرے جوتے کھانے کے لیے آجاتے۔ اور جو لوگ ٹائمز پڑھتے ہیں ان کے لیے پانچ سو کی رقم بہت کم ہے۔ یعنی میں سوچتا ہوں کہ جب ان لوگوں نے اپنے ذہن کی ترازو میں ایک طرف اپنی عزّتِ نفس اور دوسری طرف پانچ سو روپیوں کو رکھا ہوگا تو روپیوں والے پلڑے کو بہت ہلکا پایا ہوگا۔ غالباً

عزّتِ نفس کی فروخت کے لیے یہ شرح بہت کم ہے۔
دوسرے دن کے اشتہار میں میں نے نرخ بڑھا کے ایک ہزار کر دیا۔ پھر بھی صرف تین آدمی آئے —! تیسرے دن میں نے نرخ اور بڑھا کے دو ہزار کر دیا — اب کے پانچ آدمی آئے۔ یعنی کل آٹھ آدمی — ہمارے شہر میں —؟ میں غصّے سے دانت پیسنے لگا۔ میرا فلسفہ ناکام ہوا جا رہا تھا۔ اور ادھر ترپاٹھی مجھے دیکھ کر قہقہے پر قہقہے لگا رہا تھا۔ آپ لوگوں نے شاید ترپاٹھی کی تلخ ہنسی نہیں سُنی ورنہ آپ وہی کرتے جو آگے چل کر میں نے کیا۔ — میں نے ترپاٹھی سے صلاح و مشورہ کیے بغیر انعام کی رقم دس ہزار کر دی اور جوتوں کی تعداد بڑھا دی — جو شخص مجھ سے پچاس جوتے کھائے گا اسے دس ہزار روپیہ یک مشت ملے گا۔ یہ پیش کش صرف دو دن کے لیے کھلی تھی۔
"دوسرے دن سویرے آٹھ بجے کے قریب ترپاٹھی بھاگا بھاگا میرے پاس آیا۔ اس کا رنگ فق تھا۔ اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں —!
"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔
"بلڈنگ کے باہر دو سو آدمی لائن لگا کر کھڑے ہیں۔ اور ابھی صرف آٹھ بجے ہیں!"
"میں خوشی سے چہکنے لگا —
"گھبراؤ نہیں۔" میں نے کہا "میں نے بینک سے پچاس لاکھ روپیہ منگا لیا ہے۔ میں تمھیں سبق دینا چاہتا ہوں۔ اگر ایک کروڑ روپیہ بھی صرف

ہو جائے تو مضائقہ نہیں ....!"

دس بجے کے قریب کیو اتنا لمبا ہو چکا تھا کہ پولیس کو بلوانا پڑا۔ اور ایک مجسٹریٹ کو بھی —— مجسٹریٹ ایک ڈاکٹر کو بھی ساتھ لیتا آیا کہ اسے میری ذہنی حالت کے مخدوش ہونے کا شبہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے میرا دماغی معائنہ کر کے مجھے صحت مند قرار دیا۔ البتہ اتنا ضرور کہا کہ دماغ ضرورت سے زیادہ گرم ہے۔ میں اپنا کمپونڈر یہاں چھوڑے جا رہا ہوں ——!

"ڈاکٹر ذرا سا مسکرایا۔ اپنا سامان سنبھالتے ہوئے بولا۔" اسے بھی ذرا —— جوتے کھانے کا شوق ہے —— امید ہے آپ اسے ناامید نہیں کریں گے۔"

"ڈاکٹر چلا گیا تو باقاعدہ طور پر جوتے مارنے کا پروگرام شروع ہوا —— مجسٹریٹ اور اس کے ساتھ دو جوڈیشل کلرک باقاعدہ ہر جوتے کھانے والے کا فوٹو چیک کرتے تھے اور ڈگری دیکھتے تھے۔ اور اس سے ایک فارم پر دستخط کراتے تھے جس پر لکھا تھا "میں خود اپنی مرضی سے پچاس جوتے کھا رہا ہوں --- اس کی اخلاقی یا مالی ذمہ داری میرے سوا کسی پر عاید نہیں ہوتی ——!

"اس کے بعد میں جوتے مارتا تھا ——!"

"اشرافیہ میں سے ہر طرح کے لوگ آ رہے تھے، ہر مذہب کے اور ہر قوم کے، ہر رنگ کے، ہر عمر کے اور ہر پیشے کے۔ میں ہر ایک کو جوتے مارتا تھا اور رام دیال ترپاٹھی کی طرف فخریہ انداز سے دیکھتا تھا —— اور

رام دیال تو یا ٹھی تھا کہ ذہن میں گڑ ابھار رہا تھا۔ اور مارے شرم کے مجھ سے آنکھ نہیں ملا سکتا تھا ــــ دوپہر کے قریب وہ کہیں غائب ہو گیا۔ مگر دوپہر کے قریب کیو اتنا بڑھ گیا تھا کہ ٹرنر روڈ سے مارسن روڈ کے ناکے سے نکل کر پالٹو سینما کے چوک تک پہنچ چکا تھا۔ لوگوں کا وہ اژدھام تھا وہ جم غفیر، کہ پولیس کو دوبارہ لاٹھی چارج کرنا پڑا۔ کیونکہ دیر میں آنے والے لوگ کیو کے آگے والے حصے میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے ــــ جوتا کھانے کے لیے آپس میں وہ جوتا چلا کہ الاماں!

"تین بجے کے قریب میرا جوتا ٹوٹ گیا۔ اور میں نے اس تماشے کو بند کر دینا چاہا ــــ مگر میرے سامنے اس وقت ایک سفید ریش بڈھا کھڑا تھا ــــ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔

"مجھے جوتے مارو۔ مجھے جوتے مارو۔ مجھے دس ہزار روپے دے دو۔!"

"مگر میرا جوتا ٹوٹ گیا ہے!"

"اس نے اپنے پاؤں سے اپنا پھٹا چپل نکالا اور میرے ہاتھ میں دے کر بولا"۔ کوئی ہرج نہیں۔ میرا جوتا لے لو۔ مجھے میرے ہی جوتے سے مارو۔ مگر مجھے دس ہزار روپیہ دے دو۔ میں اپنی بیٹی کی شادی کروں گا ــ۔"

"اس کے پیچھے ایک بڈھی کھڑی تھی۔"

"میں نے بڈھے کو بھگتا کے اس سے پوچھا" اماں! تو یہاں کیا کرنے آئی ہے؟"

"جوتے کھانے آئی ہوں، بیٹیا!" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"تو، تو ماں ہے ...... اپنی عمر دیکھ۔ اپنے سفید بال دیکھ ...... تو عورت ہے۔ میں تجھے کیسے جوتے مار سکتا ہوں؟"

"عورت تو سدا سے مرد کے پاؤں کی جوتی رہی ہے۔ چاہے وہ گریجویٹ کیوں نہ ہو جائے ——! بیٹا مجھ پر اتنا ظلم نہ کر، مجھے جوتے مار۔ پچاس کے بجائے سو جوتے مارنے لگے مجھے دس ہزار روپلے دے دے۔ اب میں اس دنیا میں اکیلی ہوں۔ دس ہزار سے میرا بھلا ہو جائے گا ——!

"وہ دونوں ہات پھیلا کر مجھے دعائیں دینے لگی!

ٹھیک شام کے پانچ بجے میں نے جوتے مارنا بند کر دیا۔ مگر لوگوں کی بھیڑ کسی طرح کم نہ ہوئی۔ ٹرنر روڈ پر ایک میلہ سا لگ گیا۔ بالکل کسی مذہبی یا قومی تیوہار کا سا سماں تھا۔ خوانچے والے، ربڑی والے، چھابڑی والے، طرح طرح کی صدائیں لگانے لگے۔ کیونکہ کیو میں کھڑے ہونے والے لوگوں نے رات بھر یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور کوئی شخص اپنی جگہ سے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ کیو میں کھڑے ہونے والوں کی جگہ لینے کے لیے سودے ہونے لگے —— پانچ سو سے لے کر پانچ ہزار تک بولی دی جانے لگی۔ لوگوں نے اپنے گھروں سے کمبل اور بستر منگا لیے۔ چائے والے گرم گرم چائے اور نان خطائی بیچتے پھرتے تھے۔ سگریٹ اور پان کباب اور کلیجے، پوری اور بھاجی، سوڈا اور کوکا کولا بلکہ ٹھرے کی بوتلیں تک بکنے لگیں —— انعام حاصل کرنے کے لیے سنڈیکیٹ بن گئے اور کئی امیر لوگوں نے جو خود آنے میں عار محسوس کرتے تھے، دس، بیس، تیس، چالیس چالیس غنڈے کیو میں گھسا دیئے ——

ان غنڈوں کو صرف ایک ہزار روپیہ ملے گا۔ باقی سب سیٹھوں کی جیب میں جائے گا۔ راتوں رات بی اے کی ڈگری کے نرخ بڑھ گئے۔ جس ڈگری پر ڈیڑھ سو کی نوکری نہیں مل سکتی تھی۔ اسی ڈگری کے کاغذ کے لیے ڈیڑھ ہزار روپے تک کی آفر آنے لگی۔ گویا جوتیوں میں دال بٹنے لگی!

ترپاٹھی کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ رات بھر وہ میرے پاس نہیں آیا۔ صبح بھی نہیں۔ دس بجے پھر سے جوتے مارنے کا پروگرام شروع ہوا۔ اب کے پولس کا بندوبست زیادہ تھا۔ اور مجسٹریٹ بھی تین تھے۔ گیارہ بجے کے قریب ایک آدمی اپنے منہ پر چادر ڈالے میرے سامنے جوتے کھانے کے لیے پیش ہوا۔ میں نے اعتراض کیا۔ منہ پر سے جب تک چادر نہ ہٹائی جائے گی۔ میں جوتے نہ ماروں گا۔

"بہت لیس و پیش کے بعد اس آدمی نے اپنے منہ سے چادر ہٹائی ــــ!

"یہ رام دیال ترپاٹھی تھا!

"تم ...... ؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں!، وہ کھسیانا ہو کر بولا، مجھے سبق مل گیا ہے۔ اب تم یہ کھیل بند کرو،

"کیسے بند کر سکتا ہے یہ ؟" ترپاٹھی کے پیچھے کھڑا ہوا ایک شخص بڑے کراہے لہجے میں چلایا۔

"میں نے آگے جھک کر دیکھا ـــ یہ شہر کا سب سے بڑا ٹھیکیدار مانا پرشاد تھا جس نے میری یہ سات منزلہ بلڈنگ تعمیر کی تھی!

"تم یہاں کہاں سیٹھ ؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ارے میونسپل کارپوریشن کے دس ہزار جوتے کھا کے ایک کانٹریکٹ ملتا ہے۔ میں نے کہا چلو اپنے۔ ارے پچاس جوتے کھا کے دس ہزار لے آئیں گے پانچ منٹ میں کیا بُرا سودا ہے؟"

"میں نے کہا، مگر میرے بنک میں تو میرے پانچ کروڑ روپے جو جمع تھے وہ سب ختم ہو چکے ہیں۔"

"کوئی مضائقہ نہیں —— یہ بلڈنگ بیچ دو۔ میں خریدتا ہوں!"

"میں نے کہا —— میں جوتے مارتا مارتا تھک گیا ہوں!"

"جوتے تو تمھیں مارنا ہی پڑیں گے!"

"ہم تو جوتے کھانے کے لیے آئے ہیں اور جوتے کھا کر جائیں گے، کیونکہ ہم بہت سے لوگ چلائے۔ پیچھے سے کسی نے نعرہ لگایا —— جوتا زندہ باد!" سینکڑوں لوگ "جوتا زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے میں الیکشن اور ووٹنگ کی فضا پیدا ہو گئی!

"پھر باہر سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ ہنگامہ بڑھتا جا رہا تھا۔ شاید لوگوں کو پتا چل گیا تھا کہ میں مزید انعام بانٹنے سے انکار کر رہا ہوں۔ دو آدمی گولی چلنے سے ہلاک ہو گئے تھے۔ مجسٹریٹ نے کہا —— تمھاری پیشکش دو دن کے لیے ہے۔ تم لوگوں کو جوتا کھانے سے نہیں روک سکتے۔ ورنہ شدید بلوہ ہو جائے گا!

"میں نے دو کروڑ مالیت کی بلڈنگ ڈیڑھ کروڑ میں سیٹھ ماتا پرشاد کے ہاتھ اسی وقت بیچ دی۔ اور پھر جوتا چلنا شروع ہو گیا!

"تین بجے تک باقی بلڈنگیں بھی نیلام ہو گئیں۔ اب صرف ایک، بنک کے حصّے بچ گئے تھے۔ اس لیے میں بہت دھیرے دھیرے جوتا لگا رہا تھا کہ کسی طرح پانچ بجا دوں اور بنک بچا لوں۔ مگر چار بجے کے قریب بنک کے حصّے بھی فروخت کر دینے پڑے اور جب پانچ بجے تو میرا کُل اثاثہ ختم ہو چکا تھا ـــــ میں جوتے بغل میں دبا کے بلڈنگ سے باہر نکل آیا ـــــ!

شام ہو رہی تھی۔ اور لوگ اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔ سڑک کی حالت ایک ایسی لٹی پٹی شاہراہ کی تھی جس پر ابھی ابھی فرقہ وارانہ فساد ہو چکا ہو ـــــ بلڈنگ کے باہر اسی جامن کے پیڑ کے نیچے گھسیٹو موچی جُوتے بنا رہا تھا ـــــ میں نے اس سے پوچھا ـــــ

"ارے گھسیٹو۔ تو نہیں آیا۔ جوتے کھانے کے لیے؟"

گھسیٹو میری طرف دیکھ کر بڑی سادگی سے بولا: "سرکار میں جُوتے بناتا ہوں ـــــ جوتے کھاتا نہیں ہوں ـــــ!"

اس کی سادگی میرے دل کو لگ گئی ـــــ میں وہیں اس کے پاس اس سٹول پر بیٹھ گیا جس پر تم بیٹھے ہو!

"جب سے میں یہیں ہوں ـــــ مجھے لوگوں نے طرح طرح سے مدد دینا چاہی میرا کاروبار پھر سے شروع کرانا چاہا۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ مجھے بھی بُدھ کی طرح گیان حاصل ہو چکا ہے ـــــ!"

موچی نے میرے جوتے کو لے کر ماتھے سے لگایا پھر اسے بڑی محبّت سے بوسہ دیا۔ اور بولا۔

"تب سے میں اسی جامن کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر جوتے بناتا ہوں اور ہر روز جوتے کو سلام کرتا ہوں۔ جوتا جو اس عہد کا آقا ہے اور جو روٹی ہے!"

○

فنون :

مسعود مفتی

راضی نامہ

مجسٹریٹ کے سامنے لڑکی پیش ہوئی۔

درخواست اس کے ہاتھ میں دی ——— اوڑھنی اتار کر مجسٹریٹ کے پاؤں میں پھینکی ——— اور دونوں ہاتھ باندھ کر زار و قطار رونے لگی۔

"کیا قصہ ہے بی بی!" مجسٹریٹ نے پوچھا۔

"میرے ساتھ بہت ظلم ہو رہا ہے ——— میری جان بچاؤ۔" وہ چیخنے لگی۔

"کیوں؟ کون مارتا ہے؟"

وہ روتے روتے بولنے لگی۔ جیسے گراموفون کی چابی کم ہونے لگے۔ کچھ بھی سمجھ نہ آتا تھا۔ عاجز آ کر مجسٹریٹ نے عرضی پر نگاہ ڈالی۔ سائلہ نے اپنی جان کی حفاظت کے لیے درخواست دی تھی۔ میرا چچا مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ پہلے اس نے میری ماں کو قتل کیا تھا۔ مقدمہ جرگے میں گیا۔ مگر وہ جرگہ ممبروں کو رشوت دے کر بری ہو گیا۔ اب میری جان کو خطرہ ہے۔ اس کو پابند ضمانت کیا جائے کہ وہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچائے اور نہ ہی میری شادی میں رکاوٹ ڈالے۔"

"وہ تمھیں قتل کیوں کرنا چاہتا ہے؟" مجسٹریٹ نے پوچھا۔

لڑکی نے سسکیاں بھرتے ہوئے سر اٹھایا۔ وہ بیس بائیس برس کی

خوبصورت لڑکی تھی۔ گورا رنگ، سر پر نیلی اور لال پھولدار اوڑھنی۔ اُس میں سے لٹکتی ہوتی بالوں کی مینڈھیاں۔ آنکھوں کے گرد سرخ رنگ کے چھینٹے۔ ان میں سے ابلتے ہوئے آنسو۔ جو میلے رخساروں پر بہتے ہوئے ٹھوڑی سے ٹپک رہے تھے۔ پتلی ستواں ناک کے ایک طرف چاندی کا بڑا سا چکر —— اور کانوں میں لٹکتے ہوتے چاندی کے زیور —— لباس پر ایک نظر سے مجسٹریٹ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ فلاں بلوچی قبیلے کی ہے ——

وہ سر اٹھا کر اسے دیکھتی رہی۔ اور سسکیوں کو دبانے میں چہرے کی جلد سکوڑتی رہی۔

"وہ کہتا ہے۔ تم قبیلے سے باہر شادی نہ کرو۔"

"تو تم کیوں کرتی ہو؟" "اُس کا قبیلے میں زور ہے۔ اور وہ اپنے بھلنجے کے علاوہ میری شادی قبیلے میں اور کہیں نہیں ہونے دے گا۔"

"تمہیں بھانجے سے شادی میں کیا اعتراض ہے؟"

"وہ تو نیم پاگل ہے۔"

"تم کس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"

"وہ ایک پنجابی ہے۔"

"اور تمہارے چچا کو کیا اعتراض ہے؟" وہ کہتا ہے۔ میں اس سے وَلوَر لونگا۔" بلوچی قبیلوں میں دولہن کے والدین لڑکے سے دلہن کی جوانی، عمر، حسن اور سماجی درجے کے مطابق کچھ رقم لیتے ہیں۔ جو وَلوَر (WALWAR) کہلاتی ہے —— مجسٹریٹ سمجھ گیا کہ لڑکی کا چچا وَلوَر کی رقم کے لالچ میں اسے باہر نہیں

شادی کرنے دیتا۔

"تو وہ پنجابی کیا کہتا ہے۔"

"وہ بولتا ہے، میں ولور نہیں دوں گا ـــــ ہمارے ملک میں رواج نہیں ہے۔"

"اور تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں بھی ولور نہیں مانگتی۔"

"کیوں تمھاری اس سے دوستی ہے کیا؟"

"نہیں۔"

"پھر تم کیوں ملکی رسم کے خلاف ولور معاف کرتی ہو۔"

"میں معاف نہیں کر رہی۔ میرا چھوٹا بھائی ہے، وہ ناسمجھ ہے معصوم ہے میں نے شرط یہ رکھی ہے کہ وہ پنجابی ولور نہ دے۔ بلکہ اسے میرے پاس رہنے دے۔ اور اس کو تعلیم دلوائے" ـــــ "وہ راضی ہے؟"

"ہاں ـــــ بالکل، مگر میرا چچا کہتا ہے کہ میں ولور لوں گا۔ نہیں تو شادی نہیں ہونے دوں گا۔ اور تھیں قتل کر دوں گا۔"

مجسٹریٹ کو لڑکی کی بات بہت مناسب معلوم ہوئی۔ اس کے دل میں لڑکی کے لیے عزت کا جذبہ پیدا ہوا۔ تو اپنے بھائی کی تربیت کی خاطر قبائلی رسم رواج چھوڑنے کے لیے تیار ہے۔ ایسی کڑی روایات سے اتنی کھلی بغاوت کرنے والے کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اُس نے قلم اٹھایا اور چچا کی طلبی کے لیے حکم لکھ دیا۔ لڑکی کو دوسری تاریخ دے دی۔

اگلی تاریخ پر چچا بھی آگیا۔ وہ کوئی چالیس سالہ صحت مند مرد تھا۔ سر پر بڑی سی پگڑی۔ اور نیچے گھبیر داڑھی کی جھالر میں سرخ چہرہ تانبے کی طرح دمکتا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے بھاری کپڑوں میں وہ غصّے سے بےکل ہو رہا تھا۔

اس لڑکی نے ہماری غیرت کو ہاتھ ڈالا ہے۔ یہ قبیلے سے باہر نہیں جا سکتی۔ اس کو کوئی حق نہیں کہ قبیلے کی رسم توڑے —— میں تو جناب اسی کی بھلائی کے لیے کہتا ہوں۔ اگر رسم کے خلاف جائے گی۔ تو قبیلے والے ساری عمر مجھے طعنے دیں گے اور اسے مار ڈالیں گے۔ پہلے اس کی ماں بھی ہماری رسموں کا مذاق اڑاتی تھی۔ تو لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔ اس لڑکی کو ہماری غیرت کا خیال نہیں جو یہ باہر جانا چاہتی ہے۔"

لڑکی بھی چیخنے لگی۔ اُس نے اپنے چچا کو ظالم، غاصب، قاتل اور مردود تک کہہ ڈالا۔ چچا بھی اسے گالیاں دیتا رہا۔ دونوں کو جھگڑے سے روکنے کی بجائے مجسٹریٹ خاموشی سے اُن کو دیکھتا رہا۔ اور اُن کی باتوں سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

"تم اسے قتل کرنا چاہتے ہو" بالآخر اس نے پوچھا۔

"لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا:" میں کلمہ پڑھ کر کہتا ہوں کہ میری ایسی کوئی نیت نہیں ہے۔ میں تو اس کے بھلے کی بات کرتا ہوں کہ قبیلے میں شادی کرلے۔ یہ بے وقوف ہے۔ اور جوانی کے جوش میں اندھی ہو رہی ہو۔ اگر اس نے کوئی خراب حرکت کی تو قبیلے والے اسے مار ڈالیں گے —— اس کا کوئی بزرگ نہیں ہے۔ اس لیے اسے سمجھانا میرا تو فرض ہے۔"

مجسٹریٹ نے غور سے اس آدمی کو دیکھا۔ وہ بڑا سمجھدار اور جہاندیدہ لگتا تھا۔ گھنیری سیاہ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی اور گفتگو میں اعتماد تھا۔

"لڑکی کے والدین نہیں ہیں ..... وہ بالغ ہے۔ تم اسے اپنی مرضی سے شادی کرنے دو۔ تمہیں اس پنجابی پر کیا اعتراض ہے!"

"وہ ونو کو رہنے نہیں دیتا۔"

"مگر میں ہرگز نہ لوں گی" —— لڑکی چلائی، "اس حالت میں وہ میرے بھائی کو نہیں رکھے گا۔ اور وہ گلیوں میں دربدر ٹھوکریں کھاتا پھرے گا۔"

"بکواس بند کر۔" چچا نے اسے ڈانٹا۔ "تمہارے بھائی کو میں جو رکھنے کے لیے تیار ہوں۔ تم خواہ مخواہ اس کی بات کیوں بیچ میں لے آتی ہو —— آخر وہ میرا بھی تو بھتیجا ہے۔ مجھے نہیں اس کا درد؟"

بات جائز اور معقول تھی۔ مجسٹریٹ نے لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا:
ٹھیک ہے۔ اگر یہ لڑکے کو اپنے پاس رکھ کر تعلیم دلواتے تو تمہیں کیا فکر ہے؟"

"میں نہیں مانتی۔ اس کی بیوی اس سے گھر کے بڑے بڑے کام کرواتی ہے اور کھانے کو کچھ نہیں دیتی۔ اسے نوکر سے بھی بری طرح رکھتی ہے۔ میں اس کو کیوں خوار کروں۔ وہ میرا بھائی ہے۔ اور بہن والا درد چچے کو کہاں ہو سکتا ہے۔"

مجسٹریٹ لڑکی کی بات سے کچھ قائل ہو گیا۔ وہ پھر چچا کی طرف متوجہ ہوا۔
تم میری بات کا جواب دو —— اگر وہ ونو کو نہیں لینا چاہتی تو تم کیوں اصرار کرتے ہو؟"

میں معمولی آدمی نہیں ہوں۔ قبیلے کے معتبرین میں شمار ہوتا ہوں ---- ڈلور کے بغیر تو فقیر بھی بیٹی نہیں دیتا۔ ساری عمر لوگ مجھے طعنے دیں گے کہ کوڑے کے ڈھیر پر لڑکی پھینک دی ---- اس سے جناب میرا قبیلے میں ناک کٹ جائے گا مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ رواج توڑ کر بے غیرت کہلواؤں۔"

"مگر کئی لوگ ڈلور نہیں لیتے۔"

"وہ صاحب ان کے اپنے قبیلے کے رواج ہیں۔ ہمارا تو ایسا نہیں ہے۔

مجسٹریٹ نے رواجی قانون کی کتاب اٹھائی۔ بلوچستان کے قبائلی علاقوں میں رواجی قانون چلتا ہے۔ اور صرف عدالت کی بجائے مجسٹریٹ اور جرگے مل کر اُسے نافذ کرتے ہیں۔ ہر قبیلے کا اپنا رواج ہے۔ اس لیے قانون کی پابندیاں بھی اس کے ساتھ بدلتی چلی جاتی ہیں۔

کتاب میں لکھا تھا کہ اس قبیلے کی جوان کنواری لڑکی کا زرِ ڈلور ایک ہزار سے تین ہزار تک ہے۔ اور بیوہ کا سات سو ہے۔ یہ لڑکی کے والدین وصول کرتے ہیں۔ اگر وہ نہ ہوں تو اس لڑکی کا بالغ بھائی وصول کرتا ہے۔

"تمہارے بھائی کی عمر کیا ہے۔" اس نے لڑکی سے پوچھا، وہ بھاگی گئی باہر سے ایک بچے کو لے آئی۔ اور اٹھا کر مجسٹریٹ کے سامنے کھڑا کر دیا۔

مجسٹریٹ اُسے دیکھ کر بے اختیار مسکرا دیا۔ وہ مخصوص قبائلی لباس کے ٹخنوں تک لمبے کھلے کرتے میں بالکل گڑیا سی لگتا تھا۔ گورے لال چہرہ کے اوپر سنہری بالوں کی جھالر ماتھے پر گر رہی تھی۔ اور وہ موٹی موٹی معصوم آنکھوں سے مجسٹریٹ کو سہم کر دیکھ رہا تھا ---- اس کی عمر کوئی چار یا پانچ برس کی ہوگی

"اوں ہوں۔ کچھ عقل کر" اردلی آگے جھپٹا۔ لڑکی کو دھکے سے پرے کیا اور بچّے کو اتار لیا۔ بچّہ کچھ سمجھے بغیر اپنی گول گول آنکھیں گھما کر حیرت سے چپڑاسی کو دیکھنے لگا۔ اور پھر بہن کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

چپڑاسی نے بچّے کو اتار کر نیچے کھڑا کر دیا۔

مجسٹریٹ پھر سے رواجی قانون پڑھنے لگا ــــ اگر لڑکی کا بالغ بھائی نہ ہو۔ تو اس کا چچا یا دیگر پدری ورثا ماں کی اجازت سے ولور وصول کرتے ہیں۔ ان کے بعد سوتیلے بھائیوں کا نمبر آتا ہے ــــ مجسٹریٹ نے "ماں کی اجازت" کے نیچے لکیر کھینچی۔ وہ سوچنے لگا کہ رواج کے مطابق ماں کی اجازت چچا کے لیے ضروری ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اس مقدمے میں تو ماں بھی نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسی حالت میں کیا مکمل اختیارات چچا کو مل جاتے ہیں۔ یا بالغ لڑکی خود ماں کی جگہ لے لیتی ہے۔ اور وہ آزادانہ رائے دے سکتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یا شاید چچا ماں کی جگہ لے لیتا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ کافی دیر سوچتا رہا۔ اس نکتے پر کتاب کی ورق گردانی بھی کی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ تب اس نے دو ممبر لڑکی کی مرضی کے چنے۔ دو چچا کی مرضی کے اور ایک اپنی مرضی سے ڈال کر پانچ آدمیوں کا جرگہ بنا دیا۔ اور اس مسئلے پر اُن کی رائے طلب کی جرگے کے سامنے کئی دن تک مقدمہ پیش ہوتا رہا طرفین نے گواہ پیش کیے۔ سابقہ فیصلوں اور اپیلوں کے اقتباسات پیش کیے گئے۔ بڑے بڑے معتبروں اور سرداروں نے جرگہ کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اور بالآخر رائے جرگہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش کی گئی ــــ

مگر اس میں اتفاق رائے نہ تھا۔

لڑکی کے نمائندوں نے کہا تھا کہ لڑکی کو مرضی کی اجازت ہے۔ اور چچا کے ممبروں نے لکھا کہ رواج کے مطابق ماں کی غیر موجودگی میں چچا جائز نگہبان ہے۔ اور لڑکی کو اس کی بات ماننی چاہیے۔ انھوں نے اپنے اپنے خیال کی تائید میں کئی صفحے کالے کر دیے تھے۔ پانچوں ممبروں نے گول مول سی بات کر کے فیصلہ عدالت یعنی مجسٹریٹ پر چھوڑ دیا تھا۔

ان سب کی رائے پڑھ کر مجسٹریٹ نے ریڈر سے پوچھا: "تم بھی تو وہیں بیٹھے تھے۔ یہ جرگے والے آپس میں راضی کیوں نہیں ہوئے؟" ریڈر نے چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور کسی کو قریب نہ پا کر بولا: "آج کل ہر طرف ایک ہی حال ہے صاحب۔ کہیں پارٹی بازی، کہیں پیسے، حق کی بات کون کرتا ہے۔"

مجسٹریٹ نے کہا کہ وہ جرگہ ممبروں سے بات چیت کرنا چاہتا ہے۔

پچیس پچیس گز کی پھولی ہوئی گھیر دار شلواریں پہنے جرگہ ممبر اپنی اپنی پگڑیاں سنبھال کر دری پر بیٹھنے لگے۔ اُن کے پیچھے ان کے حوالی موالی بھی لپکے آئے۔ مگر ریڈر نے نعرہ مارا "بھاگو، باقی سب یہاں سے۔"

مجسٹریٹ پانچوں جرگہ ممبروں سے بحث کرنے لگا۔ چچا کے دونوں طرف دار یہ کہتے تھے، کہ چچا مہربان ہے۔ نیک آدمی ہے۔ اُسے لڑکی کی عزت اور قبیلے کے رواج کا لحاظ ہے۔ وہ ٹھیک کہتا ہے۔ وہ ان کا جائز سرپرست ہے اس لیے وہ اگر اپنے بھانجے کی شادی لڑکی سے کرنا چاہتا ہے۔ تو اس کو مان لینا

چاہیے۔ لڑکی بے وقوفی اور ضد کی وجہ سے ہٹ دھرمی کر رہی ہے۔ لیکن چچا پھر بھی سمجھ دار ہے۔ اس نے اس کی ہٹ دھرمی توڑنے کے لیے بے جا دباؤ نہیں ڈالا۔ بلکہ اس کی خواہش کو قبول کرنے کو تیار ہے۔ بشرطیکہ کوئی باعزت طریقہ ہو۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ اگر وہ اس پنجابی سے شادی پر ہی مصر ہے۔ تو اس سے وُلور لے لے اور بچے کو چچا کے پاس چھوڑ دے۔ اس طریق سے لڑکی کی اپنی مرضی کی شادی کی ضد بھی پوری ہو جاتی ہے۔ رواج کی وُلور والی بات بھی مانی جاتی ہے اور بچہ بھی خواری سے بچ جاتا ہے —— اگر لڑکی کوئی بھی بات نہیں مانتی تو پھر چچا ساری عمر اس کو اپنے پاس اپنے گھر میں رکھنے کو تیار ہے کیونکہ غیرت کا تقاضا یہی ہے کہ چاہے ساری عمر گھر بیٹھی رہے۔ مگر وُلور کے بغیر شادی نہ کرے۔ مگر لڑکی کے حامی جرگہ والے کہتے تھے کہ ساری عمر کنواری رہ کر چچا کے پاس رہنا تو غلط ہے۔ آخر جوان لڑکی ہے۔ اس کو شادی کی ضرورت ہے۔ اُس کے بھی فطری تقاضے ہیں۔ بغیر شادی کے ان کو کیسے پورا کرے گی کل کلاں کو کہیں بھٹک جائے گی۔ تو پھر اور خرابی پیدا ہوگی۔ اب ایک نوجوان شادی کو بھی تیار ہے۔ اس کے بھائی کی مناسب تعلیم و تربیت کرنے کو بھی تیار ہے۔ اس طرح لڑکی اور بچے دونوں کی زندگی سنور جاتی ہے۔ چچا پر بھی بوجھ نہیں پڑتا۔ تو پھر چچا وُلور پر کیوں اصرار کر کے روڑے اٹکاتا ہے —

—— ہم نے پوچھا تو لڑکا وُلور دینے پر بھی رضامند ہو گیا تھا۔ مگر وہ دو چار سو روپے دیتا ہے اور چچا اصرار کرتا ہے کہ وہ تین ہزار سے کم نہ لے گا۔ آخر وہ کیسے اب تین ہزار روپے دے کر بعد میں بچے کی تعلیم پر بھی اخراجات کا

بوجھ اٹھا سکتا ہے۔

بحث چلتی رہی۔ بالآخر مجسٹریٹ نے سوچا کہ یہ رواج کا مسئلہ ہے۔ قانون کی کوئی کتاب تو اسے حل نہیں کر سکتی۔ کیوں نہ دوسرے قبیلوں کے معتبر لوگوں سے بھی رائے لی جائے۔ شاید ان کے رواج کے حوالے سے کوئی حل نکل آئے۔ چنانچہ اس نے اور لوگوں کو بھی بلوا لیا اور اُن کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا کہ آیا قانونی سرپرست کی غیر موجودگی میں بالغ لڑکی کی رائے کوئی اہمیت رکھتی ہے یا نہیں؟

مختلف لوگوں نے مختلف باتیں کیں۔ مگر کوئی فیصلہ کن بات نہ بن سکی۔ بالآخر ایک بوڑھا قبائلی سردار اٹھا۔ وہ مقدمہ کے طرفین والے قبیلے کے مخالف قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ پگڑی سر پر ٹھیک سے جماتے ہوئے وہ بولا: "صاحب کیوں اپنی جان ہلکان کرتے ہو۔ اس میں لڑکی کا مسئلہ ہی نہیں، اصل قصہ تو بچے کا ہے ـــــ بات در اصل یہ ہے کہ ان کا باپ بہت امیر آدمی تھا۔ اس کے پاس کافی جائیداد تھی۔ اس کی اراضی اب بھی پانچ چھ گاؤں کے ارد گرد پھیلی ہوئی ہے۔ پانی بھی با افراط ہے۔ اور بلوچستان میں پانی تو سونے سے بھی مہنگا ہے۔ اس لیے سب لوگ اُسی جائیداد کے پیچھے ہیں۔ ان کے باپ کے مرنے پر چچا نے جائیداد پر قبضہ کرنا چاہا، تو ان کی ماں نے پیش نہ چلنے دی ـــــ پھر خدا معلوم کس نے اس عورت کو قتل کر دیا۔ اب یہ لڑکی کچھ تیزی دکھا رہی ہے۔ خدا معلوم اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ یہ چھوٹا بچہ ہے، معصوم ہے، مگر ساری جائیداد کا تنہا وارث ہے۔ اس

بیچارے کو تو پتہ بھی نہیں کہ اس کی فصلیں اتنے وسیع علاقے میں لہلہا رہی ہیں۔ اگر کسی نے بالغ ہونے دیا تو بڑا ہو کر جائیداد سنبھال لے گا۔ مگر اس میں ابھی بارہ پندرہ سال پڑے ہیں۔ اور اس عرصہ تک دوسرے ان زمینوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں ___ اور اس وقت کا حال کسے معلوم ___ بہرحال ابھی تو یہ لڑکی اس لیے قبیلے سے باہر جاتی ہے کہ بچے کو صاف نکال کر اپنے ساتھ لے جائے ___ وہ پنجابی بھی محض جائیداد کے لیے شادی کر رہا ہے۔ ورنہ لڑکے کی تعلیم سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور چچا صرف اس لیے مخالفت کر رہا ہے کہ کسی طرح بچہ اس کے پاس رہ جائے ___ آپ نے کچھ کرنا ہے تو بچے کا سوچیں ___ لڑکی کو لگاؤ آگ ___"

..... مجسٹریٹ کے دماغ سے جیسے پردہ ہٹ گیا۔ اس نے طرفین سے پوچھا۔ مگر وہ تائید یا تردید کیے بغیر اپنے پہلے دلائل دہرانے لگے۔ لڑکی بھائی کی محبت میں مری جا رہی تھی اور چچا غیرت پکار رہا تھا۔

مجسٹریٹ کافی دیر سوچتا رہا اور کتابیں دیکھتا رہا۔ پھر اسے ایک تجویز سوجھی۔ اس نے فائل دوبارہ جرگے کے پاس بھیجی۔ اور حکم میں لکھا کہ جرگہ اس امکان پر غور کرے کہ اگر لڑکے کی جائیداد کا سرکاری سرپرست مقرر کر دیا جائے اور اس کی بلوغت تک جائیداد کی آمدنی بنک میں بچے کے نام جمع ہوتی رہے۔ دریں اثنا انھیں کچھ ماہانہ خرچ ملتا رہے۔ جرگہ غور کرے اور اپنی رپورٹ پیش کرے۔

مجسٹریٹ کی یہ تجویز سن کر لڑکی، چچا اور جرگہ ممبروں کے منہ لٹک گئے

مگر کچھ کہے بغیر واپس چلے گئے۔ اور غور کرنے لگے۔ معاملہ تین چار ہفتہ تک جرگہ کے زیر غور رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زیادہ ہی زیادہ الجھ رہا ہے مگر ایک دن صبح ہی صبح مجسٹریٹ کے سامنے فائل پیش کی گئی۔ جرگہ ممبروں کی رپورٹ متفقہ تھی کہ طرفین نے آپس میں بخیر و خوبی مصالحت کر لی ہے۔ اور راضی نامہ ہو جانے کے بعد مزید کارروائی کی ضرورت نہیں۔ سائلہ اپنا استغاثہ واپس لیتی ہے — مسل جرگہ ممبران خود اٹھا کر لائے تھے۔

مجسٹریٹ نے رائے منظور کر لی۔ قلم سنبھالتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "یہ کیا قصہ ہوا ہے؟"

"خدا خبر صاحب"، ایک معمر سردار بولا: "اللہ نے ہدایت دے دی ہو گی۔ تو انھوں نے راضی نامہ کر لیا۔"

"چلیئے اچھا ہے صاحب"، چچا بولا، "خدا بھی صلح صفائی کو پسند کرتا ہے — شر سے اُسے بھی نفرت ہے۔"

"تمھیں راضی نامہ منظور ہے؟" مجسٹریٹ نے لڑکی سے پوچھا۔

"ہو! سوآنے منظور ہے۔"

"شادی کس کے ساتھ ہو رہی ہے اس کی؟" اس نے دستخط کرتے کرتے ویسے ہی ارد گرد والوں سے سوال پوچھا: "میں شادی کروں گی ہی نہیں — بس اپنے چچا کے پاس ہی رہوں گی۔" وہ لاڈ سے چچا کے قریب ہو گئی۔

دفتر والوں نے راضی نامہ نتھی کر کے مہریں لگائیں اور مقدمہ خارج کر کے مسل ریکارڈ میں بھجوا دی۔

ایک دو ماہ بعد مجسٹریٹ علاقے میں ایک متنازعہ موقع دیکھنے گیا واپسی پر شام کے وقت گاڑی خراب ہوجانے کی وجہ سے اُسے ایک گاؤں میں پناہ لینا پڑی۔ رات ساری وہیں کاٹی۔ اگلے دن بہت سویرے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی میں سے دھیمی دھیمی روشنی اندر چھن رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے بڑھتی گئی۔ ایک دو ہوا کے جھونکے آئے۔ مجسٹریٹ کی طبیعت مچلی۔ اور وہ چھڑی ہاتھ میں لے کر سیر کو چل دیا۔

گندم کی قدآور فصلیں لہلہا رہی تھیں، گندم پک رہی تھی۔ اور سبز رنگ بلیں جیسے کسی نے کہیں کہیں سنہرے چھینٹے مار دیئے ہوں۔ خوشوں کی سنہری مونچھیں جیسے تازہ کلف لگوا کر صبح کی تازگی میں ڈوبی تھیں اور جب ہوا کا جھونکا آتا، تو خوشوں کے ہلنے سے کھیت کی سطح پر خوشگوار لہریں دوڑنے لگتیں۔ اُن کے درمیان پگڈنڈی پر درختوں کی قطاریں تھیں۔ کہیں کہیں کاریز کا شفاف پانی پتھروں کو کندھے مار کر ہلکی موسیقی پیدا کر رہا تھا مجسٹریٹ چھڑی سے گندم کے پودوں کو چھیڑتا ہوا اپنے سُرور میں آگے چل رہا تھا۔ اور صبح کی مفرح ہوا کے سانس لیتا ایک مکان کے قریب سے گزر رہا تھا۔

"کتنی اچھی فصل ہے"۔ اُس نے گندم کے بھرے بھرے خوشوں کو دیکھ کر کہا: "کوئی قسمت والا کسان ہوگا۔" اتنے میں اسے ایک درخت کے پاس پگڈنڈی کے قریب ایک بچے کا پاؤں نظر آیا۔ قریب جا کر دیکھا تو باقی دھڑ فصل میں چھپا تھا۔ اس کے دماغ میں شرارہ سا لپکا کہ شاید کوئی بچہ قتل کیا گیا ہے یا بھیڑیئے وغیرہ نے مار پھینک دیا ہے —— جھک کر وہ دیکھنے

دگا...... بچے میں کوئی حرکت نہ تھی اس نے ہلکے سے چھڑی چبھوئی۔ تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجسٹریٹ نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ یہ اسی مقدمے والا بچہ تھا، جو عدالت میں پیش ہوا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو بیٹا؟"

بچہ گرد بھری مٹھیوں سے آنکھیں ملتا رہا۔ کافی دیر ایک طرف سوتے سے اس کے ایک رخسار پر مٹی لتھڑی تھی۔ اور سر میں گھاس کے تنکے اٹکے تھے مجسٹریٹ نے چمکار کر کئی دفعہ پوچھا تو بولا "سو رہا تھا"۔

"گھر میں کیوں نہیں سوئے؟" مجسٹریٹ نے اس کے رُخسار سے گرد جھاڑی، بچہ خاموش رہا۔

"گھر میں کس کے پاس سوتے تھے؟" اس نے پھر پوچھا۔ بچے کے لب بسورنے کے انداز میں ذرا سے کانپے اور وہ بولا۔ "آپا کے بستر میں"۔

"اور آج نہیں سوئے وہاں!" بچے نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں؟"

وہ چپ رہا۔

"کیوں مارا ہے آپا نے؟"

بچے نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں بیٹا اب نہیں سویا کرتے آپا کے پاس"

بچہ ٹھنکا "نہیں"

"کیوں؟"

"اب وہاں چچا......"

اتنے میں فصل کے خوشوں میں کوئی بٹیر اچھلا ۔ اور بچہ بات پوری کیے بغیر اس کی طرف لپکا۔

ادیب لطیف ○

سعادت حسن منٹو

"منٹو نہ تو کسی کو شرم دلاتا ہے نہ کسی کو راہ راست پر لانا چاہتا ہے، وہ تو بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انسانوں سے یہ کہتا ہے کہ اگر تم چاہو بھی تو بھٹک کے بہت دُور نہیں جا سکتے۔ اس اعتبار سے منٹو کو انسانی فطرت پر کہیں زیادہ بھروسا نظر آتا ہے۔" محمد حسن عسکری

"منٹو نے زندگی کے زہراب کو بہت قریب سے دیکھا ہے، چھوا ہے، چکھا ہے — اور اب وہ ایک تیز نشتر بن کر سماج کے فاسد مادے کو خارج کرنا چاہتا ہے۔ مریض چیختا ہے، چلاتا ہے، بین کرتا ہے۔ منٹو کو پروا نہیں۔ وہ اس قدر بے رحم ہے کہ کلوروفارم دینا بھی پسند نہیں کرتا۔" کرشن چندر

"منٹو آدم کی جرأتِ گناہ کا قائل ہے۔ منٹو کا انسان نوری ہے نہ ناری۔ وہ آدم خاکی ہے — وہ وجودِ خاکی جس میں بنیادی گناہ، فساد، قتل و خون وغیرہ کے امکان کے باوجود، خدا نے نوری فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔" ممتاز شیریں

اردو کے عظیم ترین افسانہ نگار کے چند اہم مجموعے:

خالی بوتلیں خالی ڈبے	چغد	یزید
۲٫۵۰	۲٫۵۰	۲٫۵۰

البیان، چوک انارکلی، لاہور

شفیق الرحمٰن

"ہمارے نئے ادب میں لے دے کے ایک شفیق الرحمٰن ہیں جنھوں نے تفریحی ادب کی طرف توجہ کی ہے۔ یہ شگفتگی، یہ لاابالی پن، یہ مچلتی ہوئی جگمگاہٹ بس انھی کا حصہ ہے۔"
محمد حسن عسکری

"شفیق الرحمٰن کے افسانے پڑھ کر شوخ رنگوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے — سرخا سرخ، نارنجی، یاقوتی، زعفرانی۔"

کرشن چندر

"شفیق الرحمٰن موجودہ دور میں شگفتہ اور صحت مند ادب کے بانی ہیں۔"

ماہ نامہ، ادب لطیف

"شفیق الرحمٰن کی کہانیوں میں تکلف اور پیچیدگیاں نہیں ہوتیں، ان کے رومانی اور شگفتہ افسانوں میں بے ساختگی اور روانی ہوتی ہے۔"

حجاب امتیاز علی

شفیق الرحمٰن کے ہنستے مسکراتے رومانی افسانوں کے چار مجموعے:

کرنیں	شگوفے	مدوجزر
۲٫۵۰	۲٫۵۰	۲٫۰۰

پچھتاوے
۲٫۵۰

اشفاق احمد

"اشفاق احمد اور عصمت چغتائی کے افسانوں میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے۔ عصمت کے کردار عام طور پر جارحانہ قسم کی منفی محبت میں مبتلا رہتے ہیں جس کا انجام بڑا ہی اندوہناک ہوتا ہے۔ اشفاق کے کردار بڑی ہی نرم و نازک محبت کرتے ہیں مگر انجام اس کا بھی بڑا دردناک ہوتا ہے۔ عصمت کے ہاں محبت کے نشان گھونسے، لاتیں، چٹکیاں اور تیکھی تیکھی چبھ جانے والی باتیں ہوتی ہیں اور اشفاق کے ہاں ہلکے ہلکے لمس اور چھوٹی چھوٹی سی ادائیں، ننھے منّے بوسے اور بڑی میٹھی میٹھی باتیں جیسے برفی کی ڈلیاں۔ دونوں کے ہاں پیمانۂ محبت ایک ہی ہے مگر اس میں شراب انڈیلنے کا طریقہ جداگانہ ہے۔ عصمت چھلکاتی ہے، اشفاق ایک ایک قطرہ ڈال کر اسے لبالب بھرتا ہے —— اس کھیل میں دونوں کے جام ٹوٹ جاتے ہیں اور ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیوں عصمت کے کردار ایسے خطرناک کھیل میں محتاط نہ رہے؟ کیوں ایسے خطرناک کھیل میں اشفاق کے کردار اتنے محتاط رہے جب کہ انھیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ زیادہ احتیاط ہی اکثر شکست و ریخت کا موجب ہوتی ہے۔"

سعادت حسن منٹو

ایک محبت سو افسانے

۲۶۷۵

الـبیان، چوک انارکلی، لاہور